محی الدین نواب
1

## پیش لفظ

"لوگوں کے اپنے اپنے احساسات ہوتے ہیں۔ اگر کوئی ناپسندیدہ ہستی پھول مارے تو وہ پتھر لگتا ہے۔ اس کے برعکس محبوب پتھر مارے تو وہ پھول کی طرح تاحیات یاد رہتا ہے۔"

یہ "پتھر" کے ابتدائی الفاظ ہیں اور اگر دیکھا جائے تو یہی الفاظ اس پوری کہانی کا خلاصہ بھی ہیں۔ ہر انسان کے اپنے اپنے احساسات ہوتے ہیں۔ اپنی نوعیت میں یہ احساسات بڑی متضاد کیفیات رکھتے ہیں۔ کسی کی خوشی کسی دوسرے کا غم بن جاتی ہے۔ کسی کی بربادی کسی کی آبادی بن جاتا ہے۔ کسی کا رونا کسی کی ہنسی بن جاتی ہے۔ کسی کا گھر جلتا ہے اور کسی کے ہاتھ سینکنے کا بہانہ بن جاتا ہے۔ بات صرف احساسات کی ہے۔ میدانِ جنگ میں قتل کرو تو تمغہ ملے گا عام زندگی میں قتل کرو تو پھانسی۔ مریض پر نشتر آزماؤ تو مسیحا بنو گے کسی دوسرے پر چلاؤ تو قاتل۔ صرف احساسات بدل جانے سے اعمال و افعال کی نوعیت ہی بدل جاتی ہے۔ ان احساسات کو نیت کا نام بھی دیا جاتا ہے اور حدیث نبوی ﷺ کہتی ہے: "اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔"

"پتھر" انہی احساسات کی کہانی ہے جو کبھی شعلہ ہیں اور کبھی شبنم، کبھی رزم اور کبھی بزم، کبھی جامِ سفال اور کبھی جامِ جم، کبھی آبِ حیات اور کبھی سم، غرض کیا کچھ سنیں گے آپ اور کیا کچھ کہیں گے ہم۔

چھ سو صفحات سے زائد پر پھیلی ہوئی اس کہانی کو پڑھتے پڑھتے آپ بہت دور نکل جائیں گے۔ پلٹ کر دیکھنا بھی یاد نہ رہے گا اور جب کہانی ختم ہو گی تو آپ کو احساس ہو گا کہ آپ تو جس نکتے سے چلے تھے اسی نکتے پر آ ٹھہرے ہیں۔ کہانی جہاں سے چلی تھی گھوم پھر کر وہیں لوٹ آئی ہے۔ یہ کہانی کہاں سے چلی تھی؟ وہ نکتہ کون سا تھا جہاں سے آپ نے سفر کا آغاز کیا تھا؟ شاید احساسات کی کوئی بات تھی!

محی الدین نواب کی وجہ شہرت "دیوتا" بنی۔ دنیائے قلم میں ایسی مثالیں بہت

سی ملیں گی جن میں کسی قلم کار نے ایک تحریر لکھی اور پھر ساری عمر کے لیے اپنی ہی تخلیق کا قیدی ہو کر رہ گیا۔ ہرمن میلولے کا موبی ڈک، اپٹون سنکلیئر کا جنگل، سید امتیاز علی تاج کا انار کلی اور شوکت صدیقی کا خدا کی بستی اس کی بہترین مثالیں ہیں۔
ان تخلیق کاروں نے اور بھی بہت کچھ لکھا لیکن عام پڑھنے والا انہیں ان کی انہی تحریروں کے حوالے سے جانتا ہے جن کا ذکر اوپر آیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مذکورہ بالا تمام فنکار سچے فنکار تھے لیکن اس کا کیا علاج کہ وہ اپنی ہی ایک تخلیق کے سحر میں گرفتار ہو گئے اور عمر بھر اس سے چھٹکارا نہ پا سکے۔

ان حالات میں اگر محی الدین نواب بھی دیوتا کے بعد کوئی اعلیٰ پائے کی تحریر نہ لکھ پاتے، تو کوئی حیرت کی بات نہ ہوتی اور پھر دیوتا کا لکھنا کوئی کمال بھی نہ ہوتا۔
لیکن محی الدین نواب ان معدودے چند ادباء میں شامل ہیں جن کو لوگ دیوتا ہی نہیں ان کی دوسری تحاریر کے حوالے سے بھی بڑی اچھی طرح جانتے اور پہچانتے ہیں اور ان کی کسی تحریر کا معیار دیوتا سے کم نہیں ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ محی الدین نواب اپنے فن سے مخلص ہیں اور اصلی فنکار کی یہی پہچان ہوتی ہے کہ وہ اپنی ہر تحریر پر (جس کے لیے انگریزی میں Brain Child کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے) یکساں خون جگر صرف کرے اور صرف مالی منفعت کو مدِ نظر نہ رکھے۔ جیسے ماں باپ اپنے تمام بچوں کی پرورش و پرداخت یکساں توجہ اور محبت سے کرتے ہیں ویسے ہی ایک فنکار اپنے ہر Brain Child پر یکساں محنت اور قوت صرف کرتا ہے۔

پتھر میں آپ کی تفریح کے لیے سب کچھ ہونے کے علاوہ آپ کے سیکھنے اور سمجھنے کے لیے بھی بہت کچھ ہے۔ یہ محی الدین نواب کی ایک اور چشم کشا تحریر ہے۔
میں یہ نہیں کہوں گا کہ اسے پڑھنے کے بعد سوچئے گا ضرور! یہ تحریر آپ کو خود ہی سوچنے پر مجبور کر دے گی۔

**ادارہ**



لوگوں کے اپنے اپنے احساسات ہوتے ہیں۔ اگر کوئی ناپسندیدہ ہستی پھول مارے تو پتھر لگتا ہے۔ اس کے برعکس محبوب پتھر مارے تو وہ پھول کی طرح تاحیات یاد رہتا ہے۔
رات کی تاریکی میں اس عالی شان کوٹھی کی کھڑکیوں سے روشنی ایسے پھوٹ کر باہر آ رہی تھی جیسے دلوں سے مسرتیں پھوٹ رہی ہوں۔ یہ ایک احساس ہے۔ دوسرا احساس یہ تھا کہ رات کی تاریکی میں الگ الگ کھڑکیوں کی روشنیاں کوڑھ کے دھبوں کی طرح لگ رہی تھیں۔ وہ کوڑھی عمارت سنگ مرمر اور سخت پتھروں کی آمیزش سے تعمیر کی گئی تھی۔

دنیا کی ہر شے اپنی ظاہری ہیئت سے اپنی نزاکت اور شقاوت کا مظہر ہوتی ہے۔ اس کوٹھی کے سنگ مرمر میں جتنا حسن اور چکناہٹ تھی، اس کے پتھروں میں اتنی ہی شقاوت اور سفاکی تھی۔ احاطے کے بڑے سے آہنی گیٹ کے ایک پتھریلے ستون پر پیتل کی چمکتی ہوئی پلیٹ پر کوٹھی کے مالک کا نام پیر عظمت اللہ شاہ سلطانی کندہ کیا گیا تھا۔
دوسرے پتھریلے ستون کے پاس سیکیورٹی افسر کے لیے ایک کیبن بنا ہوا تھا۔ افسر ٹیلیفون کے پاس کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اور کیبن کے دروازے پر ایک مسلح گارڈ الرٹ کھڑا ہوا تھا۔ کوٹھی کے وسیع برآمدے میں بھی دو مسلح گارڈ کھڑے ہوئے تھے۔ انہیں اپنے قریب دروازے پر کال بیل سنائی دی۔ جب کوئی باہر سے آتا ہے تو دروازہ کھلوا کر اندر جانے کے لیے کال بیل کا بٹن دباتا ہے لیکن اس کوٹھی میں اندر سے باہر آنے والے بھی کال بیل کی آواز سناتے تھے۔ یہ آواز سن کر دونوں مسلح گارڈز دروازے کے پاس آئے۔ ایک نے جیب سے چابی نکال کر لاک میں ڈالی۔ چابی کو گھمایا پھر دونوں گارڈز نے

دروازے کے دونوں پٹوں کو آہستہ آہستہ کھولا۔ دروازے کے کھلنے کے ساتھ ساتھ کوٹھی کا اندرونی ہال دکھائی دیا۔ وہ ہال کسی اندرونی محل کا شاندار منظر پیش کر رہا تھا۔

کھلے ہوئے دروازے کے سامنے پیر عظمت اللہ شاہ سلطانی شاہانہ انداز میں کھڑے ہوئے تھے۔ ان کے چہرے پر ہلکی سی داڑھی تھی۔ آنکھوں میں سرمہ لگا ہوا تھا۔ ایک ہاتھ میں قیمتی پتھروں سے بنی ہوئی تسبیح تھی۔ پیچھے تین ملازم تھے۔ ایک ملازم کے ہاتھوں میں جدید طرز کا ایک بڑا سا حقہ تھا۔ دوسرے ملازم نے اپنے ایک ہاتھ کے سہارے اپنے شانے پر چاندی کا تھال رکھا ہوا تھا۔ تھال پر چاندی کی کئی کٹوریوں میں بادام' پستے' کشمش اور اخروٹ وغیرہ تھے۔ ان کٹوریوں کے درمیان ایک خوبصورت سا چاندی کا پاندان جیسا ڈبہ رکھا ہوا تھا۔ تیسرے ملازم نے بھی ایک تھال اٹھا رکھا تھا جس میں انگور رکھے تھے۔

پیر عظمت اللہ شاہ سلطانی دہلیز پار کر کے شاہانہ انداز میں چلتے ہوئے برآمدے میں آئے۔ انہوں نے باہر مستعد کھڑے گارڈز کو دور آہنی گیٹ تک دیکھا۔ سب انہیں سلیوٹ کر رہے تھے۔ انہوں نے پیچھے ایک حقہ بردار ملازم کی طرف دیکھے بغیر ہاتھ بڑھایا۔ ملازم نے فوراً ہی حقے کی نے ان کے ہاتھ میں تھما دی پھر سوئچ بورڈ کے پاس آ کر حقے سے منسلک رہنے والے پلگ کو سوئچ بورڈ میں لگا کر ایک بٹن دبا دیا۔ اس کے ساتھ ہی حقے کا ہیٹر آن ہو کر سرخ ہونے لگا۔

چاندی کا تھال اٹھانے والے ملازم نے پاندان نما ڈبے کو کھول کر اس میں سے تھوڑا سا تمباکو نکالا اور اسے ہیٹر کی اوپری سطح کے خانے میں ڈالنے لگا۔ مہنگے زعفرانی تمباکو کی خوشبو فضا میں پھیلنے لگی۔ پیر عظمت اللہ شاہ سلطانی حقے کی نے کو ہونٹوں کے درمیان رکھ کر کش لگانے لگے۔ حقے کی گڑگڑاہٹ کی آواز ابھرنے لگی۔ کش لگانے کے باعث ہیٹر کی سرخی دہک رہی تھی اور وہ سرخی پیر سلطانی شاہ کے چہرے پر دمک رہی تھی۔ انہوں نے دوسرا کش لگایا۔ ہیٹر کی آگ جیسے ان کی آنکھوں کی پتلیوں میں دہکنے لگی۔

انہوں نے گہری سوچتی اور سلگتی ہوئی آنکھوں سے ایک سمت دیکھا۔ جدھر دیکھا' ادھر کچھ فاصلے پر کوٹھی کی انیکسی تھی۔ اس انیکسی کے برآمدے اور اس کے چھوٹے سے زینے کے نچلے حصے پر بھی مسلح گارڈز مستعد کھڑے ہوئے تھے۔ انیکسی کی ایک کھڑکی



روشن تھی اور اس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔

اس انیکسی کو دیکھنے کے دوران پیر عظمت اللہ شاہ سلطانی کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ وہ حقارت اور ناگواری سے اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ رہ رہ کر کش لگا رہے تھے۔ حقے کی گڑگڑاہٹ رات کی خاموشی میں دور تک ابھرتی جا رہی تھی۔ وہ تسبیح میں پروئے ہوئے دانوں کو انگلیوں کی حرکت سے یوں آگے بڑھاتے جا رہے تھے جیسے مالا جپ رہے ہوں۔ تمباکو نوشی کے دوران اللہ کے نام کی تسبیح نہیں پڑھی جاتی۔ ایسے وقت ذاتی مسائل کے حل' اپنے اغراض و مقاصد کے حصول یا کوئی گہری چال چلنے کی فکر ہوتی ہے تو تسبیح کے دانے جلدی جلدی انگلیوں کے درمیان سے پھسلتے جاتے ہیں۔ اس عمل کو تسبیح خوانی نہیں بلکہ کسی بھی معاملے کی مالا جپنا کہہ سکتے ہیں۔

انہوں نے حقے کی نَے ملازم کو دے دی اور انگور بھرے تھال سے انگور کا ایک دانہ منہ میں ڈالا اور اسے چباتے ہوئے سوچتے ہوئے ناگواری سے انیکسی کی طرف دیکھنے لگے۔

حقہ بردار ملازم نے سوئچ بورڈ سے پلگ کو الگ کر دیا۔ ہیٹر کی آگ ماند پڑنے لگی۔ انگور کھٹے نہیں تھے۔ ان کی مٹھاس نے ناگواری کے احساس کو کم کر دیا۔ وہ زیر لب یوں مسکرائے جیسے کمتر کے سامنے برتری حقارت سے مسکراتی ہے۔ پھر وہ انیکسی کی طرف جانے لگے۔

★==========★==========★

انیکسی کے کمرے میں صداقت علی ایک کیسٹ ریکارڈر کی طرف آیا پھر وہاں سے ایک کیسٹ اٹھا کر دیکھنے لگا۔ کیسٹ کے کور پر کوئی رنگین اشتہاری تصویر نہیں تھی۔ اس کور فریم میں ایک گھریلو عورت کی بلیک اینڈ وہائٹ مسکراتی ہوئی تصویر تھی۔ اس تصویر کے نیچے لکھا ہوا تھا۔ "میرے گیت آپ کے لیے۔"

صداقت علی نے اداسی سے مسکرا کر تصویر کو دیکھا اور کہا۔ "میری تمام محبتیں تمہارے لیے ہیں۔ اس عمر میں بھی' جب کہ ہم ایک جوان بیٹی کے والدین بن چکے ہیں۔"

اس نے کور کے اندر سے کیسٹ نکالا۔ اسے کیسٹ ریکارڈر میں لگا کر آن کیا۔ چند لمحوں کے بعد ایک مترنم سی آواز ابھرنے لگی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "صداقت! یہ آڈیو اور وڈیو کیسٹ بھی خوب ہیں۔ جب ہم جدا ہوتے ہیں تو آڈیو کے ذریعے بچھڑی ہوئی آوازیں سن لیتے ہیں اور نگاہوں سے اوجھل ہو جانے والے چہروں کو وڈیو فلم کے ذریعے دیکھ لیتے ہیں۔ ابھی تم میری آواز سن رہے ہو نا؟"

صداقت علی نے ریکارڈر پر محبت سے ہاتھ رکھ کر اداسی سے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ہاں۔ سن رہا ہوں' یہ کیسٹ نہ بھی ہوتا تو تمہاری آواز میرے دل سے آتی رہتی ہے۔"

کیسٹ سے آواز ابھری۔ "وہ گیت سناؤں' جو تمہیں بہت پسند ہے؟"

کیسٹ سے صداقت کی آواز ابھری۔ "ہاں سناؤ۔ تمہارا ہر گیت مجھے پسند ہے۔"

ریکارڈر سے موسیقی ابھرنے لگی پھر گیت کے بول ابھرنے لگے۔ وہ گا رہی تھی۔

"برسوں وہاں خزاں کا اثر تک نہ آسکا
ہنس کر گزر گئے ہیں جنوں میں جہاں سے ہم"

صداقت بڑے پیار سے گیت سنتا ہوا کیسٹ کے کور پر اپنی شریک حیات کی تصویر دیکھ رہا تھا۔ ایسے ہی وقت ایک انگلی نے سوئچ بورڈ کے پاس آ کر ایک بٹن دبایا۔ چلتا ہوا کیسٹ تھم گیا۔ سُر سنگیت کا دم گھٹ گیا۔ صداقت نے چونک کر دیکھا۔ حقہ بردار ملازم ریکارڈر کا پلگ نکال کر حقے کا پلگ لگا رہا تھا پھر اس نے بٹن دبایا۔ اس کے ساتھ ہی حقے کا ہیٹر آن ہو کر سرخ ہونے لگا پھر اس کی سلگتی ہوئی سرخی کے پیچھے پیر عظمت اللہ شاہ سلطانی نے آ کر گہری سلگتی ہوئی آنکھوں سے صداقت کو دیکھا۔ صداقت بھی گہری سنجیدگی سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے حقے کی نَے کو ہونٹوں میں دبا کر کش لگایا۔ گڑگڑاہٹ کی آواز ابھرنے لگی۔ وہ کش لگاتے ہوئے اور گڑگڑاہٹ کی آوازیں پیدا کرتے ہوئے ایک صوفے کے پاس آئے۔ صداقت نے کہا۔ "موسیقی روح کی غذا ہے۔ میں گیت سن رہا تھا۔ آپ حقہ گڑگڑانے آ گئے۔"

انہوں نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "حقے کی گڑگڑاہٹ نہ دیکھو۔ دیکھو کہ بڑے بڑے لوگ ہمارے سامنے آ کر گڑگڑاتے ہیں۔ ہمارے محتاج رہتے ہیں۔"



"لیکن ہم جیسے چھوٹے لوگ صرف خدا کے محتاج رہتے ہیں۔"

انہوں نے گھور کر اسے دیکھا پھر کہا۔ "یہ افسوس کا مقام ہے کہ تمہاری شریک حیات لاپتہ ہے۔ اسے اغوا کیا گیا ہے اور تم موسیقی سے دل بہلا رہے تھے۔"

صداقت نے دوسرے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "وہ صرف میری شریک حیات نہیں ہے' آپ کی صاحب زادی بھی ہے۔ وہ اغوا کی گئی ہے۔ میں موسیقی سن رہا ہوں اور آپ پستہ' بادام اور انگور کھا رہے ہیں۔"

پیر شاہ سلطانی نے تھال میں سے انگور کا دانہ دانتوں میں لے کر چبایا پھر کہا۔ "ہمارے اس عمل سے ظاہر ہے کہ ہماری بیٹی عزت آبرو سے صحیح سلامت ہو گی۔ اغوا کرنے والا جانتا ہے کہ اسے ایک انگلی بھی لگائی تو اس کے پورے خاندان کو دفن ہونے کے لیے زمین بھی نہیں ملے گی۔ ہماری بیٹی ابھی ایک گھنٹے کے اندر آ سکتی ہے لیکن تم نہیں چاہتے۔ اگر چاہتے تو ہمدانی صاحب سے سمجھوتا کر کے ہماری ہاجرہ بیٹی کو واپس لے آتے۔"

"آپ ہمدانی صاحب جیسے بڑے بڑے اژدہوں کے جبڑے چیر دیتے ہیں۔ ایسے لوگ آپ کے دباؤ میں رہتے ہیں پھر آپ اپنی صاحب زادی کو ان سے واپس کیوں نہیں لے آتے؟"

"اس لیے کہ ہمدانی ہاجرہ کو اغوا کرنے کا اعتراف نہیں کر رہا ہے اور ہم نہیں جانتے کہ اس کے کرائے کے غنڈے کون ہیں؟ ہم یہ دعویٰ تو کر رہے ہیں کہ ہمدانی کے پورے خاندان کو خاک میں ملا دیں گے مگر یہ نہیں بھول رہے ہیں کہ ہماری عزت بھی خاک میں مل جائے گی۔"

وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے پھر ٹہلنے کے انداز میں ایک طرف جاتے ہوئے بولے۔ "تمہاری تو بیوی اغوا ہوئی ہے۔ ہماری تو خاندان کی عزت اٹھوا لی گئی ہے۔ دنیا والوں کے سامنے ہمارا سر جھکے گا۔"

انہوں نے صداقت کے قریب آ کر کہا۔ "ابھی یہ بدنامی پھیلی نہیں ہے۔ دو دن سے یہ بات چھپائی جا رہی ہے مگر کب تک؟ جب بات پھیلے گی اور اس کے بعد ہاجرہ واپس

آئے گی تو کیا وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل رہے گی؟ کیا ہم سر اٹھا کر کسی سے بات کر سکیں گے؟"

صداقت نے انہیں دیکھا پھر کہا۔ "آپ تھک جائیں گے بیٹھ جائیں۔"

"میں تھک کر گرنے سے پہلے مرجانا پسند کروں گا۔ تم.......... تم نہیں سمجھو گے کہ بیٹی کے بے گھر ہو جانے سے میں کس طرح شرم سے مر رہا ہوں۔ ہاں شرم سے' یہ.......... یہ شرم کیسے آتی ہے؟"

وہ تیزی سے چلتے ہوئے پھر صوفے پر آ کر بیٹھ گئے پھر کہا۔ "تم بھی ایک جوان بیٹی کے باپ ہو۔ ذرا سوچو' تمہاری بیٹی شہناز کو کوئی اٹھا کر لے جائے تو تم شرم سے کیسے گڑنے اور مرنے لگو گے۔ کیا ضروری ہے کہ شرم کا احساس کرنے کے لیے اسی مرحلے سے گزرو جس سے ہم گزر رہے ہیں۔"

"میری بیٹی آپ کی نواسی ہے۔ وہ بے شمار پہرے داروں کے درمیان آپ کے محل میں رہتی ہے۔ کوئی اس کے سائے تک بھی نہیں پہنچ سکے گا۔ رہ گئی شرم کی بات تو شرم کا تعلق ایمان سے ہوتا ہے۔ میں ہمدانی کی بات مان کر پچاس لاکھ روپے لے کر بے ایمانی اور بے شرمی کا سبق آپ سے نہیں سیکھوں گا۔"

انہوں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا پھر شہناز کو دیکھ کر منہ بند کر لیا۔ وہ ایک ٹرے میں چائے لے کر آئی تھی۔ نانا اور نواسی نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر نانا نے کہا۔

"اس معصوم کو یہ بھی نہیں معلوم ہے کہ اس کی ماں کہاں ہے؟ ہم نے اسے اشاروں سے سمجھایا ہے کہ اُس کی امی ملک سے باہر گئی ہیں۔ کیا تمہیں اپنی گونگی' بہری اور معصوم بیٹی پر ترس نہیں آ رہا ہے؟"

شہناز سینٹر ٹیبل پر ٹرے رکھ کر چائے پیالیوں میں ڈالنے لگی۔ صداقت علی نے بیٹی کو پیار سے دیکھا پھر کہا۔ "ہمدانی صاحب مجھ پر کتنے ہی ہتھکنڈے آزما چکے ہیں۔ اس بار ایک تیر سے دو شکار کھیل رہے ہیں۔ مجھے ایک شوہر کی حیثیت سے اور آپ کو ایک باپ کی حیثیت سے مجبور کر رہے ہیں۔"

"ہاں' ہم مجبور ہو رہے ہیں۔ وہ فائل ہمارے پاس ہوتی تو ہم اسے ہمدانی کو دے



کر اپنی ہاجرہ بیٹی کو واپس لے آتے۔"

"ابھی آپ فرما رہے تھے کہ ہمدانی نے ہاجرہ کو اغوا نہیں کیا ہے پھر ہمدانی اسے آپ کے حوالے کیسے کرے گا؟"

"وہ حوالے نہیں کرے گا۔ اس کے غنڈے تو اسے یہاں چھوڑ جائیں گے۔ تم وہ فائل ہمیں دے دو۔ ہم اس معصوم گونگی کی ماں کو واپس لے آئیں گے۔"

"آپ میری گونگی بیٹی کی فکر نہ کریں۔ اسے تو آپ سمجھا چکے ہیں کہ اس کی امی ملک سے باہر گئی ہیں۔"

شہناز نے چائے کی ایک پیالی اپنے نانا کی طرف بڑھائی۔ انہوں نے غصے سے پیالی پر ہاتھ مار کر پرے پھینک دیا۔ پیالی فرش پر گر کر' ٹوٹ کر چائے کی طرح بکھر گئی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر نواسی سے بولے۔ "کیا یہ سمجھ سکتی ہو کہ تمہاری ماں کس جہنم میں ہے؟ ہم چیخ چیخ کر سمجھائیں گے تب بھی تم اپنے باپ کی بے غیرتی سمجھ نہیں پاؤ گی۔ ہماری خاندانی عزت کا جنازہ نکلنے والا ہے اور یہ ابھی موسیقی سن رہا تھا اور تم ہمیں چائے کی مٹھاس دے رہی ہو۔ یہ خوشی کا موقع ہے یا ڈوب مرنے کا؟"

شہناز کچھ نہ سمجھتے ہوئے کبھی نانا کو اور کبھی باپ کو سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے نانا صاحب بے بسی سے جھنجلاتے ہوئے دروازے تک گئے پھر رک کر صداقت سے بولے۔ "تم چاہو تو صبح تک یہاں رہ سکتے ہو اور ذرا عقل سے سوچ سکتے ہو۔ ہمدانی صاحب پچاس لاکھ دے رہے ہیں۔ ہم ان سے ستر لاکھ وصول کریں گے۔ تمہیں دولت ملے گی۔ اس گونگی کو اس کی ماں مل جائے گی۔ ہماری خاندانی عزت برقرار رہے گی اور تم اپنی شریک حیات کو عزت آبرو سے واپس لا کر فخر کرو گے۔ سوچو' سمجھو جب تمام باتیں فائدے ہی کی ہوں تو وہ احمقوں کی سمجھ میں بھی آ جاتی ہیں۔"

"جی ہاں۔ ایسی باتیں احمقوں ہی کی سمجھ میں آتی ہیں۔"

وہ غصے سے باہر برآمدے میں گئے۔ وہاں تینوں ملازم کھڑے ہوئے تھے۔ وہ اپنے آقا کے پیچھے جانے لگے۔ شہناز نے پیچھے سے آ کر باپ کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ اس نے پلٹ کر بیٹی کی آنکھوں میں گہری سنجیدگی اور اداسی دیکھی تو کہا۔ "شانی! یہ اداسی کیوں

ہے؟ چلو مسکراؤ۔"

اس نے مسکرا کر اسے دکھایا پھر کہا۔ "میں ایسے مسکرانے کو کہہ رہا ہوں۔ اپنے نانا جان کی پرواہ نہ کرو۔ غصہ ان کی ناک پر رہتا ہے اس لیے ناک پر مکھی بھی نہیں بیٹھنے دیتے۔ خدا نے چاہا تو تمہاری امی جلد ہی واپس آئیں گی' آؤ ہم چائے پئیں۔"

وہ بیٹی کے ساتھ سینٹر ٹیبل کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ اس کمرے کے قالین پر ایک جگہ چائے پھیلی ہوئی تھی۔ ٹوٹی ہوئی پیالی کے دور تک بکھرے ہوئے ٹکڑے نانا جان کی منتشر المزاجی ظاہر کر رہے تھے۔

★==========★==========★

اس خواب گاہ کی دیوار پر پیر عظمت اللہ شاہ سلطانی کی ایک بڑی سی تصویر آویزاں تھی۔ پیر شاہ سلطانی انیکسی میں داماد کے ساتھ مذاکرات کے لیے گئے تھے اس لیے خواب گاہ کو خالی ہونا چاہیے تھا لیکن وہاں ان کی اولاد اور اولاد کی اولاد موجود تھیں۔ ان کے بڑے صاحب زادے برکت اللہ شاہ سلطانی اور منجھلے صاحب زادے رحمت اللہ شاہ سلطانی اس خواب گاہ کے سامان کی تلاشی لے رہے تھے۔ برکت شاہ سلطانی نے پلنگ کے گدے اٹھا کر نیچے جھانکتے ہوئے کہا۔ "ابا حضور بڑے محتاط رہتے ہیں۔ ہمیشہ کمرا بند رکھتے ہیں۔ آج اتفاق سے کھلا چھوڑ گئے ہیں۔"

رحمت شاہ سلطانی نے اسٹور روم سے نکل کر کہا۔ "یہاں بھی کچھ نہیں ہے۔ آج اپنے مقدر سے کمرا کھلا ملا ہے مگر ہماری ضرورت کی چیزیں نظر نہیں آ رہی ہیں۔"

جمشید نے ایک آئرن سیف کے نمبروں والے ایک لاکر کو کھولنے کی کوشش کرتے ہوئے آواز دی۔ "ڈیڈ!"

برکت شاہ سلطانی نے فوراً بیٹے کی طرف پلٹ کر پوچھا۔ "کیا کھل گیا؟"

جمشید نے کہا۔ "نو ڈیڈ! میں کئی نمبروں کو آزما چکا ہوں مگر یہ نہیں کھل رہا ہے۔"

رحمت سلطانی نے کہا۔ "ابا حضور نے اس کے خفیہ نمبر ڈائری میں نوٹ کیے ہوں گے۔ ان کی ڈائری تلاش کرو۔"

برکت سلطانی نے بیٹے کو چابیوں کا گچھا دیا اور کہا۔ "یہ چابیاں تکیے کے نیچے



تھیں۔ شاید ان سے الماری کھل جائے گی۔ ڈائری اس الماری میں ضرور ہوگی۔"

جمشید چابیوں کا گچھا لے کر الماری کے پاس آیا۔ مختلف چابیوں کو آزمانے لگا۔ ایک چابی سے الماری کا ایک پٹ کھل گیا۔ اس حصے میں کپڑے بھرے ہوئے تھے۔ اس نے دوسرے پٹ کو کھولنے کے لیے پہلے پٹ سے چابی نکالنی چاہی۔ وہ نہیں نکلی' کسی وجہ سے پھنس گئی تھی۔ ایک نوجوان لڑکی' روبی ایک کھڑکی کے پاس کھڑی پردے کو ذرا سا ہٹا کر باہر انیکسی کی طرف دیکھ رہی تھی پھر اسے پیر عظمت اللہ شاہ سلطانی نظر آئے۔ وہ اپنے ملازموں کے ساتھ برآمدے سے گزر رہے تھے۔ روبی نے فوراً پردے کو برابر کرتے ہوئے کہا۔ "ڈیڈ! دادا جان آ رہے ہیں۔"

وہ سب ایک دم سے گھبرا گئے۔ کمرے کا سامان جلدی جلدی درست کرنے لگے۔

برکت شاہ سلطانی نے بیٹی سے کہا۔ "روبی تم فوراً اپنے بھائی جان کے ساتھ جاؤ۔"

جمشید نے الماری کے کی ہول سے چابی نکالنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "میں روبی کو لے کر کیسے جاؤں؟ یہ چابی پھنس گئی ہے۔ نکلنے کا نام نہیں لے رہی ہے۔"

برکت شاہ سلطانی نے بیٹے کے پاس آتے ہوئے کہا۔ "کیا مصیبت ہے؟ تم سے کبھی کوئی کام ہوا ہے جو اب ہوگا۔ چلو ہٹو' روبی کے ساتھ جاؤ۔"

بیٹا چلا گیا۔ باپ پھنسی ہوئی چابی نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔ رحمت شاہ سلطانی نے الماری کے پاس آ کر کہا۔ "بھائی جان! یہاں سے فوراً نکلیں' ابا حضور آ رہے ہیں۔"

"کیسے نکلیں؟ چابی نکلے گی تو ہم یہاں سے نکلیں گے۔ اس گچھے کو یہاں لٹکتا چھوڑ کر جائیں گے تو ابا حضور کو شبہ ہو جائے گا۔"

وہ دونوں بھائی اس چابی کو کی ہول میں گھما گھما کر باہر کھینچنے لگے۔ اس چابی کا نکلنا ضروری تھا۔ خواہ جبراً کھینچ کر نکالی جائے یا توڑ کر نکالی جائے۔ اس گچھے کو تکیے کے نیچے لے جا کر پہلے کی طرح رکھنا تھا۔ وہ دونوں ایک ایک پیر سے الماری کے پٹ کو دبا کر چابی کو کھینچتے وقت "ہونک ہونک اونہہ انہا" جیسی آوازیں بے اختیار منہ سے نکال رہے تھے۔ جب وہ بالکل ہی مایوس ہونے لگے تو چابی ایک جھٹکے سے نکل گئی۔ وہ اپنا توازن نہ سنبھال سکے۔ پیچھے کی طرف لڑکھڑاتے ہوئے گئے پھر فرش پر ان کے قدموں کے پاس آ

گرے۔ انہوں نے قدموں سے نظریں اٹھاتے ہوئے اوپر دیکھا تو ابا حضور کا روئے مبارک نظر آیا مگر وہ لمحات مبارک نہیں تھے۔

پیر عظمت اللہ شاہ سلطانی نے ملازموں کی طرف دیکھے بغیر ہاتھ کا اشارہ کیا۔ وہ حقہ اور چاندی کے تھال رکھ کر دروازہ بند کر کے چلے گئے۔ وہ دونوں جاں نثار اولاد کی طرح باپ کے قدموں میں پڑے ہوئے تھے۔ سہم سہم کر اٹھ کر بیٹھ رہے تھے۔ پیر شاہ سلطانی نے قالین پر پڑے ہوئے چابیوں کے گچھے کو اٹھایا پھر الماری کے پاس آ کر اسے لاک کرتے ہوئے کہنے لگے۔ "بیٹے جوان ہو جائیں تو ان کے پیروں میں باپ کے جوتے آ جاتے ہیں مگر ان کے سروں میں باپ کی ذہانت اور تجربات نہیں آتے۔ ذہانت کہتی ہے' کبھی اپنے سائے پر بھی بھروسا نہیں کرنا چاہیے۔ اپنے ہی بدن سے نکلا ہوا سایہ کبھی بونا دکھائی دیتا ہے اور کبھی ہمارے قد سے بھی زیادہ ہاتھ پاؤں پھیلاتا ہے۔ کبھی اپنا بن کر ساتھ چلتا ہے کبھی اپنے ہی گھر کے اندر ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔"

انہوں نے چابیوں کا گچھا دکھاتے ہوئے کہا۔ "جب تہذیب نہیں تھی تو تالے چابی نہیں تھے جب باپ بوڑھا ہونے لگتا تھا تو جوان بیٹے اسے جنگل میں چھوڑ آتے تھے یا اسے مار ڈالتے تھے تاکہ اس کے حصے کی خوراک اور اخراجات بچائے جا سکیں۔ آج کے مہذب دور میں بوڑھے باپ کو اسٹور روم میں یا مکان کے پچھلے برآمدے میں ایک چارپائی پر لٹا دیتے ہیں' اسے بیماریوں سے کراہنے' کھانسنے اور بلغم تھوکنے کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے۔"

انہوں نے بیٹوں کے سامنے فرش پر چابیوں کو پھینکتے ہوئے کہا۔ "ہماری تہذیب اور معاشرے میں سب سے بڑی اور سب سے اہم چیز چابی ہے۔ یہ بیٹوں کے ہاتھوں میں ہو تو باپ دو کوڑی کا ہو جاتا ہے اور یہ باپ کے ہاتھ میں ہو تو بیٹے سعادت مند اور فرمانبردار بن کر رہتے ہیں۔"

دونوں بیٹے برکت شاہ سلطانی اور رحمت شاہ سلطانی سامنے فرش پر پڑی ہوئی چابیوں کو بے بسی سے دیکھ رہے تھے پھر ابا حضور کو دیکھ کر شرمندگی سے سر جھک گئے۔ انہوں نے ایک ایزی چیئر پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "کیسی مجبوری سی مجبوری ہے۔ سامنے



چابیاں پڑی ہیں مگر ہاتھ بڑھا کر اٹھا نہیں سکتے۔ کیا اٹھا سکتے ہو؟ چلو کوشش کر دیکھو۔ ہمت مرداں مدد شیطان۔ ایسے کاموں میں شیطان مدد کرتا ہے........."

دونوں بیٹے بار بار چابیوں کو دیکھ رہے تھے اور اپنے ہاتھ بے بسی سے مل رہے تھے پھر انہوں نے دونوں ہاتھ معافی مانگنے کے انداز میں جوڑ کر سر کو جھکا لیا۔ وہ بولے۔ "جو ہاتھ اپنے پرورش کرنے والے بزرگوں کی گردن تک پہنچتے ہیں' انہیں ہم نے بہت پہلے توڑ دیا ہے۔ یہ جو تمہارے ہاتھ ہیں' ہاتھی کے دانت ہیں۔ یہ اسی طرح جوڑنے کے لیے ہیں' بزرگوں کو توڑنے کے لیے نہیں ہیں' اب جاؤ یہاں سے۔"

وہ دونوں یوں جلدی سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے جیسے صیاد نے جال سے نکلنے کی اجازت دے دی ہو پھر وہ دونوں ہاتھ بدستور جوڑے سر جھکائے الٹے قدموں چلتے ہوئے دروازہ کھول کر باہر چلے گئے۔ وہ اپنی خواب گاہ میں تنہا رہ گئے۔ آدمی بڑھاپے میں اپنوں کو خواہ کتنا ہی اپنا بنا کر رکھے پھر بھی تنہا رہ جاتا ہے۔

فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ انہوں نے ٹیلی فون کی طرف دیکھا۔ پھر ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھایا اور کان سے لگا کر کہا۔ "ہیلو! ہم بول رہے ہیں۔"

دوسری طرف سے رئیس ہمدانی نے پوچھا۔ "ہم کون؟"

"جو ضرورت مند ہوتے ہیں' وہ ہماری آہٹ سے ہمیں پہچان لیتے ہیں اور جو نہیں پہچانتے' وہ اپنی مراد نہیں پاتے۔"

ہمدانی نے کہا۔ "جی' جی ہاں' آپ درست فرماتے ہیں۔ وہ بات یہ ہے کہ میں نے آپ کی آواز پہچان لی تھی۔ صرف تصدیق چاہتا تھا۔ مجھے پتا چلا ہے' آج آپ نے اپنے داماد کو گھر بلایا ہے۔ مجھے امید ہے کام بن گیا ہوگا۔"

"کام بنانے سے ضرور بنتا ہے لیکن آپ کی آفر کم ہے۔"

"محترم پیر شاہ صاحب! میں ایک کروڑ دے رہا ہوں' کیا یہ کم ہیں؟"

"زیادہ نہیں ہیں۔ ہمارا اصول ہے۔ ہم زیادہ کے پیچھے نہیں بھاگتے اور کم ہو تو منہ نہیں لگاتے۔ حلوے میں مٹھاس نہ ہو تو کوئی اسے منہ نہیں لگاتا اور مٹھاس زیادہ ہو تو منہ لگانے والا شوگر کا مریض بن جاتا ہے لہٰذا آپ زیادہ آفر نہ دیں اور کم بھی نہ دیں۔"

"دیکھیے محترم! انکوائری شروع ہونے والی ہے۔ آپ ہی بتا دیں' یہ آپ کا مولوی داماد کتنے میں ایمان بیچے گا؟"

"ایمان کبھی بکتا نہیں ہے۔ البتہ عارضی طور پر اسے کمزور بنا کر کام نکال لیا جاتا ہے۔ آپ نے اسے کمزور بنانے کے لیے اس کی شریک حیات کو اغوا کرایا۔ آپ اپنی زبان سے کبھی اعتراف نہیں کریں گے کیونکہ وہ ہماری صاحبزادی بھی ہے۔"

"میں اپنے بچوں کی قسمیں کھا کر کہتا ہوں کہ نہ میں نے آپ کی صاحب زادی کو اغوا کیا ہے اور نہ کسی سے کرایا ہے۔ میری تو پہلے ہی جان پر بنی ہوئی ہے' اپنی جان آپ کے ذریعے بچانا چاہتا ہوں۔ پھر آپ سے دشمنی کیسے کر سکتا ہوں؟"

"چلیں کوئی بات نہیں۔ جس نے بھی دشمنی کی ہے' وہ زمین پر ناک رگڑتا ہوا میری بیٹی کو خود ہی واپس لائے گا۔ آپ کا جو مسئلہ ہے اسے حل کرنے کے لیے آپ دو کروڑ دیں گے۔"

"محترم پیر شاہ صاحب! یہ تو بہت ہے۔"

"قرض نادہندگان کی فہرست میں آپ کا نام تیسرے نمبر پر ہے۔ اگر آپ عدالت میں کھینچے گئے تو آپ کا سیاسی کیریئر بالکل تباہ ہو جائے گا۔ سزا بھی ہوگی اور کروڑوں کی جائداد بھی ضبط کی جائے گی۔"

"اسی لیے تو آپ کا دامن تھام رہا ہوں۔ آپ پیر صاحب ہیں۔ آپ کی پہنچ بڑی دور تک ہے۔ بس ایک فائل غائب کرا دیں تو قصہ ہی ختم ہو جائے گا۔ میں قرضہ لینے کے الزام سے ہی بری ہو جاؤں گا۔"

"آپ کی طرح اور بھی دو بڑے صاحب ہیں۔ وہ بھی قرضہ لینے کے الزام سے بری ہو جانا چاہتے ہیں۔ وہ ہماری مطلوبہ رقم کی ادائیگی کر چکے ہیں۔ صرف آپ ہیں کہ مختلف ہتھکنڈے آزما رہے ہیں۔ چلیں یہ آپ کو حق پہنچتا ہے کہ آپ کسی طرح کی ادائیگی سے کترا کر قرضہ لینے کے الزام سے محفوظ رہیں۔"

"نہیں محترم! میں آپ کے تعاون کے بغیر الزام سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ آپ فرمائیں رقم کہاں ادا کروں؟"



"لندن' پیرس' فرینکفرٹ' روم' نیویارک' شکاگو' مانٹریال اور واشنگٹن کے ان بینکوں میں سے کسی ایک بینک میں رقم جمع کرا دو' جس کا پتہ اور اکاؤنٹ نمبر میرا پرسنل اسسٹنٹ بتائے گا۔ میرا پی اے ابھی آپ سے رابطہ کرے گا۔"

انہوں نے کریڈل پر ہاتھ رکھا پھر ہاتھ اٹھا کر دوسرے نمبر ڈائل کیے۔ رابطہ قائم ہونے پر پی اے سے کہا۔ "رئیس ہمدانی کو جس غیر ملک کے شہر میں آسانی ہو' وہاں کا میرا بینک اکاؤنٹ نمبر بتا دو۔"

انہوں نے اپنے داماد صداقت علی سے کہا تھا کہ ہمدانی پچاس لاکھ روپے دے رہا ہے۔ اس کی فائل غائب کر دو جبکہ انہوں نے دو کروڑ میں اس فائل کا سودا کر لیا تھا۔ پھر یہ کہ رقم زیادہ ہو یا کم' داماد راضی نہیں تھا۔ وہ فائل انکوائری افسر کے ذریعے عدالت تک پہنچنے والی تھی۔

لیکن پتھر کی لکیر مٹائی نہیں جا سکتی تھی۔ سیاسی' سماجی اور انڈر گراؤنڈ رہنے والے تمام جرائم پیشہ افراد یقین رکھتے تھے کہ پیر عظمت اللہ شاہ سلطانی جس سے سودا کر لیتے ہیں کہ وہ سیاہ کو سفید بنا دیں گے اور رات کو سورج طلوع کرا دیں گے تو ان کی یہ باتیں پتھر کی لکیریں سمجھ لی جاتی تھیں۔

سسر اور داماد کے درمیان ہمیشہ کشیدگی رہا کرتی تھی۔ داماد کبھی سسرال نہیں آتا تھا۔ اس رات برسوں بعد سسر نے اسے بلایا تھا۔ ہاجرہ کے اغوا ہونے کا معاملہ ایسا تھا کہ صداقت علی کو ایک دن کے لیے اسلام آباد سے کراچی آنا پڑا تھا پھر گونگی بہری بیٹی شہناز بھی پچھلے ایک برس سے نانا کے پاس رہنے لگی تھی۔ اپنی اکلوتی بیٹی سے بھی ملنا ضروری تھا' یعنی وہ بیوی اور بیٹی کی محبت میں آیا تھا۔ یہ پیر عظمت اللہ شاہ سلطانی کی حکمت عملی تھی۔ انہوں نے اپنے ناراض داماد کو اپنی کوٹھی کی انیکسی تک آنے پر مجبور کر دیا تھا۔

فون کی گھنٹی دوبارہ بجنے لگی۔ پیر شاہ سلطانی نے ریسیور اٹھا کر کہا۔ "ہیلو! ہم بول رہے ہیں۔"

دوسری طرف سے آواز آئی۔ "سر! اسلام آباد سے بول رہا ہوں۔ آپ کا خیال درست تھا۔ آپ کے داماد نے رئیس ہمدانی کی فائل کو اپنے بنگلے میں لے جا کر چھپایا تھا۔

میں اسے لے آیا ہوں۔ کل صبح کی فلائٹ سے آکر فائل آپ کو پیش کردوں گا۔"

"کیا صداقت کے بنگلے میں تالا توڑ کر گئے تھے؟"

"نو سر! دروازے کے لاک کو تار سے کھولا تھا۔ وہ آٹومیٹک لاک تھا۔ واپسی میں دروازے کو زور سے بند کیا تو وہ دوبارہ لاک ہو گیا ہے۔ آپ کے داماد کو کچھ دنوں تک چوری کا شبہ نہیں ہوگا۔"

"تم انعام کے مستحق ہو۔ کل صبح تک فائل لے کر چلے آؤ۔"

پیر عظمت اللہ شاہ سلطانی ریسیور رکھ کر زیرلب مسکرانے لگے۔

★===========★===========★

انیکسی میں شہناز ایک ہینگنگ چیئر پر بیٹھی جھولتے جھولتے سو گئی تھی۔ اس سے ذرا فاصلے پر صداقت علی کرسی پر بیٹھا اسے پیار سے دیکھ رہا تھا اور کچھ سوچ رہا تھا۔ ہینگنگ چیئر جھولتی ہوئی آہستہ آہستہ بیٹی کو اس کے قریب لاتی تھی پھر دور لے جاتی تھی۔ اسے اپنی شریک حیات ہاجرہ کا ایک گیت دھیمی آواز میں سنائی دے رہا تھا۔ گیت کی مدھر آواز کے ساتھ بیٹی کا چہرہ دھندلانے لگا۔ اس کی جگہ بیوی کی صورت نمایاں ہوتی گئی۔

"جب بھی تم یاد کرو گے تو نگاہوں میں چلی آؤں گی
یادوں کے جھولے میں دور کبھی پاس چلی آؤں گی"

ایسے رومان پرور گیت کے ماحول میں ہاجرہ بائیس برس پہلے کی جوان دوشیزہ نظر آ رہی تھی۔ گیت کے اختتام پر منظر بدل گیا۔ اب اس کے تصور میں ہاجرہ پریشان نظر آ رہی تھی اور ریسیور کان سے لگائے کہہ رہی تھی۔ "تم جانتے ہو صداقت! میں تمہیں کس طرح دل وجان سے چاہتی ہوں۔ میں تم سے دور رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی مگر ابا حضور نے مجھے اپنی قسم دی ہے کہ جب تک تم مجھے لینے یہاں نہیں آؤ گے' میں وہاں تمہارے پاس نہیں جاؤں گی۔ اگر جاؤں گی تو وہ اپنی توہین برداشت نہیں کریں گے' خودکشی کرلیں گے۔"

صداقت علی نے بھی کان سے ریسیور لگا رکھا تھا۔ ایک چار ماہ کی ننھی سی بچی



چھوٹے سے جھولے میں لیٹی ہوئی تھی۔ صداقت علی ایک ہاتھ سے فیڈر پکڑے اسے دودھ پلا رہا تھا اور دوسرے ہاتھ سے ریسیور کان سے لگائے کہہ رہا تھا۔ "ہاجرہ! تمہارے ابا پیر شاہ سلطانی خودکشی کرلیں گے؟ یہ ایک بیٹی یقین کر سکتی ہے لیکن یہ ہم سب کے لیے ایک لطیفہ ہے۔ تمہارے ابا حضور مرنے کے لیے نہیں' ہم جیسوں کو بے موت مارنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔"

"میرے ابا حضور جیسے بھی ہیں' تم بحث نہ کرو۔ مجھ سے محبت ہے تو مجھے یہاں آ کر لے جاؤ۔"

"وہ چاہتے ہیں کہ میں ان کی بیٹی کو لینے وہاں آؤں اور میں کہتا ہوں تمہاری بیٹی یہاں تمہارے دودھ سے محروم ہے۔ تم ایک ماں ہو' اپنے باپ کی قسم توڑ کر بیٹی کے پاس آ سکتی ہو۔"

"میں اپنی بیٹی کے لیے تڑپ رہی ہوں لیکن میں بھی کسی کی بیٹی ہوں۔ آج میں ابا حضور کی نافرمانی کروں گی' کل تمہاری بیٹی بھی تم سے نافرمانی کرے گی۔ ہم جو سلوک اپنے بزرگوں سے کرتے ہیں' وہی سلوک ہماری اولاد ہم سے کرتی ہے۔"

"درست کہتی ہو لیکن اپنی تہذیب کے مطابق اولاد کی پرورش اور تربیت کی جائے تو بیٹی بیاہ کے بعد باپ کی نہیں' شوہر کی ہوتی ہے لیکن تم چار ماہ کی بیٹی چھوڑ کر مجھے اپنے میکے بلا رہی ہو۔ کیا تم نہیں جانتیں کہ جس ٹھیکے دار کے ٹینڈر کو میں نے نامنظور کیا ہے' وہ اسے منظور کرانے کے لیے مجھے اپنے گھر بلا رہے ہیں۔ میں تمہیں میکے سے لینے ہزار بار آ سکتا ہوں مگر ایسا کوئی ٹینڈر پاس نہیں کروں گا جس کے لیے میرا ضمیر مجھے اجازت نہ دیتا ہو۔"

"میں ایسی باتیں نہیں جانتی۔ میں نے سنا ہے کہ تم نہ آئے تو ابا حضور تمہیں اسلام آباد سے کسی چھوٹے شہر میں بھیج دیں گے۔"

"تمہارے ابا حضور نے ایسا فیصلہ کرنے میں دیر کر دی ہے۔ میں دو دن کے بعد لندن کے سفارت خانے میں سیکریٹری کا عہدہ سنبھالنے جا رہا ہوں۔ اگر تم ساتھ نہیں چلو گی تو میں اپنی بیٹی شہناز کو ساتھ لے کر چلا جاؤں گا۔"

"نہیں، تم مجھ پر ایسا ظلم نہیں کرو گے۔ مجھے میری بچی سے جدا نہیں کرو گے۔"

"میں تمہیں بلا رہا ہوں۔ تم نہیں آ رہی ہو، کیا بچی کے بلانے سے بھی نہیں آؤ گی؟ سنو، اس کی آواز سنو۔ یہ تمہیں پکار رہی ہے۔"

صداقت نے ایسا کہتے ہوئے بچی کے منہ سے فیڈر کی نپل نکال دی۔ منہ سے دودھ چھوٹتے ہی بچی رونے لگی۔ صداقت نے ریسیور روتی ہوئی بچی کے سامنے کر دیا۔

ہاجرہ ریسیور کے ذریعے بچی کے رونے کی آواز سن کر تڑپ گئی۔ "نہیں۔ اسے کیوں رلا رہے ہو؟ اسے چپ کراؤ۔ ابھی تو وہ چپ تھی، کیا تم اپنی بیٹی کے ساتھ ظلم کر رہے ہو؟"

صداقت روتی ہوئی بیٹی پر جھکا اور ریسیور کی طرف منہ کر کے بولا۔ "میں نے اس کے منہ سے دودھ چھڑایا ہے۔ یہی تم نے بھی کیا ہے۔ یہ میرے نہیں، تمہارے ظلم پر فریاد کر رہی ہے۔ تمہیں پکار رہی ہے۔ یہ کہہ رہی ہے کہ بازار کا دودھ ختم ہو سکتا ہے مگر قدرتی طور پر ماں جو دودھ پلاتی ہے، وہ کبھی آؤٹ آف مارکیٹ نہیں ہوتا۔"

ہاجرہ کے ریسیور سے بچی کے رونے کی آواز ابھرتی جا رہی تھی۔ پیر عظمت اللہ شاہ سلطانی نے بیٹی کے پیچھے آ کر ریسیور کو دیکھا پھر اس سے ریسیور چھین کر اپنے کان سے لگایا۔ ہاجرہ نے روتے ہوئے کہا۔ "ابا حضور! ذرا سنئے۔ میری شہناز رو رہی ہے۔ دودھ کے لیے بلک رہی ہے۔ اسے میری ضرورت ہے۔"

پیر شاہ سلطانی نے کہا۔ "تم جاؤ۔ وہ تمہاری ممتا کو بھڑکا رہا ہے۔ بچی ابھی خاموش ہو جائے گی۔ تم جاؤ، ہم اس سے نمٹ لیں گے۔"

وہ ہچکچاتے ہوئے کچھ کہنا چاہتی تھی کہ وہ سخت لہجے میں بولے۔ "کیا تم نے سنا نہیں، اگر بچی کا آرام اور سکون چاہتی ہو تو جاؤ ہمیں تنہائی میں باتیں کرنے دو۔"

ہاجرہ نہ چاہتے ہوئے بھی دور چلی گئی۔ اس طرح یہ تو ہوا کہ ممتا کو جھنجھوڑنے والی آواز سے دور ہو گئی۔ پیر شاہ سلطانی نے ریسیور کان سے لگا کر پوچھا۔ "یہ کیا ڈراما کر رہے ہو؟ کیا یہ سمجھتے ہو کہ بچی کی آواز سن کر ماں دوڑی چلی آئے گی؟"

"ڈراما تو آپ کر رہے ہیں۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ دوسرے سرکاری اہم افسروں



کی طرح مجھے نوکر شاہی کا سبق پڑھا سکیں گے۔ اگر پڑھنے سے انکار کر دوں تو مجھے میری بیوی سے جدا کر دیں گے؟"

"وہ تو ہم کر ہی رہے ہیں۔ پہلے سوچا تھا، اسی ملک کے کسی شہر میں ٹرانسفر کرا دیں گے پھر سوچا کہ سات سمندر پار بھیج دیں گے تو ہاجرہ کچھ عرصے تک بچی کو یاد کرے گی اور روئے گی پھر صبر کر لے گی اور جب اسے صبر آ جائے گا تو ہم اسے طلاق حاصل کرنے کے راستے پر لے آئیں گے۔ پھر کسی ایسے اعلیٰ عہدے دار کو اپنا داماد بنائیں گے جو ہم سے نوکر شاہی کی چالیں چلنے کا سبق پڑھتا رہے گا اور عمل کرتا رہے گا۔ یہ.......... یہ بچی چپ ہو گئی تھی۔ پھر کیوں رو رہی ہے؟ اسے چپ کراؤ ورنہ ہاجرہ پھر چلی آئے گی۔"

"اس دنیا میں آنے والی تمام ہستیوں کو ہنسنے اور رونے کی آزادی ہے۔ یہ بچی اپنے باپ کی طرح آپ کی تمام عائدہ کردہ پابندیوں سے آزاد ہے۔ یہ اپنی مرضی سے رو رہی ہے۔ آپ فون بند کر سکتے ہیں، میری بچی کا منہ بند نہیں کر سکتے۔"

"وہ ہمارے سامنے ہوتی تو ہم اسے سندور کھلا دیتے۔ اس کی آواز بند ہو جاتی، وہ گونگی ہو جاتی۔"

"واہ، ہماری دنیا میں کیسے رشتے ہیں۔ ایک نانا اپنی نواسی کو اس لیے گونگی بنانا چاہتا ہے کہ اس کی بیٹی تک میری بیٹی کی آواز نہ پہنچے۔ جب آپ یہ چاہتے ہیں تو میں بھی چاہوں گا کہ آپ کی بیٹی کی آواز میری بیٹی کے کانوں تک نہ پہنچے۔ انسان کو اپاہج بنانے کے کئی طریقے ہیں۔ طبی منفی طریقوں سے کسی کو بھی گونگا اور بہرا بنایا جا سکتا ہے۔ کیا میں آپ کی نواسی کو ایسا بنا دوں؟"

"ہم سے کیا پوچھتے ہو؟ ہم نے اپنی بیٹی کو تمہارے ظلم سے بچا لیا ہے۔ تم اپنی بیٹی کو گونگی بہری بناؤ یا مار ڈالو، ہمارے لیے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

"ہاجرہ کو تو فرق پڑے گا۔ اگر وہ یہاں نہیں آئے گی، میرے ساتھ اور اپنی بیٹی کے ساتھ یو کے نہیں جائے گی تو پھر تمام عمر اپنی بیٹی کی زبان سے "امی" کا لفظ نہیں سن سکے گی کیونکہ وہ بہری ہو گی۔ میری یہ وارننگ ہاجرہ تک پہنچا دیں۔ خدا حافظ۔"

صداقت علی نے ایک ہاتھ سے پکڑے ہوئے ریسیور کو کریڈل پر رکھ دیا۔ وہ

دوسرے ہاتھ سے فیڈر کے ذریعے بچی کو دودھ پلا رہا تھا۔

صداقت علی نے اپنی دونوں آنکھیں بند کیں پھر کھولیں تو منظر بدل گیا۔ اکیس برس کی نوجوان گونگی بہری بیٹی ہینگنگ چیئر پر بیٹھے بیٹھے سو رہی تھی۔ وہ جھولتی ہوئی کرسی بہت ہولے ہولے کبھی قریب آ رہی تھی اور کبھی دور جا رہی تھی۔

صداقت علی نے اپنی آنکھیں بند کیں پھر کھولیں تو منظر بدل گیا۔ وہ لندن کے ایک کاٹیج میں تھا۔ ایک کرسی پر بیٹھا میز پر جھکا ہوا کچھ لکھ رہا تھا۔ کھڑکی کے شیشوں کے پار برف باری کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ وہ خط لکھ رہا تھا۔ "ہاجرہ! میں نے یہاں آتے ہی تمہیں خط لکھا تھا مگر جواب نہیں ملا۔ میں سمجھتا ہوں' ڈاکیا خط پہنچانے گیا ہوگا مگر ڈاکو نے خط اچک لیا ہوگا۔ میں نے ایک برس کے بعد ہی سفارت خانے کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا تھا کیونکہ میرا تبادلہ کیا جا رہا تھا۔ پاکستان واپس بلایا جا رہا تھا۔ شاید تمہارے ابا حضور میری زندگی کی گاڑی کو کسی دوسری پٹڑی پر چلانا چاہتے تھے۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ جب تک تم محبت سے نہیں بلاؤ گی میں اپنی بیٹی کے ساتھ نہیں آؤں گا۔

"میں اسکاٹ لینڈ یارڈ میں سراغ رسانی کی ٹریننگ حاصل کر رہا ہوں۔ تمہارے ابا حضور نے مجھے پاکستانی انٹیلی جنس کے شعبے سے نکلوا کر یہاں سفارت خانے میں پہنچا دیا تھا۔ ایسا کرتے وقت وہ بھول گئے تھے کہ یہاں مجھے سراغ رسانی کی مکمل تربیت حاصل کرنے کے مواقع ملیں گے اور مل رہے ہیں۔

"شعبہ بدلنے کے بعد بھی میں ہر سال تمہیں ایک خط لکھتا رہا اور ہماری بیٹی کی ہر سال تازہ تصویر بھیجتا رہا لیکن جو نانا ایسا پتھر ہو کہ اپنی روتی ہوئی نواسی کی آواز اس کی ماں تک نہ پہنچانا چاہے وہ میرا خط اور تمہاری بیٹی کی تصویر بھلا تم تک کیوں پہنچائے گا۔

"آٹھ برس گزر چکے ہیں۔ مجھے وہ رات اب بھی یاد ہے جب تم فون پر اپنی ننھی بیٹی کے رونے کی آواز نہ سن سکیں۔ تمہارے ابا حضور نے سنا اور غصے میں کہا کہ بچی ان کے سامنے ہوتی تو اسے سندور کھلا دیتے۔ اس کی آواز بند ہو جاتی اور وہ گونگی ہو جاتی تاکہ بیٹی کی آواز تمہارے کانوں تک نہ جا سکے۔

"ایسے وقت مجھے غصہ آیا۔ میں نے غصے میں چیلنج کیا کہ تم میرے ساتھ یو کے



نہیں آؤ گی تو میں میڈیکل منفی طریقے سے بیٹی کو گونگی اور بہری بنا دوں گا تاکہ وہ تمہیں کبھی ماں نہ کہہ سکے اور تم جب بھی بیٹی کہو تو اسے سنائی نہ دے۔

"آہ! ہمارے بزرگ کہا کرتے تھے کہ ہمیشہ سوچ سمجھ کر زبان سے کلمات ادا کیا کرو۔ جانے کون سی گھڑی ایسی ہوتی ہے کہ منہ سے نکلی ہوئی اچھی یا بری بات پوری ہو جاتی ہے۔

"یہ ہماری زندگی کا سب سے بڑا المیہ ہے کہ ہماری بیٹی شہناز پیدائشی گونگی اور بہری ہے۔ میں نے یہاں کے بڑے نامور اور تجربہ کار ڈاکٹروں سے معائنہ کروایا ہے۔ ایک امید تھی کہ علاج کے ذریعے کچھ تو بولنے لگے گی۔ شاید کچھ سننے بھی لگے لیکن مجھ جیسے باپ کا اور تمہارے باپ جیسے شخص کا غصہ اس معصوم کے لیے بددعا بن گیا ہے۔"

صداقت علی اپنے تحریر کردہ خط کو پڑھ رہا تھا۔ اس خط کے مطابق لندن میں گونگے اور بہرے بچوں کے اسکول میں شہناز نظر آ رہی تھی۔ کچھ بچے اسکول کے سامنے والے میدان میں کھیل رہے تھے اور کچھ اشاروں کی زبان میں دونوں ہاتھوں کی حرکت سے گفتگو کر رہے تھے۔ آٹھ برس کی شہناز نے ایک طرف اپنے باپ کو کار سے اترتے دیکھا تو وہ دوڑتی ہوئی اس کے پاس آئی۔ باپ نے اسے دونوں بازوؤں میں اٹھا کر پیار کیا پھر اسے گھاس پر کھڑا کیا۔ وہ دونوں ہاتھوں کے اشارے سے اپنے دل کی بات ظاہر کرنے لگی۔ صداقت نے بھی دونوں ہاتھوں کی حرکت سے اشارے کی زبان بھی اختیار کی اور اپنی زبان سے بھی بولا۔ "ہاں بیٹے! مجھے یاد ہے۔ کل ویک اینڈ ہے۔ تمہاری' اسکول سے اور میری ٹریننگ سینٹر سے چھٹی ہے۔ ہم سی سائڈ جائیں گے اور خوب انجوائے کریں گے۔"

منظر بدل گیا۔ صداقت علی اس میز اور کرسی پر بیٹھا اپنا تحریر کردہ خط پڑھ رہا تھا۔

"ہاجرہ! یہ ہے ہماری گونگی بیٹی۔ اس کے گونگے پن پر محض افسوس ہوتا ہے لیکن اس کے بہرے پن سے دل میں طرح طرح کے اندیشے جنم لیتے ہیں۔ سوچتا ہوں' اگر یہ فٹ پاتھ سے اتر کر سڑک کراس کر رہی ہو اور ایسے میں گاڑی کا ہارن سنائی نہ دے تو خدانخواستہ حادثے کا شکار ہو جائے گی اور یہ سوچ کر خوفزدہ ہو جاتا ہوں کہ رات کی تاریکی میں کوئی

چور' ڈاکو یا قاتل اس کے کمرے میں گھس آئے تو.......... تو کیا ہوگا؟"

منظر بدل گیا۔ خواب گاہ میں نیم تاریکی تھی۔ شہناز بستر پر گہری نیند میں ڈوبی ہوئی تھی۔ کوئی اس کی خواب گاہ میں داخل ہوا تھا۔ نزدیک اور دور کی آواز سننے والے بھی گھوڑے بیچ کر سوتے ہیں۔ وہ بیچاری تو قوت سماعت گنوا کر سو رہی تھی۔ اس شخص کے ہاتھ میں ایک ریوالور تھا۔ وہ دبے قدموں چلتا ہوا اس کے قریب جا رہا تھا۔ دنیا کی کوئی آواز اسے گہری نیند سے جگا نہیں سکتی تھی۔ اسے جگانے کے لیے اسے پکڑ کر جھنجھوڑا جاتا تب وہ آنکھیں کھولتی لیکن قاتل مسخرے نہیں ہوتے۔ کوئی احمق بھی شکار کو جگا کر قتل نہیں کرتا۔ اس کی نیند سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ اس کا کام تمام کرتا ہے اور چلا جاتا ہے۔

وہ قریب تر ہو گیا۔ ریوالور والا ہاتھ آگے بڑھتا ہوا اس کے سر کے پاس آیا۔ ریوالور کی نال اس کی کنپٹی سے لگی۔ اسی لمحے فائر کی زوردار آواز کے ساتھ گولی چل گئی۔

گولی جب اس قدر قریب سے چلتی ہے تو نشانہ کبھی خطا نہیں ہوتا۔

★==========★==========★

صداقت علی اپنا تحریر کردہ خط پڑھ رہا تھا۔ "ہاجرہ! میں نے سوچا تھا کہ اب کبھی خط نہیں لکھوں گا اور نہ ہی یہ کبھی بتاؤں گا کہ ہماری بیٹی شہناز گونگی اور بہری ہے۔ اس قدر بہری ہے کہ اس کے کان کے قریب کنپٹی پر ریوالور چلاؤ تو فائر کی زور دار آواز بھی اسے سنائی نہیں دیتی۔ اگرچہ وہ ریوالور نقلی تھا لیکن اس کے پٹاخے کی آواز زوردار تھی۔ میں یہ ساری باتیں کبھی نہ لکھتا لیکن دنیا گول ہے' میں گھوم پھر کر دوبارہ پاکستان آ رہا ہوں۔ میں نے اسکاٹ لینڈ یارڈ میں ٹریننگ کے آخری سال تک ہمیشہ اے گریڈ نمبر حاصل کیے ہیں۔ کئی خطرناک مجرموں کے علاوہ دو بین الاقوامی مجرموں کو گرفتار کرایا ہے۔ ایسی کارکردگی کے باعث کئی ممالک نے اپنے انٹیلی جنس ڈپارٹمنٹ میں اعلیٰ عہدے کی پیش کش کی ہے۔ حکومت پاکستان نے بھی مجھے اسی انٹیلی جنس ڈپارٹمنٹ میں واپس بلایا ہے جہاں سے تمہارے ابا پیر نے مجھے نکلوا کر جلا وطن کر دیا تھا۔ وہاں میں ایک جونیئر افسر تھا۔ اب میں انٹیلی جنس ڈپارٹمنٹ میں ڈائریکٹر جنرل بن کر آ رہا ہوں۔ پچھلے سات برسوں تک



شاید تمہیں میرا ایک خط بھی نہیں ملا ہوگا مگر یہ آٹھواں خط تمہارے ہاتھوں میں ضرور پہنچے گا کیونکہ ڈائریکٹر جنرل کی حیثیت سے میری تقرری ہو چکی ہے۔ میرا یہ خط عام ڈاکیا نہیں لے جائے گا بلکہ انٹیلی جنس کا افسر اسے تمہارے ہاتھوں تک پہنچائے گا۔

"یوں تو خط کی جگہ میں اپنی بیٹی کے ساتھ تمہارے سامنے ہوتا لیکن میں ڈیوٹی پر ہوں۔ پاکستان سے ایک مجرم فرار ہو کر یورپ کی طرف آیا ہے۔ میں اسے حراست میں لے کر آؤں گا۔ فی الحال تم مجھے نہ سہی اپنی پیاری سی بیٹی کی تصویر دیکھو۔ فقط تمہارا اپنا۔ صداقت علی۔"

اس نے خط کو تہہ کر کے شہناز کی ایک تصویر کے ساتھ اسے لفافے میں رکھ دیا۔

آٹھ برس کا عرصہ کچھ کم نہیں ہوتا۔ اگر میاں بیوی کی جدائی اتنی طویل ہو جائے تو وہ طلاق لے کر اپنا اپنا الگ گھر بسا لیتے ہیں۔ پیر عظمت اللہ شاہ سلطانی نے یہی بات اپنی بیٹی ہاجرہ کو کئی بار سمجھائی کہ وہ صداقت علی سے علیحدگی اختیار کر لے۔ طلاق کے معاملے میں صداقت علی کا کیس بہت کمزور ہوگا۔ اسلامی قانون کے مطابق جو شوہر اپنی بیوی کو چھوڑ کر ملک سے باہر چلا جائے' اسے میکے کا محتاج بنا دے' اس کے نان نفقے کے اخراجات پورے نہ کرے تو پھر آپ ہی آپ طلاق ہو جاتی ہے۔

پیر شاہ سلطانی نے ایک بہت کلیدی عہدے کے افسر کی چند کلیدی کمزوریوں کے ثبوت حاصل کر لیے تھے۔ اس کے ذریعے آتے جاتے حکمرانوں کی کئی کمزوریاں ہاتھ آ سکتی تھیں۔ انہوں نے ہاجرہ سے کئی بار کہا۔ "ایک بہت بڑا سرکاری افسر ہماری نظروں میں ہے۔ تم ہاں کہہ دو تو ہم جلد از جلد شادی کرا دیں گے۔"

ہاجرہ نے کہا۔ "سوری ابا حضور! صداقت نے مجھے نہیں' میں نے صداقت کو تکلیف پہنچائی ہے۔ مجھے ان کی ایک آواز پر جانا چاہیے تھا مگر وہ نہیں جانتے کہ میں ان کی اور ان کی بیٹی کی سلامتی کی خاطر نہیں گئی۔ آپ کا اٹل فیصلہ تھا کہ میرے اسلام آباد پہنچنے سے پہلے ہی صداقت اور شہناز کو گولی مار دی جائے گی۔ صداقت جن مجرموں کو سزا دلا رہے ہیں' ان کے حواری انہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

"ہم نے غلط نہیں کہا تھا۔ اگر صداقت ہماری بات مان لیتا' ان مجرموں کا کیس

کمزور بنا کر پیش کر دیتا تو اسے لاکھوں روپے بھی ملتے اور جان کی سلامتی بھی۔ تمہارے شوہر نے ہماری نافرمانی کی‘ اس لیے ہم نے یہی شرط رکھی کہ وہ یہاں آ کر تمہیں اپنے ساتھ لے جائے۔ اگر وہ آ جاتا تو ہم دشمنوں سے اس کی صلح اور سمجھوتہ کرا دیتے لیکن وہ سرکش‘ ضدی اور نافرمان ہے۔ اس کے باوجود ہم نے اسلام آباد تک ذرائع استعمال کر کے اسے لندن بھیج دیا تاکہ تمہارا سہاگ سلامت رہے مگر اس کی نظروں میں تمہاری کوئی اہمیت نہیں ہے۔ وہ یہاں آتا اور تمہیں لے جاتا مگر صرف بیٹی کو لے گیا۔"

"پتا نہیں وہ کہاں ہیں۔ اتنے برس ہو گئے‘ ایک خط بھی نہیں لکھا۔ میں نے سفارت خانے میں خط لکھا تو جواب آیا کہ انہوں نے ملازمت چھوڑ دی ہے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ مجھ سے اس قدر ناراض ہوں گے۔"

"وہ تم سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔ اس کا کوئی اور چکر ہو گا۔ کسی انگریز عورت سے شادی کر لی ہو گی۔ تمہاری بیٹی کے لیے سوتیلی ماں لے آیا ہو گا۔"

"وہ ایسے نہیں ہیں۔ میں نے خوب سوچ سمجھ کر انہیں اپنا جیون ساتھی بنایا ہے۔"

"تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ اس نے تمہیں چھوڑ کر دوسری شادی نہیں کی ہے؟"

"اس لیے کہتی ہوں کہ میں نے بھی انہیں نہیں چھوڑا۔ میں نے بھی دوسری شادی نہیں کی ہے۔ میں انتظار کرتی ہوں تو میرا دل کہتا ہے کہ وہ بھی میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔"

"جب تمہاری شادی نہیں ہوئی تھی‘ تب ہم فخر سے کہا کرتے تھے کہ ہماری بیٹی اتنی فرمانبردار ہے کہ شادی کے بعد اپنے شوہر کی بھی اتنی فرمانبردار نہیں رہے گی۔"

"آپ کا یہ فخر برقرار ہے۔ میں آج بھی آپ کی فرمانبردار ہوں اسی لیے شوہر اور بیٹی سے دور ہوں۔ یہ تمام عمر کی دوری بھی ہو سکتی ہے۔ کیا یہ فرمانبرداری کم ہے؟"

فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ انہوں نے ریسیور اٹھا کر کہا۔ "ہیلو۔ ہم بول رہے ہیں۔"

باہر آہنی گیٹ کے کیبن سے سیکیورٹی افسر نے کہا۔ "جناب عالی! انٹیلی جنس کے افسر تشریف لائے ہیں۔"



"ٹھیک ہے۔ انہیں اندر لے آؤ۔"

وہ ریسیور رکھ کر بڑبڑائے۔ "یہ انٹیلی جنس کا افسر کیوں آیا ہے؟ ضرور کوئی گڑبڑ ہے‘ بیٹی تم دوسرے کمرے میں جاؤ۔"

ہاجرہ اٹھ کر وہاں سے چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد انٹیلی جنس کا افسر سیکیورٹی افسر کی رہنمائی میں آیا۔ پیر شاہ سلطانی نے اٹھ کر مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کی آمد سے بے حد خوشی ہو رہی ہے‘ تشریف رکھیے۔"

سیکیورٹی افسر سلیوٹ کر کے چلا گیا۔ پیر شاہ سلطانی نے کہا۔ "آپ تقریباً دو برس کے بعد تشریف لائے ہیں۔ فرمائیے ہم آپ کی کیا خدمت کر سکتے ہیں؟"

"خدمت کے لیے تو میں حاضر ہوا ہوں۔ لندن سے آپ کی صاحب زادی مسز ہاجرہ صداقت کا خط آیا ہے۔ میں یہ خط انہیں دینا چاہتا ہوں۔"

انہوں نے حیرانی سے کہا۔ "تعجب ہے۔ یہ خط ایک ڈاکیا لے کر آ سکتا تھا مگر آپ اسے لے کر آئے ہیں۔ کوئی خاص بات ہے کیا؟ لائیے ہم اپنی بیٹی کو دے دیں گے۔"

انٹیلی جنس کے افسر نے کہا۔ "معافی چاہتا ہوں‘ مجھے سختی سے تاکید کی گئی ہے کہ میں یہ خط آپ کی صاحب زادی کے ہاتھ میں دوں اور دینے سے پہلے ان کا شناختی کارڈ چیک کر لوں۔"

انہوں نے ناگواری سے کہا۔ "یہ ہماری شان و شوکت‘ عزت اور وقار اور ہماری شخصیت پر حملہ ہے۔ ہم اپنی بیٹی کا خط بیٹی کو نہیں دیں گے؟ کس نے آپ کو سختی سے تاکید کی ہے اور اس طرح ہمیں ناقابل اعتبار ظاہر کیا ہے؟"

"جناب عالی! وہ آپ کے داماد ہیں اور ہمارے نئے ڈائریکٹر جنرل ہیں۔"

"کیا؟" پیر عظمت اللہ شاہ سلطانی پر چند لمحوں تک سکتہ طاری رہا پھر انہوں نے بے یقینی سے پوچھا۔ "کیا ہمارا داماد انٹیلی جنس ڈپارٹمنٹ کا ڈائریکٹر جنرل بن گیا ہے؟ مگر یہاں انٹیلی جنس ڈپارٹمنٹ ہے اور اس نے لندن سے خط لکھا ہے۔"

"ہمارے صاحب ایک کیس کے سلسلے میں وہاں ہیں۔ یہاں جلد ہی آ جائیں گے۔"

انہوں نے سوچتی ہوئی نظروں سے افسر کو دیکھا پھر ملازم کو بلا کر کہا۔ "جاؤ ہاجرہ بی بی سے کہو۔ لندن سے خط آیا ہے۔ اپنا شناختی کارڈ لے کر آئیں۔"

ملازم چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہاجرہ اپنا شناختی کارڈ ہاتھ میں لے کر آئی پھر پوچھا۔ "ابا حضور! کیا لندن سے کوئی خط آیا ہے؟"

انٹیلی جنس افسر نے اٹھ کر ادب سے کہا۔ "یس میڈم! میں آپ کا شناختی کارڈ دیکھ سکتا ہوں؟"

ہاجرہ نے سوالیہ نظروں سے والد کو دیکھا۔ انہوں نے ناگواری سے کہا۔ "دکھاؤ۔ تمہارے شوہر نامدار نے یہ پابندی لگائی ہے کہ تمہاری شناخت ہونے کے بعد وہ خط تمہارے ہاتھوں میں دیا جائے۔"

ہاجرہ نے افسر کو اپنا شناختی کارڈ دیا۔ افسر نے اس کارڈ کی تصویر کو اور ہاجرہ کو دیکھا۔ اس کارڈ کے کوائف پڑھے پھر ایک بڑے سائز کے لفافے کے ساتھ اس کا شناختی کارڈ دیتے ہوئے کہا۔ "میں نے اپنے فرائض کی ادائیگی کے لیے آپ کو زحمت دی۔ پلیز ڈونٹ مائنڈ.........."

وہ سلام کر کے چلا گیا۔ ہاجرہ لفافے پر بھیجنے والے کا نام پڑھ کر بے چین ہو گئی تھی۔ اس نے باپ کو چور نظروں سے دیکھا پھر لفافے کو چاک کرتے ہوئے وہاں سے جانے لگی۔ انہوں نے کہا۔ "ہمیں تمہارے ذاتی خط کے بارے میں کچھ پوچھنا نہیں چاہیے لیکن اپنے داماد کی خیریت معلوم کرنا ہمارا فرض ہے۔ لہٰذا یہ ضرور بتانا کہ وہ لندن میں کیا کر رہا ہے اور یہ کہ آئندہ وہ ہم سے اور تم سے رشتہ رکھنا چاہتا ہے یا نہیں؟"

اس نے باپ کی باتیں سنیں پھر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ پیر عظمت اللہ شاہ سلطانی نے ہونٹوں کو بھینچ لیا۔ صوفے کے ہتھے کو مضبوطی سے یوں جکڑ لیا جیسے داماد کی گردن دبوچ رہے ہوں۔ وہ بڑے بڑے سرکاری عہدے داروں کو بوقت ضرورت مٹھی میں کر لیتے تھے۔ انٹیلی جنس کا نیا ڈائریکٹر جنرل بھی ان کے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا لیکن حیرانی یہ تھی کہ صداقت علی نے لندن میں بیٹھے ہی بیٹھے پاکستان کے اہم شعبے میں سے اہم عہدہ کیسے حاصل کر لیا؟



انہوں نے موبائل فون پر کسی سے رابطہ کیا پھر کہا۔ "ہیلو۔ ہم بول رہے ہیں۔ ہمارا داماد صداقت علی آٹھ برس کے بعد لندن سے واپس آ رہا ہے۔ وہ یہاں کی انٹیلی جنس کا ڈائریکٹر جنرل بن گیا ہے۔ اتنے بڑے شعبے میں اتنی بڑی تبدیلی ہو چکی ہے اور ہمیں اطلاع تک نہیں دی گئی۔ کیا تم سب اپنے فرائض سے غافل ہو گئے ہو؟"

دوسری طرف سے کہا گیا۔ "جناب عالی! آپ یقین کریں کہ جب ہمارے افسر وہ خط لے کر آپ کے دولت خانے کی طرف گئے تو پتہ چلا کہ یہاں ایک بڑی تبدیلی ہو چکی ہے۔ میں نے آپ سے رابطہ کیا لیکن آپ نے اپنا موبائل بند کر رکھا تھا۔"

"اچھا اچھا ٹھیک ہے۔ یہ معلوم کرو کہ اتنے بڑے عہدے پر اس کی تقرری کیسے ہوئی؟ اس تقرری کے پیچھے کون سا بڑا ہاتھ ہے؟ یہاں کے جتنے حساس اداروں میں ہمارے مخبر ہیں ان سب سے رابطہ کرو' ہم پھر فون کریں گے۔"

انہوں نے فون بند کیا۔ ہاجرہ روتی ہوئی آ رہی تھی۔ انہوں نے صوفے سے اٹھ کر پریشانی کے عالم میں پوچھا۔ "کیا بات ہے؟ انٹیلی جنس کا افسر بتا رہا تھا کہ صداقت یہاں ڈائریکٹر جنرل بن کر آ رہا ہے۔ یہ تو خوشی کی بات ہے اور تم رو رہی ہو؟"

وہ اپنے آنچل سے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ "میری بیٹی.......... میں نے اسے چار ماہ کی دیکھا تھا۔ اب وہ آٹھ برس کی ہو چکی ہے لیکن وہ مجھے امی نہیں کہے گی۔"

"کیوں نہیں کہے گی؟ کیا صداقت رشتہ توڑ رہا ہے؟"

"نہیں' وہ مجھے کبھی چھوڑ نہیں سکتے۔ آج بھی وہ یہی چاہتے ہیں کہ میں میکے سے خود ان کے پاس آؤں۔"

"ٹھیک ہے' چلی جانا' لیکن یہ تو بتاؤ' وہ تمہیں امی کیوں نہیں کہے گی؟"

"اس لیے کہ وہ گونگی ہے۔ پیدائشی گونگی ہے۔"

"کیا؟" انہوں نے حیرانی سے کہا پھر ہاجرہ کو سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگے۔

وہ بولی۔ "نہ وہ مجھے امی کہہ سکتی ہے اور نہ ہی میری زبان سے بیٹی کا لفظ سن سکتی ہے۔ وہ پیدائشی گونگی اور بہری ہے۔"

انہوں نے کہا۔ "یہ بکواس ہے۔ وہ پیدائشی ایسی نہیں ہو گی۔ اس نے انتقاماً اسے

گونگی اور بہری اسی طرح بنایا ہے جس طرح بھیک مانگنے والے اپنے بچوں کو ہاتھ پاؤں توڑ کر اپاہج بنا دیتے ہیں۔"

"آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ وہ کس بات کا انتقام لیں گے؟ وہ ایسے ایب نارمل نہیں ہیں کہ اپنی ہی بیٹی کو گونگی اور بہری بنا دیں۔"

"اس نے آٹھ برس پہلے یہاں سے جاتے وقت کہا تھا کہ اگر تم اس کے ساتھ لندن نہیں جاؤ گی اور بیٹی کے رونے کی آواز سن کر کان بند کر لو گی تو پھر کبھی اس کی آواز نہیں سن سکو گی۔ وہ اسے کسی مجرمانہ ذہن رکھنے والے ڈاکٹر کے ذریعے گونگی اور بہری بنا دے گا۔"

"آپ نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ میں ان کے ساتھ اپنی بیٹی کو سینے سے لگا کر لندن چلی جاتی۔"

"ابھی تم نے کہا ہے کہ وہ ایب نارمل نہیں ہے۔ ہم نے بھی یہی سمجھا کہ جو یہاں سے لندن کے سفارت خانے میں سیکریٹری بن کر جا رہا ہے وہ ایب نارمل نہیں ہے، محض غصے میں چیلنج کر رہا ہے لیکن اب یہ بات سمجھ میں آ رہی ہے کہ آدمی مکمل طور پر نارمل نظر آنے کے باوجود کسی ایک آدھ پہلو سے ایب نارمل ہوتا ہے یا حالات اسے اچانک ایسا بنا دیتے ہیں۔"

وہ روتے ہوئے بولی۔ "اگر وہ پیدائشی ایسی نہیں ہے تو اس معصوم پر ظلم کیا گیا ہے۔ میں صداقت کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔"

"ہم برسوں سے تمہیں سمجھاتے آ رہے ہیں لیکن تم بیوی کی حیثیت سے اس کے کردار کا ایک ہی رخ دیکھتی رہیں۔ ہم تصویر کا دوسرا رخ دکھاتے رہے لیکن افسوس بچپن سے باپ کو آئیڈیل سمجھنے والی بیٹیاں شادی کے بعد فراڈ شوہر کو باپ سے زیادہ معتبر سمجھنے لگتی ہیں۔"

"ابا حضور! آج بھی آپ میرے آئیڈیل ہیں۔ میرے لیے آپ بہت معتبر ہیں۔ میں نے کئی بار صداقت کو سمجھایا ہے کہ وہ بھی آپ کی طرح دوسروں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھائیں۔ ہماری سوسائٹی میں سب ہی ایسا کر رہے ہیں لیکن ان کا مزاج آپ سے



مختلف ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ دونوں کے اختلافات کب ختم ہوں گے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ وہ ہر سال مجھے خط لکھا کرتے تھے اور میری بیٹی کی تصویریں بھیجا کرتے تھے لیکن......... لیکن.........."

"ہم ان خطوط اور تصاویر کو تمہارے پاس پہنچنے نہیں دیتے تھے۔ اس نے ہم پر یہ الزام ضرور لگایا ہو گا اسی لیے آج اس نے ایک بہت بڑے افسر کے ذریعے یہ خط تمہارے ہاتھوں تک پہنچایا ہے۔ اس سے بڑی ہماری توہین اور کیا ہو گی کہ ہمارے گھر میں آنے والا خط ہمیں ناقابل اعتبار سمجھ کر نہیں دیا گیا۔ آج ہمیں پہلی بار کسی کے سامنے شرمندہ ہونا پڑا۔"

"میں آپ سے شرمندہ ہوں۔ صداقت کو ایسی بے اعتباری کا اظہار ایک سرکاری افسر کے ذریعے نہیں کرنا چاہیے تھا۔ انہوں نے خط میں بھی اشارتاً یہی لکھا ہے کہ آپ کی وجہ سے مجھے ان کے پچھلے خطوط نہیں ملتے رہے لیکن میں جانتی ہوں، آپ مجھے کس طرح دل و جان سے چاہتے ہیں۔ میری خوشی کو اپنی خوشی سمجھتے ہیں پھر بھلا ان کے خطوط مجھ سے چھپا کر کیا حاصل کریں گے؟"

"تم ہماری ذہین بیٹی ہو۔ صداقت بھی ذہین ہے لیکن ہم سے بدظن رہتا ہے۔ یہ خوش خبری اس کے ماتحت نے سنائی ہے کہ وہ ڈائریکٹر جنرل بن گیا ہے۔ وہ ہمیں اور تمہیں فون کے ذریعے لندن سے یہ خوشخبری سنا سکتا تھا بہرحال اس سے بھی بڑی خوشی یہ ہے کہ وہ بیٹی کو لے کر یہاں آ رہا ہے۔ تم پھر اپنا گھر آباد کر سکو گی۔"

"جی ابا حضور! وہ دن میرے لیے عید کا دن ہو گا جب وہ میری بیٹی کو لے کر آئیں گے۔"

"کیا اس نے آنے کی تاریخ نہیں لکھی ہے؟"

"جی نہیں۔ پاکستان سے کوئی خطرناک مجرم فرار ہو کر کسی دوسرے ملک چلا گیا ہے۔ وہ اسے گرفتار کرنے کے بعد آئیں گے۔ پتہ نہیں وہ کم بخت کب گرفتار ہو گا۔ میں تو اپنی بیٹی کو کلیجے سے لگانے کے لیے تڑپتی رہوں گی۔"

"ڈائریکٹر جنرل جیسے عہدے دار مجرموں کے پیچھے نہیں بھاگتے، اپنے ماتحتوں سے

یہ کام لیتے ہیں مگر تمہارا وہ مجازی خدا کچھ زیادہ ہی احساس ذمہ داری کا مظاہرہ کرتا رہتا ہے۔"

ہاجرہ نے بیٹی کی تصویر دیتے ہوئے کہا۔ "یہ دیکھیے' یہ ہے آپ کی نواسی۔"

انہوں نے تصویر کو دیکھا اور مسکرائے۔ نواسی بھی انہیں دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

★============★============★

وہ آٹھ برس کی بچی ایک ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھی کھانے میں مصروف تھی۔ دوسری کرسیوں پر تین افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک شخص ریسیور کو کان سے لگائے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "بھئی میرا نام پوچھ کر کیا کریں گے؟ اس مجرم کی بات کریں جسے آپ تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔"

دوسری طرف سے صداقت نے پوچھا۔ "کیا تم اس مجرم کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟"

"جانتا ہوں اسی لیے تو فون پر آپ کا قیمتی وقت ضائع کر رہا ہوں۔ وہ میری پناہ میں ہے۔ میری رہائش گاہ میں ہے اور اس وقت میرے ساتھ لنچ کر رہا ہے۔ افسوس کہ آپ اس لنچ ٹیبل تک نہیں پہنچ سکیں گے۔"

"کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ تم اس کی گرفتاری کے لیے قانون کی مدد نہیں کرو گے؟"

"اگر مدد کرنا ہوتی تو اسے آپ کے گھر لے آتا۔ جو میری پناہ میں آجاتا ہے اس پر قانون کے محافظوں کا سایہ بھی نہیں پڑتا۔"

"کیا تم نے یہی بتانے کے لیے فون کیا ہے؟"

"صرف یہی نہیں' ایک مشورہ بھی دے رہا ہوں۔ اس کی گرفتاری کے احمقانہ خیال سے باز آجاؤ اور چوبیس گھنٹے کے اندر پاکستان جا کر اپنی ڈی جی والی کرسی پر بیٹھ جاؤ۔ اس طرح تمہاری بیٹی زندہ سلامت رہے گی۔"

"یہ کیا بکواس کر رہے ہو؟ اس معاملے سے میری بیٹی کا کیا تعلق ہے؟"

"بے چاری بھوکی تھی۔ ہم اسے اسکول سے اٹھا کر لے آئے ہیں۔ عجب بے



حس لڑکی ہے۔ اسے احساس ہی نہیں ہے اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ یہ ہمارے ساتھ مزے سے ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھی کھا رہی ہے۔"

"تم لوگوں کی شامت آگئی ہے۔ میں ابھی معلوم کر لوں گا کہ تم کس فون نمبر سے بول رہے ہو اور یہ فون کس گھر میں ہے؟"

"ہمیں پتا ہے' تم نے اسکاٹ لینڈ یارڈ میں بڑا نام کمایا ہے۔ یہ عام سی' معمولی سی بات ہم بھی جانتے ہیں کہ تم نے ابھی گفتگو کے دوران ایکسچینج والوں کو اور آئی بی ڈپارٹمنٹ کو خفیہ پیغام بھیجا ہوگا مگر افسوس اس فون کا کوئی نمبر ہی نہیں ہے۔ ہم نے ایک فون لائن سے تار منسلک کیا ہے۔ ابھی اس تار کو نکال لیں گے۔ اس سے پہلے تصدیق کر لو کہ تمہاری گونگی بیٹی ہمارے پاس ہے۔"

اس نے ریسیور شہناز کی طرف بڑھا کر اشارے سے سمجھایا کہ وہ اپنی آواز سنائے۔ وہ اپنے منہ سے بے تکی آوازیں نکالنے لگی۔ "ایں.......... آں.......... وا.......... آں.......... واہ واں.......... ماماما.........."

وہ ایسے مضحکہ خیز انداز میں بول رہی تھی کہ تینوں افراد ہنس رہے تھے۔ وہ اسی طرح آواز سنانے کے دوران چمچ سے پلیٹ کو بچکانہ انداز میں ٹھہر ٹھہر کر بجا رہی تھی۔ ایک نے کہا۔ "بوبی! اس سے چمچ چھین لو ورنہ پلیٹ توڑ دے گی۔"

ایک نے چمچ چھین لیا۔ دوسرے نے ریسیور چھین کر کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ "ہمیں یقین ہے' اپنی گونگی بیٹی کو اس کے گونگے انداز سے پہچان گئے ہو گے۔ جو تمہارے لیے مجرم ہے وہ ہماری پارٹی کا بہت اہم کارکن ہے۔ ہم نے اس کے لیے سیاسی پناہ کی درخواست دی ہے۔ جب تک درخواست منظور نہیں ہو گی تب تک تمہاری بیٹی ہماری قید میں رہے گی۔ درخواست منظور ہونے کے بعد تم پاکستان سے واپس آ کر اپنی بیٹی کو لے جا سکو گے۔"

صداقت نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ میں اپنی بیٹی کی سلامتی کے لیے چوبیس گھنٹے کے اندر پاکستان چلا جاؤں گا۔"

"اپنی بیٹی سے اتنا پیار کرتے ہو کہ فوراً ہماری بات مان رہے ہو۔ ویسے کوئی چالاک

نہ دکھانا ورنہ بیٹی کی صورت کبھی نہیں دیکھ سکو گے۔"

اس نے فون بند کر دیا پھر اپنے ساتھی سے کہا۔ "جاؤ فوراً ٹیلی فون لائن سے اس فون کا تار الگ کر دو۔"

اس کا ساتھی باہر چلا گیا۔ لنچ کے بعد ان تینوں میں سے دو افراد باہر چلے گئے' مجرم کو شہناز کے ساتھ بنگلے میں چھوڑ دیا۔ جب تک اسے سیاسی پناہ نہ مل جاتی وہ آزادی سے باہر نہیں جا سکتا تھا۔ انہوں نے شہناز کو قیدی بنائے رکھنے کے لیے بنگلے کو باہر سے لاک کر دیا تھا۔

انہوں نے بڑی احتیاط سے کام لیا تھا۔ صداقت اس مجرم کو کبھی سیاسی پناہ حاصل نہ کرنے دیتا اس لیے اسے لندن چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ مطمئن تھے لیکن جب شام کو واپس آئے تو پتہ چلا کہ صداقت علی اپنی بیٹی کے ساتھ اس مجرم کو بھی وہاں سے لے گیا ہے۔

حکومت پاکستان کی طرف سے اس مجرم کے خلاف جو وارنٹ جاری کیا گیا تھا' اس وارنٹ کو اسکاٹ لینڈ یارڈ کے ذریعے حکومت برطانیہ تک پہنچا دیا گیا تھا۔ وہ کوئی معروف شخصیت کا حامل نہیں تھا۔ منشیات کے اسمگلر کی حیثیت سے حکومت پاکستان کو مطلوب تھا۔ وہ کئی ممالک سے ہو کر اٹلی سے بحری جہاز کے ذریعے لندن کے ساحل تک پہنچا تھا۔ اس نے سی پورٹ کے لاکر میں اپنا سامان چھوڑ دیا تھا۔ جب اس لاکر کو کھلوا کر سامان کی تلاشی لی گئی تو ہیروئن کے بے شمار چھوٹے بڑے پیکٹس برآمد ہوئے۔

جو مجرم اس قدر رازداری سے آیا تھا اور اسمگلر کے بجائے سیاستدان کہلا کر سیاسی پناہ حاصل کرنے والا تھا اس کے خفیہ بنگلے میں صداقت علی پہنچ گیا تھا۔ کئی اخبارات کے رپورٹرز نے اس سے سوالات کیے کہ وہ اتنی آسانی سے اس بنگلے تک کیسے پہنچ گیا؟ اس نے جواب دیا۔ یہ سراغرسانی کا فن ہے۔ مختلف حالات میں مختلف حکمت عملی ہوتی ہے۔ اسے اخبارات میں شائع نہیں کرنا چاہیے ورنہ دوسرے مجرم سراغرسانی کے طریقۂ کار سے واقف ہو جاتے ہیں۔ اس نے اخبارات والوں کو ٹال دیا۔ ویسے دوسرے جاسوس سمجھ رہے تھے کہ اس نے کوئی ایسا خفیہ ذریعہ بنا رکھا ہے جو اسے زیرزمین مجرم تک پہنچاتا



ہے۔

اس مجرم کو پاکستان پہنچا دیا گیا۔ پیر عظمت اللہ شاہ سلطانی نے ہاجرہ سے کہا۔

"تمہارے مجازی خدا نے اس مجرم کو آخر پکڑ ہی لیا۔ یہ خوشی کی بات ہے اور خطرے کی بھی۔ اسلحہ اور منشیات کے سمگلروں کی تعداد زیادہ ہے اور فرض شناس پولیس اور انٹیلی جنس افسران صرف چند ہیں۔ کسی دن صداقت ان کے نرغے میں ایسا آئے گا کہ اس کی لاش بھی نہیں ملے گی۔"

"پلیز ابا حضور! آپ میرے سہاگ کے بارے میں ایسے الفاظ زبان سے نہ نکالیں۔"

"ہم تمہارے سہاگ کی سلامتی چاہتے تھے اسی لیے سفارت خانے میں اس کا تبادلہ کرا دیا تھا مگر اسے کرپشن کے خلاف لڑنے کا جنون ہے اور یہ جنون اسے عمر طبعی سے پہلے مار ڈالے گا۔"

"میں انہیں سمجھاؤں گی۔ اب تو وہ جلد ہی یہاں سے آ جائیں گے۔"

"وہ آ چکا ہے۔ تم آٹھ برس سے انتظار کر رہی ہو' اس سے اتنا بھی نہ ہوا کہ تمہیں اپنی آمد کی اطلاع دے دیتا۔ یہاں آنے کے بعد فون تو کر سکتا تھا۔"

"انہوں نے نہیں کیا تو میں کر لوں گی۔ ان کی وہی آٹھ برس پہلے والی ضد ہے کہ میں خود ان کے پاس جاؤں' وہ مجھے لینے یہاں نہیں آئیں گے۔ پلیز مجھے بتائیں' ان کا دفتر کہاں ہے۔ فون نمبر کیا ہے؟"

"وہ اسلام آباد میں ہے۔ ہم نمبر ملا رہے ہیں' اس سے باتیں کر لو۔"

انہوں نے نمبر ملانے کے بعد بیٹی کو موبائل فون دیا۔ اس نے کان سے لگا کر سنا۔ دوسری طرف گھنٹی کے جواب میں اس کے پی اے نے فون اٹھایا۔

"میں مسز ہاجرہ صداقت بول رہی ہوں' اپنے صاحب سے بات کراؤ۔"

چند سیکنڈ کے بعد ہی صداقت کی آواز سنائی دی۔ "کیا واقعی تم ہاجرہ بول رہی ہو؟"

"جی ہاں۔ آٹھ برس کے بعد آپ کی آواز سن رہی ہوں۔"

"اپنے ابا پیر کو دعائیں دو۔ انہوں نے ہماری خوشگوار زندگی کے آٹھ برس چبا ڈالے۔"

"اب کوئی شکایت نہ کریں۔ میں خود آپ کے پاس آنا چاہتی ہوں۔ مجھے پتہ بتائیں۔ میں پہلی فلائٹ سے چلی آؤں گی۔ میں بیان نہیں کر سکتی کہ بیٹی کو دیکھنے کے لیے کس طرح دل تڑپ رہا ہے۔"

صداقت علی نے اسے پتہ بتا دیا پھر کہا۔ "آنے سے پہلے فون کر دینا۔ میں ایئرپورٹ آؤں گا۔"

برسوں کی جدائی نے ہاجرہ کو جیسے پر لگا دیے تھے۔ وہ پیر عظمت اللہ شاہ سلطانی کی بیٹی تھی۔ بھلا اسے کسی فلائٹ میں جگہ کیسے نہ ملتی۔ اس نے فون پر صداقت کو اطلاع دی کہ وہ شام کو پہنچ رہی ہے۔ وہ بہت خوش تھی' وقت کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔ جہاز کا سفر مختصر ہوتا ہے لیکن اسے یوں لگ رہا تھا جیسے پھر سے آٹھ برس کا طویل فاصلہ طے کر رہی ہو۔ منزل کے قریب پہنچ کر بھی دیر ہو رہی تھی۔ لگیج ہال سے سامان حاصل کرنے کا انتظار تھا۔ جب سامان آیا اور وہ اسے ٹرالی میں رکھ کر باہر آئی تو صداقت علی نظر نہیں آیا۔

اس نے آس پاس دور تک نظریں دوڑائیں۔ یہ دل توڑنے والی بات تھی۔ پاس بلا کر ساتھ چھوڑنے والی بات تھی۔ ایسی صورت میں برداشت کرنے کے باوجود اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ کیوں نہیں آئے؟ ایسی بھی کیا ناراضگی؟ وہ آتے اور گھر لے جا کر چاردیواری کے اندر سزا دے سکتے تھے۔ یوں سرعام کیوں سزا دے رہے ہیں؟

ہاجرہ کے پاس رہائش گاہ کا پتہ تھا۔ اس پتے پر پہنچنے کے لیے اس نے سامان کی ٹرالی بڑھائی پھر ٹھٹک گئی۔ اس نے آنسو بھری آنکھوں سے دیکھا۔ سامنے ایک خوب صورت سی لڑکی خوب صورت سا لباس پہنے کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں ایک بڑا سا پھولوں کا ہار تھا۔ ہاجرہ نے فوراً دوپٹے سے آنکھیں پونچھیں۔ آنسوؤں کے باعث منظر دھندلا گیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ خواب کے دھندلکے میں ایک ننھی سی پری کو دیکھ رہی ہو۔



آنکھیں پونچھنے کے بعد جیسے آئینہ صاف ہو گیا۔ ہاجرہ جیسے اپنے سامنے اپنا عکس دیکھ رہی تھی۔ وہ پھولوں کا ہار ہاتھوں میں بلند کیے اس کے قریب آئی۔ وہ ہار پہنانا چاہتی تھی۔ ہاجرہ اسے ایک ٹک دیکھے جا رہی تھی۔ آہستہ آہستہ اس کے سامنے گھٹنے ٹیک کر اس کے چہرے کو ہی تکتی رہی۔ اس نے ہاجرہ کو پھولوں کا ہار پہنا دیا۔ ننھی سی معصوم سی مسکراہٹ میں بڑی کشش تھی۔ ہاجرہ نے بے اختیار اسے سینے سے لگا کر دبوچ لیا۔

اس نے بیٹی کی صرف تصویر دیکھی تھی۔ تصویر کو سینے سے لگا کر چوما تھا۔ اب بیٹی کو بہ نفس نفیس اپنی دھڑکنوں سے لگا کر چوم رہی تھی اور مسرتوں کے ہجوم میں روئے جا رہی تھی۔

پھر اس نے بیٹی کی پیشانی کو چوم کر کہا۔ "میں نے تمہیں تصویر سے پہچانا ہے مگر تم نے مجھے کس طرح پہچان لیا؟"

بیٹی جواب میں ہاتھ کے اشارے سے کچھ کہنے لگی۔ ہاجرہ کے دل پر ایک گھونسا سا لگا۔ وہ بھول گئی تھی کہ بیٹی گونگی اور بہری ہے۔ اس نے دل برداشتہ ہو کر ایک گہری سانس لی پھر اپنے پرس میں سے بیٹی کی تصویر نکال کر اسے دکھاتے ہوئے اشارے سے کہا۔ "میں نے اس تصویر کے ذریعے تمہیں پہچانا ہے لیکن تم نے مجھے کیسے پہچان لیا؟"

اس نے سوچتی ہوئی نظروں سے ماں کو دیکھا پھر اپنے گلے میں پڑے ہوئے لاکٹ کو کھول کر دکھایا۔ ہاجرہ نے اس لاکٹ میں اپنی تصویر دیکھی تو خوشی سے کھل گئی۔ اپنے شوہر کی محبت کا یہ ثبوت مل گیا کہ اس نے بیٹی کو ماں سے اجنبی بنا کر نہیں رکھا بلکہ اسے لاکٹ کے ذریعے بیٹی کے دل کی دھڑکنوں سے لگائے رکھا ہے۔

اس نے اپنے پرس سے صداقت علی کی تصویر نکال کر دکھاتے ہوئے کہا۔ "یہ تمہارے پاپا کہاں ہیں؟"

شہناز نے باہر کی طرف اشارہ کیا پھر ماں کا ہاتھ پکڑ کر ادھر چلنے کا اشارہ کیا۔ وہ فرش سے اٹھ کر بیٹی اور سامان کی ٹرالی کے ساتھ چلتی ہوئی باہر آئی۔ صداقت علی اپنی کار کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ ہاجرہ اسے دیکھ کر رک گئی۔ دوپٹے سے منہ چھپا کر رونے لگی۔ صداقت نے آگے بڑھ کر اس کے دونوں شانوں کو تھام لیا پھر کہا۔ "خوشی رلاتی ہے مگر

ایسے نہیں، آنسو پونچھ لو، ورنہ لوگ کیا سوچیں گے۔"

اس نے آنسوؤں کو پونچھا پھر اپنے گلے سے پھولوں کا ہار اتار کر صداقت کے گلے میں پہنا دیا۔ دونوں مسکرائے پھر بیٹی کے ساتھ کار میں آ کر بیٹھ گئے۔ صداقت نے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھاتے ہوئے کن انکھیوں سے ہاجرہ کو دیکھا۔ وہ بیٹی کو ایک بازو کے حصار میں لیے مجازی خدا کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کیسی ہو؟"

وہ بولی۔ "کسی کے انتظار میں جینے والی جیسی ہوتی ہے ویسی ہی ہوں۔"

"میں نے بھی انتظار کے آٹھ برسوں میں یہی سمجھا ہے کہ صرف کھانے پینے اور سانس لیتے رہنے کا نام زندگی نہیں ہے۔ زندگی میں سانس بھی ہوں، آہیں بھی ہوں، جدائی بھی ہو، وصال بھی ہو۔ ایک طویل جدائی کے بعد یوں لگ رہا ہے کہ ہم پھر سے جوان ہو گئے ہیں۔"

"آپ کچھ تو خیال کریں۔ بیٹی ہمارے درمیان ہے۔"

"درمیان دیوار ہوتی ہے اور دیوار کے کان نہیں ہوتے۔"

ہاجرہ نے گہرے رنج و غم سے بیٹی کو دیکھا پھر کہا۔ "ایک بات پوچھوں؟"

"خوشی کے موقع پر دکھ دینے والی بات ہو تو نہ پوچھو۔"

"تو پھر نماز پڑھوں گی اور خدا سے پوچھوں گی کہ اس نے میری بیٹی کو سننے اور بولنے سے کیوں محروم کیا ہے؟"

"خدا سے پوچھنے کے بعد اپنے ابا حضور سے بھی پوچھ لینا۔"

"ان سے کیوں پوچھوں؟ انہوں نے ابھی تک شہناز کو دیکھا بھی نہیں ہے۔"

"مگر فون پر چار ماہ کی بچی کے رونے کی آوازیں سنی تھیں اور جھنجلا کر کہا تھا کہ میں اسے سندور کھلا دوں تاکہ اس کی آواز بند ہو جائے۔ وہ پیر صاحب ہیں، بڑے پہنچے ہوئے ہیں آخر ان کی بددعا لگ ہی گئی۔"

"آپ دونوں ایک دوسرے کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ وہ بھی آپ کو الزام دے رہے تھے کہ آپ نے کسی مجرمانہ ذہنیت رکھنے والے ڈاکٹر کے ذریعے اسے سننے اور بولنے



کی قوت سے محروم کر دیا ہے۔"

"تم دو پاٹن کے بیچ پس رہی ہو۔ خدا نے تمہیں عقل دی ہے لیکن بچپن سے باپ کے ساتھ اتنا گہرا لگاؤ ہے کہ تم عقل سے کام لینے کے قابل نہیں رہتیں۔ ان آٹھ برسوں کے بعد تمہاری کھوئی ہوئی ہر چیز مل گئی۔ شوہر بھی مل گیا اور بیٹی بھی لیکن میں نقصان میں رہا۔"

"وہ کیسے؟"

"ایسے کہ تم مزید آٹھ برس تک باپ کے قریب رہیں اور مجھ سے دور۔ حیوان ہو یا انسان وہ قربت سے مانوس ہوتا ہے اور دوری سے بدظن۔"

"آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ میں آپ سے کسی معاملے میں بدظن نہیں ہوں۔"

"مجھے یقین ہے کہ تم نہیں ہو مگر ہو۔ مریضہ نہیں جانتی کہ پیر صاحب کون کون سے تعویذ گھول کر پلاتے رہتے ہیں۔"

"صداقت! میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں کہ ابا حضور آپ کی لاعلمی میں کیسے کیسے ذرائع اختیار کر کے آپ کی حفاظت کرتے رہتے ہیں۔ وہ کبھی نہیں چاہتے کہ آپ پولیس یا انٹیلی جنس ڈپارٹمنٹ میں رہیں اس لیے انہوں نے بڑی رازداری سے آپ کا تبادلہ سفارت خانے میں کرا دیا تھا۔ اگر آپ لندن نہ جاتے تو مخالفین آپ کو زندہ نہ چھوڑتے۔"

"ہاجرہ! ایک ڈپارٹمنٹ کے افسر کا تبادلہ دوسرے ڈپارٹمنٹ میں اس لیے ہوتا ہے یا اسے ملک سے باہر اس لیے بھیج دیا جاتا ہے کہ وہ اپنا ایمان نہیں بیچنا چاہتا۔ ہو سکتا ہے تمہارے ابا حضور نے تمہارا سہاگ سلامت رکھنے کے لیے درپردہ میری حفاظت کی ہو۔ ویسے یہ تم نے بھی دیکھا ہے کہ وہ مجھے کبھی خرید نہ سکے۔ مجھ سے پیچھا چھڑانے کا ان کے پاس یہی ایک راستہ تھا کہ مجھے ملک سے باہر بھیج دیتے۔"

"آپ ایسے نادان تو نہیں ہیں کہ وہ بھیجتے اور آپ چلے جاتے۔"

"اس وقت میری نادانی تمہارے سامنے ہے۔ پہلے میں ایک جونیئر افسر تھا، اب ڈائریکٹر جنرل بن کر آیا ہوں۔ تمہارے ابا حضور نے اپنی چال چلی اور میں اپنی چال دکھا رہا

ہوں۔"

"ہم اتنے دنوں بعد مل رہے ہیں۔ ہمیں پیار و محبت کی باتیں کرنی چاہئیں مگر آپ گفتگو شروع کرتے ہی ابا حضور کے خلاف بولنے لگتے ہیں۔"

"اور تم حمایت میں بولنے لگتی ہو۔ ذرا غور کرو۔ اتنی دیر سے تم نے میرے حق میں ایک بات بھی کی ہے؟"

وہ جواباً کہہ سکتی تھی کہ وہ سچا اور کھرا ہے۔ اس کے حق میں بولنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ اس کے برعکس باپ ایک کھوٹا سکہ ہے جسے چمکانے کے لیے بیٹی محبت اور جذبوں کی پالش چڑھاتی ہے۔

محبت سے بھرپور رشتے بہت مجبور کرتے ہیں۔ باپ' بھائی اور شوہر میں لاکھ برائیاں ہوں' عورت ان پر پردہ ڈالتی رہتی ہے۔ ان کے ہر عیب کو خوبی میں بدلنے کی کوششیں کرتی رہتی ہے۔ صداقت علی اب اپنی بیٹی شہناز کے حوالے سے سمجھ سکتا تھا کہ ہاجرہ اپنے باپ کے لیے کتنی گہری اور مستحکم محبت رکھتی ہے۔ شہناز تو آٹھ برس کی عمر میں اتنی ذہین اور حساس تھی کہ اس نے باپ کی محض شفقت کو نہیں بلکہ مامتا کو بھی اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ باپ نے ہی اس کی پرورش چار ماہ کی عمر سے کی تھی' ماں کی طرح اسے نہلاتا دھلاتا اور صاف ستھرا رکھتا تھا۔ اس کی بیماری میں تمام رات اس کے سرہانے بیٹھ کر جاگتا تھا۔ باپ سے متاثر ہونے اور محبت کرنے کی انتہا یہ تھی کہ حشر کے دن اس گونگی سے کہا جاتا کہ جنت میں جاؤ تو وہ سیدھی باپ کی آغوش میں چلی آتی۔

★============★============★

صداقت علی اپنے دفتری کمرے میں انٹیلی جنس کے افسر اور دو اہم ماتحتوں سے ایک کیس کے سلسلے میں تفصیلات معلوم کر رہا تھا۔ افسر کہہ رہا تھا۔ "ہم نے اب تک یہ اندازہ لگایا ہے کہ ہمارے ملک میں دو خفیہ ایجنسیاں کام کر رہی ہیں۔ آپ اور ہم جانتے ہیں کہ کتنے بااثر افراد ان ایجنسیوں کی پشت پناہی اور سرپرستی کرتے رہتے ہیں۔ ہم ان کے کارندوں کو تو گرفتار کر لیتے ہیں لیکن ان بڑے لوگوں کے خلاف کسی ثبوت کے بغیر زبان تک نہیں کھول سکتے۔ اگر کسی طرح ثبوت حاصل ہو جائے تو وہ اپنے وسیع ذرائع



سے ان ثبوتوں کو ضائع کر دیتے ہیں۔"

صداقت نے کہا۔ "بے شک مجرموں کی سرپرستی کرنے والے بیشتر اہم اور بڑے لوگ ہماری نظروں میں ہیں۔ ان میں میرے سسر پیر عظمت اللہ شاہ سلطانی بھی ہیں۔ یہ خفیہ ایجنسیوں کے سربراہ بڑے محتاط رہتے ہیں' تمام اہم اور حساس معاملات میں الگ رہتے ہوئے بھی ان معاملات کی جڑوں میں گھسے رہتے ہیں۔"

ایک افسر نے کہا۔ "سر! یہی وجہ ہے کہ ہم ان ایجنسیوں کے طفیلی مجرموں کو پکڑتے ہیں۔ یوں جرائم کم نہیں ہوتے۔ گرفتار ہونے والوں کی جگہ دوسرے کارندے چلے آتے ہیں۔"

صداقت علی نے کہا۔ "جب تک ہم بڑے مگرمچھوں کو پوری طرح شکنجے میں نہ لے سکیں تب تک یہ طریقہ کار رہے کہ ہم ان تخریب کاروں' دہشت گردوں اور اسمگلروں کے منصوبوں کو ناکام بناتے رہیں۔ یوں ہم اصل مجرموں تک پہنچنے میں ناکامی ہونے کے باوجود ان کی ملک دشمنی کو ناکام بناتے رہیں گے اور دیگر جرائم میں خاصی کمی کرتے رہیں گے۔"

انٹرکام نے مخاطب کیا۔ صداقت نے بٹن دبا کر پوچھا۔ "یس؟"

پی اے کی آواز آئی۔ "سر! جناب پیر عظمت اللہ شاہ سلطانی کا فون ہے۔ میں نے سرخ فون پر لائن دی ہے۔"

صداقت نے انٹرکام کا بٹن آف کر کے اپنے ماتحتوں سے کہا۔ "آپ لوگوں نے سنا؟ شیطان اتنا مشہور نہیں ہوگا جتنا کہ یہ پیر صاحب ہیں۔ ہمارے پی اے نے انہیں سرخ فون پر لائن دی ہے اور خطرے کا نشان سرخ ہوتا ہے۔"

افسر نے پوچھا۔ "سر! ہم جائیں؟"

"کیا آپ اس لیے جائیں گے کہ میرے سسر سے فون پر بات ہوگی۔ نہیں' یہ دفتر ہے' یہاں میرا کسی سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔"

اس نے سرخ رنگ کے فون کا ریسیور اٹھایا لیکن اسے اپنے سے دور رکھا اور ماتحتوں سے کہا۔ "انسانی تاریخ ہمارے سامنے ہے۔ جب اس دنیا میں انسانوں نے جرائم

کی ابتداء کی تب سے ہم قانون کے محافظ مجرموں کو جرائم سے باز رکھنے کی کوشش کرتے آ رہے ہیں۔ جو باز نہیں آتے وہ کتے کی موت مرتے ہیں اور جو پیرو مرشد اور خدا بن کر قانون سے بالاتر ہونا چاہتے ہیں وہ فرعون اور شداد کی طرح حرام موت مارے جاتے ہیں۔ میں آپ حضرات سے معذرت چاہتا ہوں۔ فون پر گفتگو کرنے کے بعد ہماری یہ میٹنگ جاری رہے گی۔"

پھر اس نے کان سے ریسیور لگا کر کہا۔ "ہیلو! میں صداقت علی بول رہا ہوں۔ آپ فرمائیں؟"

"ہمارے فرمانے سے پہلے تم خوب بول رہے تھے۔ میٹنگ کے حاضرین سے بھی مخاطب تھے اور فرعون جیسے پیرو مرشد کو بھی وارننگ دے رہے تھے۔"

وہ بولا۔ "جو فرعون ہوتے ہیں وہ وارننگ کو خاطر میں نہیں لاتے۔ جو بو رہے ہیں، غیر شعوری طور پر اسے کاٹنے کے منتظر رہتے ہیں۔ بائی دی وے، آپ نے اچانک مجھے کیسے یاد کیا ہے؟"

"تم ایک ماہ سے اسلام آباد میں ہو۔ ہمارے درمیان اختلافات سہی لیکن ہم تمہارے بزرگ ہیں۔ ہمارے گھر نہ آتے فون پر سلام تو کر سکتے تھے۔"

"السلام علیکم کے معنی ہیں تم پر (اللہ تعالیٰ کی طرف سے) سلامتی ہو۔ میں یہاں ایک ماہ سے اتنا مصروف ہوں کہ کسی عالم دین سے رجوع نہ کر سکا ورنہ یہ مسئلہ پوچھتا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ پر سلامتی بھیجنا چاہیے یا نہیں؟"

دوسری طرف سے ایک ذرا خاموشی رہی پھر ان کا قہقہہ سنائی دیا۔ انہوں نے کہا۔ "بڑا مزہ آتا ہے، جب کوئی سیر پر سوا سیر ہوتا ہے اور ہمیں سوا دو سیر بننے پر مجبور کر دیتا ہے۔ ہم نے ایک بار اپنی بیٹی سے کہا تھا کہ وہ ہمارے خاندان میں بڑے ہی جوڑ توڑ والا داماد لائی ہے۔ بہرحال ہم بیٹی اور نواسی سے ملنے آئے ہیں۔ اسلام آباد تو آتے جاتے رہتے ہیں، اس بار سوچا کہ پورا ایک دن ان کے ساتھ گزاریں۔ کیا انہیں ہماری کوٹھی میں آنے کی اجازت دو گے؟"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ آپ جتنے دن چاہیں ان کے ساتھ گزار سکتے ہیں۔



میں ابھی انہیں فون پر کہہ دوں گا۔"

اس نے سرخ ریسیور کو کریڈل پر رکھ دیا۔ اس کے ماتحت افسر نے مسکرا کر پوچھا۔

"سر! کیا آپ دونوں کے درمیان ایسی ہی کھری کھری باتیں ہوا کرتی ہیں؟"

"ہاں۔ انہیں یہ غصہ ہے کہ مجھے خرید نہیں سکتے۔ مجھے یہ ملال ہے کہ میں شاید کبھی نہیں گرفت میں نہیں لے سکوں گا۔ وہ بہت بڑی ایجنسی کے گاڈ فادر ہیں۔ جب ہماری گرفت مضبوط ہوتی ہے تو خفیہ ذرائع انہیں تمام الزامات سے مکھن کے بال کی طرح نکال لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم ایک دوسرے کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے ہیں تو ہماری زبانیں تلخ کلامی پر مجبور ہو جاتی ہیں۔"

ایک ماتحت نے کہا۔ "سر! آپس میں خواہ کتنی ہی کشیدگی ہو لیکن گہری رشتے داری بھی ہے۔ ایک دوسرے کے لیے آپ لوگ کچھ تو نرم گوشہ رکھتے ہوں گے۔"

"ہم سب کے اندر کسی حال میں بھی کسی بھی خطاکار کے لیے کوئی نرم گوشہ نہیں ہونا چاہیے۔ البتہ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ رشتوں کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ میں اپنی شریک حیات کو بہت چاہتا ہوں۔ اس رشتے اور چاہت کا لحاظ کرتے ہوئے اس کے والد یعنی اپنے سسر کی رسمی طور پر عزت کرتا ہوں اور ہم جس شعبے سے تعلق رکھتے ہیں یہاں رسمیں نہیں نباہی جاتیں، فرائض ادا کیے جاتے ہیں۔"

صداقت نے موبائل فون کے نمبر ڈائل کیے پھر ماتحتوں سے کہا۔ "پلیز، ایک منٹ انتظار کریں۔"

اس نے رابطہ قائم ہونے پر کہا۔ "ہیلو ہاجرہ! تمہارے ابا حضور یہاں اسلام آباد میں ہیں۔"

وہ خوش ہو کر بولی۔ "کیا واقعی؟ وہ کب آئے؟ کیا میں ان سے ملاقات کرنے جاؤں؟"

"ہاں۔ وہ اپنی نواسی سے بھی ملنا چاہتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ وقت بھی گزارنا چاہتے ہیں۔ تم بیٹی کو لے جاؤ اور جتنے دن چاہو ان کے ساتھ رہو۔"

"کیا آپ ہمارے ساتھ نہیں جائیں گے؟"

"میرے جانے سے کیا ہوگا جانتی ہو؟ حضرت سلیمانؑ کے دربار میں چند کھیاں آئیں اور انہوں نے شکایت کی کہ ہوا ہم سے خواہ مخواہ دشمنی کرتی ہے۔ ہم جہاں جاتے ہیں' وہاں آکر ہمیں اڑا دیتی ہے۔ خدارا انصاف کریں اور ہوا کو ایسی زیادتی سے باز رکھیں۔ حضرت سلیمانؑ نے ہوا کو دربار میں حاضر ہونے کا حکم دیا۔ حکم کی تعمیل ہوئی اور ہوا کا ایک جھونکا دربار میں آیا۔ اس کے آتے ہی تمام کھیاں اڑ گئیں۔ بہتر ہے ہاجرہ! مجھے ساتھ چلنے کو نہ کہو۔ شہناز کو لے جاؤ۔"

اس نے موبائل فون بند کر دیا۔ افسر نے کہا۔ "سر! آپ کی زندہ دلی بھی خوب ہے۔ آپ نے وائف کو ایک لطیفہ بھی سنا دیا اور حقیقت بھی بیان کر دی۔"

"خوش گوار ازدواجی زندگی گزارنے کے لیے بیوی کو خوش رکھنا پڑتا ہے اس لیے میں مزاحیہ انداز اختیار کرتا ہوں۔"

پی اے نے انٹرکام کے ذریعے کہا۔ "سر! سردار حاکم نواز خان آپ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ یہ پچھلے چار ہفتوں میں چار بار آ چکے ہیں۔ میں کیا جواب دوں؟"

"ابھی بتاتا ہوں۔"

اس نے انٹرکام بند کر کے اپنے ماتحتوں کی طرف دیکھا۔ ایک ماتحت نے کہا۔ "سر! یہ دوسری خفیہ ایجنسی کا گاڈ فادر ہے۔ آپ اسے ٹال رہے ہیں۔ کیا ملاقات نہ کرنے میں کوئی مصلحت ہے؟"

افسر نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ سر ایسے گاڈ فادر کہلانے والوں کو ملاقات کے لیے دوڑاتے ہیں اور ان کی اوقعات انہیں بتاتے ہیں اور شاید اس لیے اپنے سسر صاحب سے بھی نہیں ملتے۔"

صداقت نے کہا۔ "قانون کی برتری قائم رکھنے کے لیے لازمی ہے کہ قانون کو ہاتھ میں لینے والوں کو اپنی انگلیوں پر اسی طرح نچایا جائے۔ ویسے آج اس گاڈ فادر سے ملاقات کر لی جائے' کیا خیال ہے؟"

"جی ہاں جناب! دیکھ لیتے ہیں کہ یہ سردار حاکم نواز خان چار ہفتوں سے کیوں دوڑ رہا ہے۔"



اس نے انٹرکام کے ذریعے کہا۔ "سردار حاکم نواز خان کو پرائیویٹ میٹنگ روم میں بھیج دو اور ٹی وی کیمرے آن کر دو۔"

حکم کی تعمیل ہونے لگی۔ صداقت علی کے سامنے ایک دیوار کے ساتھ بڑی اسکرین کا ٹی وی تھا۔ افسر اور دوسرے ماتحت اپنی کرسیاں ٹی وی کی طرف گھما کر بیٹھ گئے۔ اس کی اسکرین آن ہو گئی۔ ایک ادھیڑ عمر کا شخص شلوار قمیض اور ویسٹ کوٹ پہنے سر پر بڑی سی پگڑی رکھے' واکنگ سٹک ٹیکتا ہوا ایک میٹنگ روم میں آیا اور ایک صوفے پر بیٹھ گیا پھر اس نے چونک کر دیکھا۔ وہاں بھی ایک بڑی اسکرین کا ٹی وی آن تھا اور اسے صداقت علی نظر آ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "میں ڈائریکٹر جنرل صداقت علی ہوں جس طرح تم مجھے دیکھ رہے ہو اسی طرح میں تمہیں دیکھ رہا ہوں۔ اپنا مدعا بیان کرو۔"

اس نے کہا۔ "یوں تو آپ کو پیر صاحب کے داماد کی حیثیت سے جانتا ہوں پھر سنا کہ آپ لندن میں کام کرنے کے نئے طریقے سیکھ کر آئے ہیں۔ یہی دیکھیں کہ پہلے تو آپ نے چار ہفتوں سے ملاقات نہیں کی اور اب جو ملاقات ہو رہی ہے تو ٹی وی اسکرین پر۔ ہم سامنے ہوتے ہوئے بھی سامنے نہیں ہیں۔"

"میں وقت ضائع نہیں کرتا۔ اگر تم نے فوراً اس ملاقات کا مقصد نہ بتایا تو یہ سکرین آف ہو جائے گی۔"

"ایسی بھی کیا جلدی ہے' جب چار ہفتوں تک میں لاہور سے اسلام آباد آتا جاتا رہا اور آپ ملاقات سے انکار کرتے رہے تو پھر مجھے یہاں کے بڑے حکیم صاحب سے یہ نسخہ لکھوا کر لانا پڑا۔"

اس نے جیب سے ایک لفافہ نکالا۔ اسے کھول کر اس میں سے ایک تہہ کیا ہوا کاغذ نکالا پھر کہا۔ "اگر میں کاغذ کو کھول کر اس کی تحریر کا رخ آپ کی طرف کروں تو اسے پڑھ سکیں گے۔"

"ہاں مگر پڑھنے کی زحمت نہیں کروں گا۔ ابھی ہماری وڈیو فلم تیار ہو رہی ہے۔ تمہاری ہر بات ریکارڈ ہو رہی ہے۔ تھوڑی دیر پہلے تم نے کہا ہے کہ ایک بڑے حکیم صاحب سے نسخہ لکھوا کر لائے ہو۔ جو بیمار ہوتا ہے وہی نسخہ لکھواتا ہے۔ میں دوا ساز

نہیں ہوں۔ دوسروں کے نسخے نہیں پڑھتا۔ فوراً کسی اسپتال یا مطب جاؤ۔ میری دعا ہے کہ تمہاری بیماری کو ہمیشہ کے لیے تم سے نجات مل جائے۔"

یہ کہتے ہی صداقت نے ریموٹ کنٹرولر کا ایک بٹن دبایا۔ ٹی وی اسکرین آف ہو گئی۔ اس کے ماتحت اپنی کرسیاں گھما کر اس کی طرف رخ کر کے بیٹھ گئے۔ افسر نے کہا۔ "سر! وہ ضرور کسی بڑی سیاسی شخصیت کا خط لے کر آیا ہوگا۔"

صداقت نے انٹر کام کے ذریعے پی اے سے کہا۔ "سردار حاکم نواز خان سے جو گفتگو ہوئی ہے اس کا ایک آڈیو کیسٹ تیار رکھو۔ کوئی بڑی سیاسی شخصیت سردار خان کی حمایت میں کچھ بولے تو فون کے ذریعے وہ کیسٹ سنا دینا اور کہہ دینا کہ سردار خان بیمار یا ایب نارمل ہے' کسی حکیم صاحب کا نسخہ لا کر ڈائریکٹر جنرل کا وقت ضائع کرنا چاہتا تھا اس لیے ملاقات جاری نہیں رکھی گئی۔"

اس نے انٹر کام کو آف کر دیا۔ افسر نے کہا۔ "ہم کانٹوں بھری کرسیوں پر بیٹھ کر اپنے فرائض ادا کرتے ہیں۔ کیا آپ کبھی یہ نہیں سوچتے کہ آپ کو وفاق سے ہٹا کر کسی صوبے کے انٹیلی جنس ڈپارٹمنٹ میں بھیج دیا جائے گا۔"

"مجھے یہ اندیشہ نہیں ہے۔ میرا تبادلہ کبھی ہوگا تو اسکاٹ لینڈ یارڈ بھیجا جاؤں گا کیونکہ میں حکومت پاکستان کی طرف سے سپیشل اپائنٹمنٹ پر آیا ہوں۔ آپ لوگوں کے لیے میری نصیحت ہے کہ اپنا تبادلہ ہونے دیں' ترقیاں رک جانے دیں مگر فرائض کی ادائیگی اور ایمان پر حرف نہ آنے دیں۔"

وہ تمام ماتحت سر جھکا کر سوچنے لگے۔ خواہ وہ کتنے ہی بڑے عہدے پر ہوں انہیں بڑی سیاسی شخصیتوں کے دباؤ میں رہنا پڑتا ہے۔ ایسے بہت کم فرض شناس افسران ہوتے ہیں جو اپنی بہترین ملازمت اور بہترین مستقبل کو داؤ پر لگاتے ہیں۔

★===========★===========★

پیر عظمت اللہ شاہ سلطانی اپنی اسلام آباد والی کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ دروازے پر اپنی ہاجرہ بیٹی اور ایک خوبصورت سی لڑکی کو دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔ دونوں نے انہیں سلام کیا۔ ہاجرہ نے کہا۔ "ابا حضور! یہ میری بیٹی اور آپ کی نواسی



شہناز ہے۔"

انہوں نے آگے بڑھ کر نواسی کی پیشانی کو چوما پھر اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "تم نہ بتاتیں' تب بھی ہم اپنی نواسی کو پہچان لیتے۔ تم نے کراچی میں اس کی تصویر دکھائی تھی۔"

ہاجرہ نے شہناز سے کہا۔ "بیٹی! یہ تمہارے نانا ہیں۔ گرینڈ فادر.........."

ہاجرہ نے ایک ملازم سے کہا کہ وہ کاغذ اور قلم لائے پھر اپنے باپ سے بولی۔ "یہ نہ سن.......... سکتی ہے نہ بول.......... سکتی ہے لیکن لندن میں گونگے بہروں کے اسکول میں بڑی حد تک انگریزی حرفوں کو پہچاننا اور فقرے لکھنا سیکھا ہے۔ میں اس سے تحریر کے ذریعے گفتگو کرتی ہوں۔"

ملازم کاغذ کا پیڈ اور قلم لے آیا۔ وہ تینوں سینٹر ٹیبل کے اطراف بیٹھ گئے۔ ہاجرہ نے ایک کاغذ پر لکھا۔ "یو نو مائی چائلڈ' ہی از یور گرینڈ فادر؟" (میری بچی کیا تم جانتی ہو کہ یہ تمہارے نانا ہیں؟)

شہناز نے ماں سے قلم لے کر لکھا۔ "یو مین ٹو سے گرینڈ فادر آن لوزر سائیڈ؟" (کیا آپ کا مطلب ہے کہ ہارنے والے نانا ہیں؟)

پیر عظمت اللہ شاہ سلطانی یہ پڑھتے ہی بھڑک گئے۔ ہاجرہ سے کہا۔ "دیکھو اپنی آنکھوں سے پڑھو' صداقت نے اس بچی کے ذہن میں ہمارے خلاف کیسا زہر بھرا ہے۔ یہ ہمیں ہارنے والا' کچھ کھو دینے والا نانا لکھتی ہے۔"

ہاجرہ نے انگریزی زبان میں لکھا۔ "بیٹی! یہ بری بات ہے' تم اپنے نانا کو لوزر سائیڈ پر رہنے والا لکھ رہی ہو۔ کیا یہ تمہارے پاپا نے سکھایا ہے؟"

شہناز نے انگریزی میں جواب لکھا۔ "نہیں ماما! گرینڈ فادر دو طرح کے ہوتے ہیں۔ جو اپنی بیٹی دیتا ہے وہ ہارنے والا (لوزر) سائیڈ پر ہوتا ہے اور جو دوسرے کی بیٹی لے کر آتا ہے وہ جیتنے والا (گینر) سائیڈ پر ہوتا ہے۔"

بیٹی کی وہ تحریر پڑھ کر ہاجرہ نے کہا۔ "یہ اپنے طور پر درست لکھ رہی ہے۔ انگریزی زبان میں نانا اور دادا کے لیے الگ الفاظ نہیں ہوتے۔ ان میں تفریق کے لیے

ایک کو لوزر (ہارنے والا) اور دوسرے کو گینر (جیتنے والا) کہہ سکتے ہیں۔"

"بکواس مت کرو۔ میکے سے آ کر صرف ایک ماہ میں تم پر بھی صداقت کا رنگ چڑھ گیا ہے۔ یہ بھول گئیں کہ وہ کس طرح باتوں کو گھما پھرا کر بولتا ہے۔ وہ بیٹی کو یہ بھی تو سکھا سکتا تھا کہ میں میٹرنل گرینڈ فادر ہوں۔" (ماں کی طرف سے گرینڈ فادر)

"آپ ناراض نہ ہوں۔ میں شہناز کو یہی سکھاؤں گی لیکن ابا حضور! آپ اور صداقت ذرا ذرا سی بات کو انا کا مسئلہ بنا لیتے ہیں۔ آپ دونوں کو سمجھاتے سمجھاتے میں پاگل سی ہونے لگتی ہوں۔"

"تم اپنے باپ کو کیا سمجھاؤ گی؟ کیا ہمیں پاگل سمجھتی ہو؟"

"میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ میں تو آپ پر فخر کرتی ہوں۔ آپ نے اپنی ذہانت اور حکمت عملی سے جو عزت، شہرت اور دولت حاصل کی ہے وہ کوئی دوسرا حاصل نہیں کر سکتا۔ کوئی شریف ہو یا بدمعاش، قانون داں ہو یا سیاست داں، سب ہی آپ کو سلام کرتے ہیں۔"

بیٹی کی بات سن کر انہیں صداقت کی چبھتی ہوئی بات یاد آئی کہ دین اسلام کے مطابق ان پر سلامتی بھیجنی چاہیے یا نہیں؟

انہوں نے ناگواری سے منہ بنایا پھر نواسی کو دیکھا۔ وہ میز پر جھکی ایک کاغذ پر پھول کا خاکہ کھینچ رہی تھی۔ انہیں نواسی پر بڑا پیار آ رہا تھا۔ آخر ان کی فرمانبردار بیٹی کی بیٹی تھی اور بہت پیاری گڑیا جیسی تھی۔ انہوں نے کہا۔ "یہ بہت ذہین لگتی ہے۔ اسے یہاں گونگے بہروں کے اسکول میں داخل کراؤ اور ہنر بھی سکھاؤ۔"

"یہ یہاں نہیں رہے گی۔ صداقت اسے لندن واپس بھیج دیں گے۔ وہاں یہ ہاسٹل میں رہے گی۔ میں اسے نظروں سے دور نہیں کرنا چاہتی ہوں۔ آج کل صداقت سے اسی بات پر جھگڑا ہو رہا ہے۔ وہ طعنہ دیتے ہیں کہ بیٹی سے بہت زیادہ محبت ہے تو میں اس کے ساتھ لندن جا کر رہوں۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں آپ سے دور نہیں رہتی ہوں۔ مہینے دو مہینے میں آپ سے ملنے کے لیے یہاں سے کراچی ضرور جاتی ہوں۔"

"ہم بھی تم سے ملنے یہاں آیا کرتے ہیں۔ محبت ایسی ہی ہوتی ہے، بیٹی پرائی ہونے



کے بعد بھی اپنی ہی ہوتی ہے مگر صداقت کیسا باپ ہے کہ اس معصوم بچی کو ہزاروں میل دور تنہا چھوڑ دینا چاہتا ہے۔"

"میں ان سے بحث میں کمزور پڑ جاتی ہوں۔ وہ کہتے ہیں کہ جب یہ گونگی وہاں سے تعلیم مکمل کر کے آئے گی تو بولنے اور سننے والوں سے زیادہ قابل ہو گی اور یہاں کی لڑکیوں کے مقابلے میں زیادہ دنیا دیکھ چکی ہو گی۔"

"بیٹی! وہ جس کام کی ضد کرتا ہے اسے ضرور کرتا ہے۔ وہ باپ ہے اپنی بیٹی کے شاندار مستقبل کے بارے میں ٹھوس دلائل دے گا تو ہمیں قائل ہونا پڑے گا۔ بہرحال اس بحث کو چھوڑو۔ کیا تم نے ہمارا کام کر دیا؟"

"جی ہاں مگر کچھ حاصل نہیں ہوا۔ وہ گھر کی تمام الماریوں اور سوٹ کیس وغیرہ کی چابیاں مجھے دے کر جاتے ہیں۔ میں ان سب کو کھول کر دیکھتی رہتی ہوں۔ وہ دفتر کے کاغذات گھر نہیں لاتے ہیں۔ میں نے ان کے سامان میں ایسے کاغذات نہیں دیکھے جو آپ کی مخالف ایجنسی سے تعلق رکھتے ہوں۔"

"جب تک وہ گھر میں رہتا ہے کوئی نہ کوئی اسے فون کرتا رہتا ہو گا۔ تم فون پر ہونے والی باتیں سنتی ہو؟"

"وہ گھر میں کسی کا فون اٹینڈ نہیں کرتے ہیں۔ مجھے اور ملازموں کو بھی تاکید کی ہے کہ دفتری معاملات کے فون آئیں تو کہہ دیا جائے کہ صاحب سے صرف دفتر میں ہی بات ہو سکتی ہے۔"

"کیا وہ خود کسی کو فون نہیں کرتا ہے؟"

"اپنے موبائل فون پر کسی کو مخاطب کرتے ہیں۔ کوڈ ورڈز میں کچھ کہتے ہیں پھر فون بند کر دیتے ہیں۔"

"ہوں۔ بہت سیانا ہے۔ وہ تم پر بھی اعتماد نہیں کرتا ہے۔ تمہیں بیوی مانتا ہے مگر راز دار ماننے کو تیار نہیں ہے۔"

"ابا حضور! وہ مجھے بہت چاہتے ہیں۔ کبھی کبھی میرا دل مجھے ملامت کرتا ہے کہ میں باپ کی خاطر بھیدی بن کر شوہر کی لنکا ڈھا رہی ہوں۔"

"اپنے دل کو سمجھاؤ کہ وہ تمہارا شوہر ہے تو ہمارا داماد بھی ہے۔ ہم اسے نقصان پہنچائیں گے تو تمہیں بھی نقصان پہنچے گا۔ اس کے برعکس تم نے دیکھا ہے ہماری سیکیورٹی کے انتظامات نے کسی دشمن کی گولی کو اس کی طرف آنے نہیں دیا۔ جب بہت زیادہ خطرہ پیدا ہوا تو ہم نے اس کا تبادلہ سفارت خانے میں کرایا اور اسے لندن بھیج دیا۔"

"یہی سب سوچتی ہوں تو آپ پر فخر کرتی ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو میری عمر بھی دے۔ آپ کبھی میرے صداقت کو نقصان نہیں پہنچنے دیں گے۔"

"اس بات کا دکھ ہے کہ وہ ہمارے احسانات کو نہیں سمجھتا ہے لیکن تم ہمارے لیے مخبری کرتی ہو تو سارے دکھ دور ہو جاتے ہیں پھر مخبری بھی اس لیے کرتی ہو کہ ہمیں خفیہ معاملات کا علم رہے گا تو ہم ان معاملات اور حالات کے مطابق تمہارے سہاگ کی حفاظت کرتے رہیں گے۔"

شہناز جس کاغذ پر پھول بنا رہی تھی اسے اٹھا کر ہاجرہ کو دکھایا۔ ہاجرہ نے خوش ہو کر دیکھا۔ پھول کے ساتھ ایک نظم لکھی ہوئی تھی۔ "ڈنگ ڈانگ بیل۔ پوسی ان دی ویل۔"

وہ نظم اختصار میں یوں تھی کہ پوسی (ایک بلی) کنوئیں میں گر پڑی ہے اب اس بلی کو کنوئیں سے کون نکالے گا؟

پیر عظمت اللہ شاہ سلطانی نے پھول کو دیکھا۔ نظم کو پڑھا پھر مسکرا کر کہا۔ "بہت خوب۔ بہت اچھا پھول اسکیچ کیا ہے اور ہماری نواسی کو نظمیں بھی بہت سی یاد ہیں۔ اگر یہ ہمارے پاس رہتی تو پھر ہمارے پاس ایک نہیں' دو ہاجرہ ہو جاتیں۔"

"ابا حضور! یہ میری بیٹی ہے۔ میری طرح آپ سے محبت کرے گی اور آپ کی فرمانبردار بن کر رہے گی۔ میں اس سے ملنے کے لیے لندن جایا کروں گی اور ایسا سبق پڑھایا کروں گی کہ یہ آپ کو اپنے باپ کا دشمن نہیں بلکہ مہربان اور محافظ تسلیم کرے گی۔"

وہ کچھ دیر سوچتے رہے پھر انہوں نے کہا۔ "ہم ایک مقصد کے لیے یہاں آئے ہیں۔ ہمیں اطلاع ملی ہے کہ سردار حاکم نواز خان پچھلے چار ہفتوں سے صداقت کے دفتر



کے چکر لگا رہا ہے۔ تمہارے خبطی شوہر کی کوئی کل سیدھی نہیں ہے۔ سردار خان ایک خطرناک ایجنسی کا گاڈ فادر ہے اور وہ خبطی صداقت کیا اتنا بھی نہیں سمجھتا کہ سردار خان کا دماغ پھرے گا تو اس کے دہشت گرد سرعام اسے گولی مار دیں گے۔"

وہ پریشان ہو کر بولی۔ "یہ تو بہت تشویش کی بات ہے۔ ابا حضور! آپ کچھ کریں۔"

"تم اسے سمجھاؤ کہ وہ سردار خان سے ملاقات کرے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہماری ایجنسی کی کوئی کمزوری سردار خان کو معلوم ہوئی ہے۔ وہ ہم سے براہ راست ٹکرانے کی بجائے ہمارے داماد اور قانون کے ذریعے ہمیں زیر کرنا چاہتا ہے۔"

"میں کبھی نہیں چاہوں گی کہ آپ کو کوئی زیر کرے۔"

"اپنے شوہر کی فکر کرو۔ اسے سمجھاؤ' جو خطرناک قاتل' انسانوں کو کیڑے مکوڑوں کی طرح مار ڈالتے ہیں ان سے بگاڑ پیدا نہ کرے۔ انہیں اشتعال نہ دلائے۔ آخر معلوم تو کرے کہ سردار خان اس سے کیوں ملنا چاہتا ہے؟ مجھے یہ بھی معلوم ہو سکے گا کہ وہ میرے خلاف کون سا حربہ آزمانے آیا ہے۔"

"میں آپ کے ساتھ رہنے آئی تھی مگر شام کو واپس چلی جاؤں گی۔ صداقت کو اس معاملے میں سمجھاؤں گی مگر آپ وعدہ کریں کہ ان پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔"

"تم صداقت سے صرف اتنا معلوم کر لو کہ سردار خان کے مقاصد کیا ہیں پھر ہم اپنی بیٹی کی خوشیوں کی طرف بڑھنے والے ہاتھ کو کاٹ کر پھینک دیں گے۔"

شہناز میز پر جھکی گلاب کا پھول بنا رہی تھی اور پھول کے ساتھ کانٹے ہی کانٹے بناتی جا رہی تھی۔ موبائل فون پر اشارہ موصول ہوا۔ انہوں نے اسے آن کرنے کے بعد کہا۔ "ہیلو! ہم بول رہے ہیں۔"

دوسری طرف سے سردار حاکم نواز خان نے کہا۔ "پیر صاحب! آپ نے کس دشمن کو بیٹی دی ہے؟ سنا ہے کہ وہ آپ سے ملاقات کرنا بھی گوارا نہیں کرتا ہے۔"

"جی ہاں۔ وہ اپنوں اور غیروں دونوں کو ایک ہی ترازو میں تولتا ہے اور برابر تولتا ہے۔ آپ کی گفتگو سے ظاہر ہے کہ اس نے آپ سے ملاقات کرنا بھی گوارا نہیں کیا

ہے۔"

"میں ایک بہت بڑی شخصیت کا سفارشی خط لے کر گیا تھا لیکن اس نے بڑی چالاکی سے مجھے ٹال دیا۔ ابھی پتہ چلا ہے کہ وہ بہت ہی ہائی لیول پر اسکاٹ لینڈ یارڈ سے اسپیشل اپائنٹمنٹ پر آیا ہے۔ وہ یہاں کی کسی بھی بڑی شخصیت کے دباؤ میں نہیں آئے گا۔ آپ جانتے ہیں کہ جو کسی کے دباؤ میں نہیں آتا اور کسی طرح بلیک میل نہیں کیا جا سکتا' اسے ہماری اور آپ کی ایجنسیاں ہمیشہ کے لیے ختم کر دیتی ہیں۔ وہ آپ کا داماد ہے۔ شاید آپ ایسا نہ کریں۔ یہ نیک کام ہماری ہی ایجنسی کرے گی۔"

"ہم پیر صاحب کہلاتے ہیں۔ آپ کو نیک کام کرنے سے نہیں روکیں گے مگر یہ تو فرمائیں کہ آپ پچھلے چار ہفتوں سے اس سے ملاقات، کرنے کے لیے بے چین کیوں رہے؟"

"سوری۔ یہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے۔ آپ کا معاملہ آپ کے لیے ذرا تکلیف دہ ہے۔ آپ کو دل پر پتھر رکھ کر بیٹی سے کہنا ہے کہ وہ اپنی کلائیوں کی چوڑیاں توڑ دے۔ آپ کا داماد کل کا سورج نہیں دیکھے گا۔"

پیر عظمت اللہ شاہ سلطانی نے فون کان سے لگائے کن انکھیوں سے اپنی بیٹی ہاجرہ کو دیکھا پھر کہا۔ "ہاں۔ بیوہ ہونے والی کی چوڑیاں ٹوٹتی ہیں۔ جب آپ نے فیصلہ کر ہی لیا ہے تو چوڑیاں ٹوٹ جائیں گی۔"

انہوں نے فون بند کیا پھر ہاجرہ سے کہا۔ "شہناز کو یہ کوٹھی اندر سے دکھاؤ۔ میں ضروری باتیں کر رہا ہوں۔"

وہ بیٹی کا ہاتھ پکڑ کر اٹھ گئی پھر وہاں سے جانے لگی۔ وہ بیٹی اور نواسی کو جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ جب وہ دوسرے کمرے میں چلی گئیں تو انہوں نے موبائل فون کے ذریعے کسی سے رابطہ کیا پھر کہا۔ "ہیلو! ہم بول رہے ہیں۔"

دوسری طرف سے آواز آئی۔ "یس باس!"

"سردار حاکم نواز خان۔"

"یس سر۔"



"پرل ہوٹل کمرا نمبر چار سو چار۔"

"یس سر!"

"وہاں اپنی بیوی کے ساتھ ہے۔ اس کی چوڑیاں توڑ دو۔"

انہوں نے فون بند کر دیا۔

★==========★==========★

دوسرے دن صداقت علی کو دفتر میں معلوم ہوا کہ سردار حاکم نواز خان کو قتل کر دیا گیا ہے۔ مقتول کے ساتھ ہمیشہ چار مسلح باڈی گارڈز رہا کرتے تھے۔ ان میں سے دو استقبالیہ کے پاس رہتے تھے اور دو باڈی گارڈز سردار خان کے کمرے کے دروازے پر مستعد کھڑے رہتے تھے۔

جب ایک روم سروس کا ملازم شام کی چائے لے کر کمرے کے سامنے آیا تو ایک مسلح گارڈ نے دستک دے کر کہا۔ "باس! روم سروس ہے۔"

"کمرے کے اندر سے سردار حاکم نواز خان نے دروازہ کھولا۔ ٹھیک اسی وقت سامنے والے کمرے کا دروازہ کھلا۔ چار گن مین تڑاتڑ فائرنگ کرتے ہوئے باہر آئے۔ دونوں گارڈز کو سنبھلنے کا موقع نہیں ملا۔ وہ فائرنگ کی زد میں آکر گرے۔ سردار خان زخمی ہوا۔ وہ دروازے کو بند کرنا چاہتا تھا مگر ایک گن مین نے دروازے پر زور کی لات ماری۔ دروازہ پوری طرح کھل گیا۔ سردار خان گولی کھا کر لنگڑاتا ہوا بستر کی طرف جا رہا تھا کہ تکیے کے نیچے سے ریوالور نکال سکے مگر اس سے پہلے کئی گولیاں اس کے جسم میں پیوست ہو گئیں۔ وہ اوندھے منہ فرش پر گر پڑا۔ ابھی تھوڑی سی جان باقی تھی۔ وہ اپنی بیوی کے رونے اور چیخنے کی آواز سن رہا تھا۔ وہ قریب ہی فرش پر گر پڑی تھی۔ سردار خان نے آخری چند سانسوں میں دیکھا۔ بیوی کے دونوں ہاتھ فرش پر پھیلے ہوئے تھے اور دو قاتل اپنے جوتوں سے اس کے ہاتھوں کی چوڑیاں توڑ رہے تھے۔

اس نے فیصلہ سنایا تھا کہ پیر سلطانی شاہ کی بیٹی اپنی چوڑیاں توڑ دے۔ اس کا شوہر کل کا سورج نہیں دیکھے گا۔ سردار خان نے اپنی آخری سانسوں میں اپنی بیوی کی چوڑیاں ٹوٹتے دیکھیں پھر خود اپنی زندگی سے ٹوٹ گیا۔

پیر عظمت اللہ شاہ سلطانی نے صرف اپنی بیٹی کے سہاگ کو سلامت نہیں رکھا تھا بلکہ ان اہم معلومات کو ختم کر دیا تھا جو سردار خان کے ذریعے صداقت علی کو پہنچنے والی تھیں اور صداقت علی نے جان بوجھ کر معلومات حاصل نہیں کی تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ دونوں ایجنسیاں ایک دوسرے کے خلاف کیسے کیسے داؤ پیچ آزماتی رہتی ہیں۔ وہ جانتا تھا کہ دونوں ایجنسیوں کے گاڈ فادر اسلام آباد میں ہیں۔ دونوں سے ملاقات نہ کی جائے۔ انہیں تجسس میں مبتلا رکھ کر ایک دوسرے پر وار کرنے کے مواقع فراہم کیے جائیں۔

بظاہر صداقت علی کی زندگی بھی خطرے میں تھی۔ پیر شاہ سلطانی فوری اقدامات نہ کرتا تو قاتلانہ حملہ صداقت علی پر ہوتا۔ قانون کے محافظوں کو ایسے خطرات سے نمٹنا ہی پڑتا ہے اور وہ خطرات سے کھیلنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتا تھا۔

پھر وقت گزرنے لگا۔ صداقت علی نے اپنے فیصلے کے مطابق شہناز کو لندن بھیج دیا۔ دو سال میں ایک دو بار ہاجرہ کے ساتھ بیٹی سے ملنے جاتا تھا۔ ہاجرہ تنہا بھی جایا کرتی تھی اور بیٹی کو تحریر کے ذریعے اس کے نانا کی خوبیاں بتاتی' ان کے احسانات کا ذکر کرتی رہتی اور نانا کے ساتھ زیادہ سے زیادہ محبت کرنے کا درس دیا کرتی تھی۔

شہناز بارہ برس کے بعد واپس آگئی۔ اسلام آباد میں اپنے باپ کے ساتھ بھی رہی اور اپنی ماں کی طرح مہینے دو مہینے میں نانا سے ملنے کے لیے بھی جاتی رہی۔ ان دنوں ملک میں کرپشن بڑھتی جا رہی تھی۔ سیاستدانوں نے اتنے قرضے لیے تھے کہ ملک کا خزانہ خالی کر دیا تھا۔ مجرموں کی سرپرستی کے بغیر حکمران بن کر رہنا ممکن نہیں رہا تھا۔ بہت سے جاگیرداروں نے ڈاکوؤں کے بڑے بڑے گروہوں کو پال رکھا تھا۔ ایسے ڈاکو ان جاگیرداروں کا ووٹ بنک بڑھانے میں بڑے مددگار ثابت ہوتے تھے۔ جب بھی کوئی نئی حکومت قائم ہوتی تو کرپٹ سیاستدانوں اور افسروں کا محاسبہ کیا جاتا تھا۔ ایسے ہی وقت قرض نادہندگان کی فہرست شائع ہوئی۔ اس فہرست کے تیسرے نمبر پر رئیس ہمدانی کا نام تھا۔ قرضہ لینے والے تمام نادہندگان کے لیے یہ بات تشویش ناک تھی کہ اس کی انکوائری اور قرضے کی وصولی کی ذمہ داری وزیر خزانہ کے ساتھ انٹیلی جنس کے ڈائریکٹر جنرل صداقت علی کو سونپی گئی تھی اور یہ نام ایسا تھا جسے رشوت یا کسی طرح کا لالچ دے کر



انکوائری نہیں روکی جا سکتی تھی۔

انکوائری کے دوران خاص بات یہ معلوم ہوئی کہ رئیس ہمدانی نے پہلے پانچ کروڑ روپے قرض لیے تھے اور اس کی ادائیگی نہیں کی تھی۔ جب حکومت کی طرف سے دباؤ ڈالا گیا تو وہ اپوزیشن کو چھوڑ کر حکمران پارٹی میں آگیا۔ اس طرح فائدہ یہ ہوا کہ اس نے مزید دس کروڑ روپے قرض کے طور پر حاصل کیے اور پچھلے قرض کی ادائیگی کا تقاضہ سرد خانے میں چلا گیا۔

ہمدانی کی طرح کئی ایسی شخصیات تھیں جنہوں نے رشتے داروں کے ناموں پر جعلی کاغذات کے ذریعے بڑے بڑے قرضے حاصل کیے تھے۔ اس دھاندلی میں سابقہ حکمران اور بینکار وغیرہ بھی شامل تھے۔ وہ سب اتنے بڑے بڑے مگرمچھ تھے کہ پاکستانی خزانے کا سارا سمندر پی گئے تھے۔ کسی کی جرأت نہیں ہوتی تھی کہ ان کے سامنے قرض کی ادائیگی کے بارے میں کچھ کہہ سکے کیونکہ وہ لوگ ہر آتی جاتی حکومت میں اپنا اثر و رسوخ رکھتے تھے۔ جس حکومت میں وہ نہ ہوتے تو ان کی اولاد یا رشتے دار ضرور ہوتے۔ اس طرح ان کے خلاف کبھی کارروائی نہیں کی جاتی تھی۔

اقوام متحدہ' انٹرپول' اسکاٹ لینڈ یارڈ اور عالمی سطح کی کرائم برانچوں میں بڑے بڑے جرائم کے حوالے سے مجرموں کے ریکارڈ محفوظ رکھے جاتے ہیں۔ پاکستان کی بڑی اونچی شخصیات میں ڈرگ مافیا کے ملک' سردار اور بدنام زمانہ تخریب کاروں کو پناہ دینے والے سیاستدان بھی تھے۔ انہیں یہ اندیشہ تھا کہ انہوں نے اگر اپنے ملک میں اپنے خلاف کارروائیوں کو روک بھی لیا تب بھی ان کے مختلف جرائم کے ریکارڈ صداقت علی کے ذریعے بین الاقوامی سطح پر کسی کرائم برانچ میں چلے جائیں گے۔

پیر عظمت اللہ شاہ سلطانی جیسے گاڈ فادر جانتے تھے کہ ڈائریکٹر جنرل صداقت علی کی مکمل اور ٹھوس انکوائری کے باوجود رئیس ہمدانی جیسے قرض نادہندگان کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ ہمدانی جیسے جتنے باثر افراد ان سے لین دین کریں گے اور منہ مانگی رقم ادا کریں گے' ان میں سے کسی کی فائل نہ عدالت تک پہنچ سکے گی اور نہ ہی ان کے سیاسی جرائم کے ریکارڈ صداقت کے ذریعے ملک سے باہر جا سکیں گے۔

ان نادہندگان نے صداقت علی سے بھی رابطے کیے۔ صداقت نے جواب دیا۔
"مجھے اپنے ملک کا وقار اور نیک نامی عزیز ہے۔ پاکستان ہمارا ایک گھر ہے اور میں گھر کی بات باہر نہیں لے جاؤں گا۔ آپ حضرات اگر ہزار کرپشن کے بعد بھی پاکستان کے لیے دل میں ذرا سی بھی محبت رکھتے ہیں تو یک مشت نہ سہی قسطوں میں قرض ادا کر دیں' اپنے ملک کو بھکاری اور محتاج نہ بنائیں۔"

جو کرپٹ ہوتے ہیں وہ حب الوطنی کی باتیں سمجھ نہیں پاتے۔ جب اختیارات سے خالی اور بے بس ہوتے ہیں تو خفیہ ایجنسیوں کے تعاون سے اپنا سیاسی کیریئر بحال رکھتے ہیں۔ ایسے وقت پیر عظمت اللہ شاہ سلطانی کی چاندی ہو رہی تھی۔ انہوں نے اپنے پاس آنے والے نادہندگان سے کروڑوں روپے وصول کیے تھے اور انہیں یقین دلایا تھا کہ ان کے معاملات کو عدالت تک پہنچنے نہیں دیں گے۔

شہناز لندن سے آنے کے بعد اپنے نانا کے پاس رہ گئی تھی۔ صداقت علی دن رات مصروف رہتا تھا۔ اس لیے بیٹی کی خواہش کے مطابق اسے نانا کے ساتھ رہنے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ ہاجرہ اسلام آباد میں تھی۔ وہ ہر ماہ ایک دن کے لیے بیٹی کو باپ سے ملانے کے لے آتی تھی۔

انہی دنوں جب ہاجرہ بیٹی کو نانا کے پاس کراچی چھوڑ کر اسلام آباد جانے والی تھی تو ائیرپورٹ کے راستے میں اسے کسی نے اغوا کر لیا تھا۔ صداقت کو یہ بات ٹیلی فون کے ذریعے معلوم ہوئی۔ بڑی مدت کے سسر نے داماد سے غصے میں کہا۔ "یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔ تمہاری ہٹ دھرمی نے دشمنوں کو موقع دیا ہے کہ وہ تمہیں کمزور بنانے کے لیے تمہارے گھر کی عزت کو اٹھا کر لے جائیں۔ کیا وہ صرف تمہاری بیوی ہے؟ کیا تم نہیں جانتے کہ وہ ہماری بیٹی' ہماری آنکھوں کا نور ہے؟"

یہ واقعہ یقیناً شاک پہنچانے والا تھا۔ پیر شاہ سلطانی کا غصے میں گرجنا بھی مناسب تھا۔ وہ ہمیشہ سسر کو ترکی بہ ترکی جواب دیا کرتا تھا۔ اس بار اپنی جان تمنا کے اغوا نے اس کے دل کو دھچکا پہنچایا۔ سسر کے سامنے شرمندگی ہوئی۔ اس نے کہا۔ "آپ غصے پر قابو پائیں۔ گرجنے برسنے سے ہاجرہ واپس نہیں ملے گی۔ میں اپنے ذرائع سے معلوم کروں گا



کہ کس نے مجھے چیلنج کرنے کے لیے اتنا بڑا قدم اٹھایا ہے۔"
"اسے یہاں اغوا کیا گیا ہے۔ تم اسلام آباد میں بیٹھ کر کیا کر لو گے؟ تمہارے عہدے کی ایک دہشت ہے۔ یہاں آؤ گے تو دشمنی کرنے والے خوف زدہ رہیں گے۔"
"ٹھیک ہے۔ میں آ رہا ہوں۔"
"آؤ مگر سرکاری رہائش گاہ میں نہیں رہو گے۔ دشمن ہم سے بھی خوف زدہ رہتے ہیں۔ جب ہم دونوں ایک جگہ رہیں گے تو ان کی نیندیں اُڑ جائیں گی۔"
"آگ اور پانی ایک جگہ نہیں رہ سکتے۔"
"جانتا ہوں کہ سسرال میں قدم رکھنے سے تمہارے پیروں میں چھالے پڑتے ہیں مگر ہماری بیٹی کے لیے تمہیں آنا ہوگا۔ ہماری کوٹھی میں نہ آؤ مگر ہماری انیکسی میں آ کر رہ سکتے ہو۔ وہاں اپنی بیٹی سے ملاقات کر سکتے ہو۔"
بات معقول تھی۔ اگر وہ کراچی میں آ کر سرکاری بنگلے میں رہتا تو اپنی بیٹی شہناز کو نانا کی کوٹھی سے اپنے پاس بلانا دانش مندی نہ ہوتی جن لوگوں نے ہاجرہ کو اغوا کیا تھا وہ گونگی بہری شہناز پر بھی ہاتھ ڈال سکتے تھے لہٰذا وہ حالات سے مجبور ہو کر پیر عظمت اللہ شاہ سلطانی کوٹھی کی انیکسی میں آ گیا۔

★============★============★

صداقت علی نے آنکھیں بند کیں پھر آنکھیں کھولیں تو منظر بدل گیا۔
اس کی گونگی بہری بیٹی شہناز ایک ہینگنگ چیئر پر بیٹھی جھولتے جھولتے سو گئی تھی۔ صداقت علی انیکسی کے کمرے میں ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ بیٹی ہینگنگ چیئر پر جھولتے ہوئے کبھی قریب آ رہی تھی اور کبھی دور جا رہی تھی۔
یہ دوری بہت دل دکھاتی ہے۔ ہاجرہ ایک بہت ہی زیادہ محبت کرنے والی شریک حیات تھی لیکن صداقت ازدواجی زندگی کی ابتدا ہی سے یہ سمجھ رہا تھا کہ وہ اپنے باپ کی شخصیت سے بہت زیادہ متاثر ہے۔ اگر باپ کی صورت دیکھے ایک ماہ سے زیادہ ہو جائے تو وہ بے چین ہو جاتی تھی۔ اپنے ابا حضور سے ہر ماہ ملاقات کرنے ان کے ساتھ دو چار دن رہنے کے لیے ضرور کراچی آتی تھی۔ وہ ایک ایسے جھولے میں تھی جو اسے شوہر کے

قریب لاتا تھا پھر اس سے دور باپ کے پاس لے جاتا تھا۔

اب وہ گونگی بیٹی جسے وہ دل و جان سے چاہتا تھا' وہ بھی باپ کے قریب جاتی تھی پھر نانا کے پاس آ کر رہنے لگتی تھی۔ لندن میں ہاجرہ اس کے قریب رہی تھی۔ شاید اس نے مزاج کے مطابق اسے باپ سے زیادہ نانا کے قریب رہنا اور نانا سے بے انتہا محبت کرنا سکھایا تھا۔

ہاجرہ نے کہا تھا۔ "آپ ہمیشہ خطرات سے دو چار ہوتے ہیں۔ شہناز جوان ہو چکی ہے۔ وہ ابا حضور کے سائے میں زیادہ محفوظ رہے گی۔"

"آج سے بارہ برس پہلے تمہارے ابا حضور نے اپنی مخالف ایجنسی کے گاڈ فادر سردار نواز خان کو قتل کرایا تھا۔ یہ صرف میں جانتا ہوں لیکن ان کے خلاف کوئی ثبوت نہ ہونے کے باعث میں نے کوئی کارروائی نہیں کی۔ فی الحال یہ کہنا چاہتا ہوں کہ انڈر ورلڈ میں تمہارے ابا حضور بھی گاڈ فادر کہلاتے ہیں۔ سردار خان کی طرح وہ بھی کسی دشمن کی گولی کا نشانہ بن سکتے ہیں۔ یہ نہ کہو کہ میری بیٹی ان کے سائے میں محفوظ رہے گی۔ میں نے صرف اپنی بے زبان بیٹی کی خوشی دیکھ کر اسے وہاں چھوڑ دیا ہے۔"

صداقت علی نے ہینگنگ چیئر پر جھولتی ہوئی بیٹی کو دیکھ کر سوچا۔ ہاجرہ جہاں بھی ہو گی' اب یہ سمجھ رہی ہو گی کہ اپنے ابا حضور کے سائے میں رہ کر خود بیٹی محفوظ نہ رہ سکی۔

ہاجرہ کی گمشدگی سے باپ کو خواہ کتنا ہی صدمہ ہوا ہو مگر کروڑوں روپے کا فائدہ پہنچ رہا تھا۔ صداقت کراچی آنے پر مجبور ہو گیا تھا اور اسلام آباد میں اس کے خالی بنگلے سے رئیس ہمدانی کی وہ فائل مل گئی تھی جس کے لیے ہمدانی دو کروڑ روپے ادا کرنے کے لیے راضی ہو گیا تھا۔

بیٹیاں اپنے باپ سے بہت محبت کرتی ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ شوہر سے نہیں کرتیں۔ شوہر کو بھی دل وجان سے چاہتی ہیں۔ صداقت یقین سے سوچ رہا تھا کہ وہ جہاں بھی ہو گی اسے یاد کر رہی ہو گی۔

اسی وقت موبائل فون کی آواز نے اسے خیالات سے چونکا دیا۔ اس نے فون کو اٹھا



کر آپریٹ کیا تو دوسری طرف سے ہاجرہ کی آواز سن کر اچھل پڑا۔ کرسی اٹھ کر بولا۔

"ہاجرہ! میری جان' تم کہاں ہو؟"

"میں کیا بتاؤں' کون سی جگہ ہے۔ یہ ایک ڈیکوریٹڈ کمرہ ہے۔ صرف ایک زیرو بلب روشن ہے۔ ابھی ایک شخص یہ موبائل فون اور ایک لفافہ دے کر گیا ہے۔ وہ شخص مسلح تھا۔ میں کچھ کہتی تو وہ مجھ سے بدتمیزی کر سکتا تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے لفافہ کھولا۔ اس میں ایک میرے نام اور ایک آپ کے نام ٹائپ کیا ہوا خط ہے۔ مجھے لکھا گیا ہے کہ میں اس موبائل فون کے ذریعے آپ سے رابطہ قائم کروں اور آپ کا خط پڑھ کر آپ کو سنا دوں۔ پہلے میں نے اسلام آباد کے کوڈ نمبر پر فون کیا مگر رابطہ نہیں ہوا پھر میرے دل نے کہا کہ آپ مجھے جان سے زیادہ چاہتے ہیں ضرور مجھے ڈھونڈ نکالنے کے لیے کراچی آئے ہوں گے۔ ویسے ابھی آپ کہاں ہیں؟"

"تمہارے ابا حضور کے دولت خانے میں ہوں۔"

وہ خوش ہو کر بولی۔ "کیا؟ یہ میں کیا سن رہی ہوں۔ آپ میرے میکے آئے ہیں۔ شاید بیس برس گزر چکے ہیں۔ آج آپ نے میری خاطر ضد چھوڑ دی۔ میں آپ کی محبت پر جس قدر ناز کروں' کم ہے۔"

"زیادہ خوش نہیں ہونا چاہیے۔ میں نے تمہارے باپ کی کوٹھی میں قدم تک نہیں رکھا ہے۔ صرف انیکسی تک آیا ہوں۔"

"آخر آئے تو ہیں۔ میں یہاں قید ہونے کے بعد بہت گھبرا رہی تھی۔ اب دعا کرتی ہوں کہ میرے اغوا ہونے سے' میری جان پر مصیبتیں آنے سے اگر آپ اور ابا حضور ایک دوسرے کے قریب آ سکتے ہیں تو میں اغوا کیے جانے کی توہین برداشت کر لوں گی۔"

"پلیز ہاجرہ! جذباتی نہ بنو۔ کیا جس کمرے میں ہو وہاں کے دروازے اور کھڑکیاں بند رہتی ہیں؟ کیا تم اس شخص کو دوبارہ پہچان سکتی ہو جو تمہیں موبائل فون اور خط دے گیا ہے؟"

"کھڑکیاں اور دروازے بند رہتے ہیں۔ وہ شخص ماسک پہن کر آیا تھا۔ آپ پہلے یہ خط سن لیں۔"

وہ پڑھنے لگی۔ کسی نے لکھا تھا۔ "ڈائریکٹر جنرل صاحب! آپ کی امانت ہمارے پاس ہے۔ ہم نے اسے نقصان نہیں پہنچایا ہے۔ بڑے آرام سے رکھا ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ یہ عزت و آبرو سے واپس چلی آئے تو آپ ملازمت سے استعفیٰ دے دیں۔ قرض نادہندگان کے سلسلے میں جس حد تک معلومات حاصل کر کے رپورٹ تیار کر چکے ہیں' اسے ضائع کر دیں۔ وہ رپورٹ وزیر خزانہ کے دفتر میں پہنچے گی تو ہم سے چھپی نہیں رہے گی۔ ہمارے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ آپ کا سسر پیر عظمت اللہ شاہ سلطانی بھی ہمارے راستے کا پتھر نہیں بن سکے گا کیونکہ یہ امانت آپ کی بیوی ہے تو اس پیر صاحب کی بیٹی بھی ہے۔ پیر صاحب بھی عزت و آبرو سے بیٹی کی واپسی چاہیں گے۔ آپ سسر اور داماد چاہتے ہیں تو کل شام یا پرسوں صبح کے اخبارات میں یہ خبر شائع ہو جائے کہ آپ نے استعفیٰ دے دیا ہے اور اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ لندن واپس جا رہے ہیں۔ لندن روانگی کے لیے جس طیارے میں سیٹیں بک ہوں گی' اس فلائٹ کی پرواز کے وقت آپ کی بیوی کو ایئرپورٹ پہنچا دیا جائے گا۔ اگر ہمیں آپ کی طرف سے کسی طرح کی چالاکی کا شبہ ہوا تو پہلے آپ بیٹی کے ساتھ لندن جائیں گے' بیوی دوسرے دن وہاں پہنچا دی جائے گی۔"

صداقت علی نے خط سننے کے بعد کہا۔ "تمہیں اغوا کرنے والے نے خود کو ظاہر کر دیا ہے۔"

ہاجرہ نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیا اتنی جلدی آپ اسے پہچان گئے ہیں؟"

"یہ تو بالکل سیدھی سی بات ہے۔ تمہارے ابا حضور کی مخالف ایجنسی کے گاڈ فادر نے تمہیں اغوا کرنے کی کمینگی کی ہے۔ وہ بڑے اثر و رسوخ والا ہے۔ میں کسی ثبوت کے بغیر اس پر اغوا کا الزام نہیں لگا سکوں گا اور اگر جارحانہ کارروائی کروں گا تو وہ تمہاری جان کا دشمن بن جائے گا۔"

"اوہ خدایا! میں آپ کے لیے مصیبت بن گئی ہوں۔"

"جس سے محبت ہوتی ہے وہ مصیبت بن جائے تو اس کی طرف سے ملنے والی مصیبت بھی محبت ہو جاتی ہے۔"

"آپ کی ایسی باتیں سن کر میں ہوا میں اڑنے لگتی ہوں مگر اب ہو گا کیا؟ آپ کیا



کریں گے؟ اگر آپ استعفیٰ دیں گے تو آپ کی برسوں کی محنت' فرض شناسی اور نیک نامی پر حرف آئے گا۔ یہی کہا جائے گا کہ اپنی شریک حیات کی سلامتی کے لیے آپ نے فرائض سے منہ موڑ لیا ہے۔"

"تمہاری گمشدگی نے مجھے تھکا دیا ہے۔ میں فرائض کی ادائیگی کے لیے تمہارے ابا حضور کی مخالفت بھی کرتا رہا ہوں۔ بڑے خطرناک مجرموں سے لڑتا رہا ہوں مگر اس گاڈ فادر نے تمہیں اغوا کر کے میری دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ تمہیں کہاں سے ڈھونڈ نکالوں۔"

"میرا خیال ہے' وہ گاڈ فادر پھر کسی کو یہاں بھیجے گا اور آپ کا جواب معلوم کرے گا۔"

"اس سے کہہ دینا کہ وہ اپنی دی ہوئی مہلت کے مطابق پرسوں صبح کے اخبارات شائع ہونے کا انتظار کرے۔"

"مجھے تو کچھ بتائیں' آپ کیا کرنا چاہتے ہیں؟"

"ابھی تو دشمن کی وارننگ سنی ہے۔ فون بند کرنے کے بعد سوچوں گا۔ تمام حالات پر غور کروں گا۔ تمہارے تحفظ کو پیش نظر رکھ کر ہی کوئی فیصلہ کروں گا۔"

"اگر یہ موبائل فون میرے پاس رہے گا تو میں صبح آپ کو کال کروں گی۔"

رابطہ ختم ہو گیا۔ صداقت اپنے موبائل فون کو دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ اگر ہاجرہ کی واپسی کے لیے یہ شرط لگائی جاتی کہ وہ انکوائری کمیشن سے علیحدہ ہو جائے۔ ایک لمبی چھٹی پر چلا جائے تو وہ یہ شرط مان لیتا کیونکہ انکوائری سے دست بردار ہونے کے بعد بھی در پردہ مجرموں کا محاسبہ کر سکتا تھا لیکن دوسری ایجنسی کا گاڈ فادر پاکستان کی زمین سے اس کے قدم اکھاڑ رہا تھا۔

اس نے سوچتے ہوئے بیٹی کو دیکھا۔ وہ ہینگنگ چیئر پر تھی۔ اس کے پاؤں زمین پر نہیں تھے۔ جب کوئی جھولے پر ہو تو وہ زمین پر نہ ہوتے ہوئے بھی اپنے وطن میں ہوتا ہے۔

ہینگنگ چیئر پر بیٹھی ہوئی خوابیدہ بیٹی نے باپ کو ایک سوچ دی کہ دشمنوں کو زمین

سے قدم اکھاڑنے دو۔ ہم زمین چھوڑ کر بھی اپنے وطن میں رہ کر اپنے قدم اکھاڑ
والوں کے قدم اکھاڑ سکتے ہیں۔ استعفیٰ دینے سے عہدہ اور کرسی جاتی ہے' فرض شا
نہیں جاتی۔

باپ نے بڑی محبت سے دیکھا۔ وہ بے زبان ہو کر بھی زبان والوں سے زیادہ زبا
دے رہی تھی۔ اس نے بیٹی کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ اسے ہولے سے جھنجھوڑا۔ اس
چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ پہلے باپ کو دیکھا پھر سامنے والی کھڑکی کے پار دیکھا۔ با
برآمدے میں مسلح گارڈ کھڑا ہوا تھا۔ صداقت نے بھی ادھر دیکھا' پھر اشارے کی زبان
کہا۔ "رات کے دو بج چکے ہیں۔ کوٹھی میں جا کر آرام سے سو جاؤ۔"

پھر اس نے دیوار گیر گھڑی کی طرف اشارہ کیا۔ شہناز نے ادھر دیکھا' پورے دو
گئے تھے۔ وہ چیئر سے اتر کر صوفے کے پاس آئی۔ وہاں سے اس نے اپنی چادر اٹھائی
اسے شانوں پر ڈالتے ہوئے باپ کے ساتھ کمرے سے باہر برآمدے میں آ گئی۔ وہا
بدستور مسلح گارڈز کھڑے ہوئے تھے۔

برآمدے کے باہر ایک مسلح گارڈ نے ایک کتے کی زنجیر تھام رکھی تھی۔ کتا
دونوں کو دیکھ کر بھونکنے لگا۔ صداقت نے کہا۔ "اسے دور لے جاؤ۔"

گارڈ نے کہا۔ "جناب! آپ پہلی بار آئے ہیں اس لیے یہ اجنبی کو دیکھ کر بھو
رہا ہے۔"

صداقت نے بیٹی کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھ کر اسے رخصت کیا۔ کتا اسے د
کر بھونک رہا تھا۔ وہ بولا۔ "آخر اس کوٹھی کا کتا ہے۔ مجھ پر ضرور بھونکے گا۔ ویسے
گرجنے والا بادل برستا نہیں ہے۔ اس کی زنجیر تمہارے ہاتھوں میں ہے۔ کاٹ نہیں
گا۔ ہم انسان کہلانے والے بھی جب کسی کو کاٹنے میں ناکام رہتے ہیں تو بھونکنے
گالیاں دینے لگتے ہیں۔"

گارڈ نے کہا۔ "جناب! آپ بڑے پتے کی باتیں کرتے ہیں۔"

صداقت نے دور جاتی ہوئی بیٹی کو دیکھ کر کہا۔ "یہ بڑی بدنصیب ہے کہ نہ ب
ہے' نہ سنتی ہے۔ اور بڑی خوش نصیب ہے کہ بھونکنے کے جواب میں بھونکتی نہیں



اور گالیوں کے جواب میں گالیاں نہیں دیتی ہے۔ یہ گالیوں اور غلاظتوں سے بھری ہوئی دنیا میں کتنی آسودگی اور سکون سے رہتی ہے۔"

شہناز نے کوٹھی کے دروازے پر آ کر دور انیکسی میں کھڑے ہوئے باپ کو دیکھا' مسکرائی اور پھر مسلح گارڈ نے دروازہ کھولا تو وہ کوٹھی کے اندر شاہانہ طرز کے بڑے ہال میں آ گئی۔ دروازہ باہر سے بند ہو گیا۔

اس بڑے ہال کا تمام آرائشی سامان نہایت قیمتی اور قابل دید تھا۔ قالین اتنا ملائم اور دبیز تھا کہ چلتے وقت شہناز کے پیر اس میں دھنس رہے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے زینے کے پاس آئی۔ اس کا کمرا اوپری منزل پر تھا۔ وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ جمشید ایک دیوار کے پیچھے سے اسے دیکھ رہا تھا۔

اس نے زینے کے پہلے پائیدان پر قدم رکھا۔ جمشید دیوار کی آڑ سے نکل کر اس کے پیچھے آ گیا۔ وہ بہری تھی' کسی تعاقب کرنے والے کی آہٹ بھی نہیں سن سکتی تھی لیکن جمشید نے کان اور آنکھیں رکھتے ہوئے یہ نہیں دیکھا کہ اس کا چچازاد بھائی منی اپنے کمرے کا دروازہ ذرا سا کھول کر دیکھ رہا تھا اور شرارت سے مسکرا رہا تھا۔

وہ ایک ایک پائیدان پر قدم رکھتے ہوئے اوپری منزل کی طرف جا رہی تھی۔ اس کے پیچھے جمشید زینے پر چڑھتا ہوا کہہ رہا تھا۔ "ہائے کیا خوب چال ہے۔ سنا ہے عورت کی چال سے اس کے چال چلن کا پتہ چلتا ہے اور اس کی زبان سے اس کے مزاج کا پتہ چلتا ہے مگر تم تو پنڈورا باکس ہو۔ اپنی ذات میں بند رہتی ہو۔ تمہیں روز دیکھتا ہوں اور روز صبر کا پیمانہ چھلکتا رہتا ہے۔ آج تو فیصلہ کر لیا ہے کہ بھینس کے آگے بین نہیں بجاؤں گا۔ تمہارا ہاتھ ضرور پکڑوں گا۔ تم زبان سے نہیں' ہاتھ کے اشاروں سے میرے نیک ارادوں کو سمجھو گی۔"

رات کی گہری خاموشی میں وہ اس کے پیچھے بولتا جا رہا تھا۔ وہ بے زبان' آوازیں سننے سے محروم رہنے والی زینے پر چڑھتی ہوئی اوپر پہنچ رہی تھی۔ اوپر ریلنگ کے کارنر پر ایک پیتل کے مٹکے جیسا بڑا گملا رکھا ہوا تھا۔ جمشید ہاتھ بڑھا کر اس کا ہاتھ پکڑنا چاہتا تھا۔ اسی لمحے شہناز اوپری پائیدان پر ذرا ڈگمگا گئی۔ سنبھلنے کے لیے ریلنگ کا سہارا لینا چاہا تو

پیتل کے بڑے گملے سے ٹکرا گئی۔ ٹکراؤ کے نتیجے میں گملا نیچے پائیدان پر آیا پھر وہاں سے "ڈھن' ٹن..... ڈھن..... ٹن" کی پُرشور آوازیں پیدا کرتا ہوا ایک ایک پائیدان سے لڑھکتا ہوا نیچے ہال کے فرش کی طرف جانے لگا۔

ایسے میں چور بوکھلا جاتے ہیں۔ جمشید ایک دم سے گھبرا کر ایک ایک' دو دو پائیدانوں کو پھلانگتا ہوا وہاں سے بھاگنے لگا۔ سنی اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑا ہنس رہا تھا۔ زینے کے اوپری حصے میں کھڑی ہوئی شہناز سوالیہ نظروں سے کبھی ہنسنے والے سنی کو دیکھ رہی تھی اور کبھی ادھر دیکھ رہی تھی جہاں جمشید بھاگتے بھاگتے نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔

برکت شاہ سلطانی اپنی بیگم کے ساتھ سو رہا تھا۔ "ڈھن ٹن' ڈھن ٹن" کی آواز ان کے خوابیدہ دماغوں میں ہتھوڑے کی طرح لگی۔ دونوں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ بیگم نے پریشان ہو کر کہا۔ "یہ آواز تو ہماری کوٹھی کے اندر گونج رہی ہے۔ کیا یہاں کوئی گھس آیا ہے؟"

برکت شاہ سلطانی نے فوراً ہی بستر سے چھلانگ لگائی۔ وہ دوڑتا ہوا سٹور روم میں گیا پھر ایک ہاکی اٹھا لایا۔ بیگم نے جھنجلا کر پوچھا۔ "کیا ورلڈ کپ جیتنے جا رہے ہیں۔ ہماری رائفل کہاں ہے؟"

دوسرے بیڈ روم میں دوسرا بھائی رحمت شاہ سلطانی پلنگ کے پاس رائفل لیے کھڑا تھا اور تھرتھراتے ہوئے ہاتھ سے کارتوس لوڈ کر رہا تھا مگر کارتوس قالین پر گر پڑے تھے۔ بیگم پریشان ہو کر میاں کی بوکھلاہٹ دیکھ رہی تھی پھر بولی۔ "میری بات مانیں۔ پلنگ کے نیچے گھس جائیں۔"

رحمت شاہ نے ایک کارتوس اٹھا کر پتھر مارنے کے انداز میں کہا۔ "ایک ماروں گا تو مر جائے گا۔ آئندہ چوری کرنا بھول جائے گا۔ کیا مجھے بزدل سمجھتی ہو؟"

"آپ گولی چلائیں گے یا پتھر ماریں گے؟ آپ کو خدا کا واسطہ' رائفل رکھ دیں میں سہاگن رہنا چاہتی ہوں۔"

باہر زینے کے اوپری حصے میں پیر عظمت اللہ شاہ سلطانی نے اپنی خواب گاہ کا



دروازہ کھول کر پوچھا۔ "یہ کیسا شور ہے؟"

نیچے ہال میں فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ انہوں نے نیچے دیکھا۔ سنی نے ریسیور اٹھا کر ہیلو کہا پھر دوسری طرف باتیں سننے لگا۔ جمشید اپنی بہن روبی کے ساتھ ایک کمرے سے باہر آیا۔ سنی فون پر کہہ رہا تھا۔ "تشویش کی بات نہیں ہے' یہاں سب خیریت ہے۔"

اس نے ریسیور رکھ کر سر اٹھا کر اوپری منزل میں اپنے دادا پیر عظمت اللہ شاہ سلطانی سے کہا۔ "یہ پہاڑ جیسا گملا گرتا ہوا نیچے آیا ہے' اس کی گونجتی گرجتی آواز باہر تک گئی ہے۔ سیکیورٹی آفیسر ہماری خیریت دریافت کر رہا تھا۔ میں نے اسے مطمئن کر دیا ہے۔"

رحمت شاہ اپنی بیگم کے ساتھ رائفل ہاتھوں میں لیے بیڈ روم سے باہر آیا پھر رائفل سیدھی کرتے ہوئے بولا۔ "کون ہے؟ کہاں ہے؟ میں خون کی ندیاں بہا دوں گا۔"

پیر عظمت اللہ شاہ سلطانی نے کہا۔ "رہنے دو برخوردار! یہاں سب اپنا ہی خون ہے۔"

برکت شاہ ہاتھوں میں ہاکی لیے بیگم کے ساتھ اپنے بیڈ روم سے نکلا۔ باپ نے اسے ناگواری سے دیکھا پھر دور کھڑی ہوئی شہناز سے کہا۔ "تم؟ تمہیں تو کوئی شور سنائی نہیں دیتا' تم کیسے آ گئیں؟ اوہ خدایا! میں بھول جاتا ہوں کہ یہ بہری ہے۔ میری باتیں نہیں سن سکے گی۔"

بیگم برکت نے کہا۔ "یہ پیتل کا گملا اسی گونگی نے گرایا ہو گا۔"

رحمت شاہ سلطانی نے کہا۔ "شاید یہ ابھی اپنے باپ سے مل کر آئی ہے۔ اتنی رات کو ہماری نیند حرام کر رہی ہے۔"

بیگم برکت نے کہا۔ "اس گونگی کو تو یہ بھی نہیں معلوم ہے کہ اس کی ماں کو اغوا کیا گیا ہے۔ یہ اتنی رات کو باہر رہے گی تو دشمن اسے بھی اٹھا کر لے جائیں گے۔"

سنی نے نیچے ہال سے کہا۔ "آنٹی! دشمن گھر میں ہوں تو باہر والے یہ زحمت نہیں کریں گے۔"

پیر عظمت اللہ شاہ سلطانی نے چونک کر نیچے سنی کو دیکھا پھر پوچھا۔ "کیا بکواس کر رہے ہو؟ کیا اپنے ہی گھر سے کوئی اپنی ہی بیٹی یا بہن کو اغوا کرے گا؟"

سنی نے کہا۔ "دادا جان! ہماری دنیا میں طرح طرح کے تماشے ہوتے ہیں۔ جمشید بھائی سے پوچھ لیں' یہ ایسا تماشا دیکھ چکے ہیں۔"

سب لوگوں نے جمشید کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ جمشید گھبرا سا گیا۔ اس نے کھوکھلے پن سے کہا۔ "مم.......... میرا نام کیوں لے رہے ہو۔ میں نے تو کچھ نہیں دیکھا ہے۔ میں تو روبی کے کمرے میں تھا۔"

روبی نے سنی کو ناگواری سے دیکھ کر کہا۔ "میرے بھائی جان کو کیوں گھسیٹ رہے ہو؟ یہ تو میرے کمرے میں تھے' ہم رمی کھیل رہے تھے۔"

سنی نے ہنس کر کہا۔ "روبی! تم ذرا اپ سیٹ ہو گئی ہو' کوئی دوسرا بہانہ کرو۔"

وہ پاؤں پٹخ کر بولی۔ "کیا میں جھوٹ بول رہی ہوں؟"

جمشید نے کمزور سے انداز میں ڈانٹ کر پوچھا۔ "کیا... کیا تم مجھے اس گونگی کے ساتھ بدنام کرنا چاہتے ہو؟"

بیگم برکت نے بیگم رحمت سے کہا۔ "اپنے بیٹے کو سمجھاؤ۔ یہ میرے بیٹے پر کیچڑ اچھال رہا ہے۔"

بیگم رحمت نے اپنے بیٹے سے کہا۔ "سنی! یہ کیا بے ہودگی ہے' تم اپنے جمشید بھائی کو اس گونگی کے ساتھ بدنام کرنا چاہتے ہو؟"

پیر عظمت اللہ شاہ سلطانی نے گرج کر کہا۔ "کیا تم سب نے اتنی دیر سے گونگی گونگی کی رٹ لگا رکھی ہے؟ اس کا نام شہناز ہے۔ یہ ہماری نواسی ہے۔ ہم اسے پیار سے شانی کہتے ہیں' کیا تم لوگ نہیں جانتے ہو؟"

بیگم رحمت نے کہا۔ "جی' جی.... ہاں شانی تو بہت پیارا سا نام ہے۔ یہ آپ کی نواسی ہے۔ ہماری بھی لاڈلی بھانجی ہے مگر.........."

سنی نے بات کاٹ کر کہا۔ "مگر ممی! سچائی چھپ نہیں سکتی' بناوٹ کے اصولوں سے۔ یہ روبی دس بجے میرے پاس آئی۔ ہم دونوں ایک بجے تک رمی کھیلتے رہے پھر



جاتے وقت یہ اپنی تاش کی گڈی میرے پاس چھوڑ گئی۔ پھر یہ جمشید بھائی کے ساتھ رمی کیسے کھیل رہی تھی۔ آپ سب ہمارے بزرگ ہیں۔ ابھی جا کر دیکھ لیں' روبی کے کمرے میں تاش کا ایک پتہ بھی نہیں ہو گا۔"

روبی اور جمشید نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر دونوں نے مجرمانہ انداز میں سر کو جھکا لیا۔ ان کے والدین برکت شاہ سلطانی اور بیگم برکت اپنی اولاد کی غلطی پر پردہ ڈالنے میں ناکام ہو رہے تھے۔ پیر عظمت اللہ شاہ سلطانی نے غصے سے کہا۔ "جمشید! جس طرح تم ہمارے لاڈلے پوتے ہو' اسی طرح شہناز ہماری لاڈلی نواسی ہے۔ تم نے ہماری نواسی کو میلی نظروں سے دیکھنے کی جرأت کیسے کی؟ ابھی کوئی تمہارا جگہ دوسرا ہوتا تو ہم اسے گولی مار دیتے مگر سزا تو تمہیں ملے گی۔ چلو ایک ٹانگ پر کھڑے ہو جاؤ۔"

جمشید نے ہچکچاتے ہوئے سر اٹھا کر اپنی ممی اور ڈیڈی کو دیکھا' دادا نے گرج کر کہا۔ "کیا تم نے نہیں سنا؟ ہم تمہارے باپ کو بھی ایک ٹانگ پر کھڑا رکھ سکتے ہیں۔"

جمشید فوراً ایک ٹانگ اٹھا کر دوسری ٹانگ پر اپنے جسم کا توازن درست کرنے لگا۔ شہناز نے اپنی ہنسی چھپانے کے لیے اپنے منہ پر دونوں ہاتھ رکھ لیے پھر تیزی سے چلتی ہوئی جمشید کے والدین کے درمیان سے گزرتی ہوئی ایک کمرے کا دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔ برکت شاہ اور بیگم برکت اپنی توہین محسوس کر رہے تھے۔

پیر شاہ سلطانی نے روبی سے کہا۔ "تم بھائی کی غلطی پر پردہ ڈالنے کے لیے اپنے دادا کے سامنے جھوٹ بول رہی تھیں۔ بچوں کو سزا نہ دی جائے تو وہ سر پر چڑھ جاتے ہیں۔ تم ایک ہفتے تک بسوں میں کالج جاؤ گی۔ ہمیں یہ رپورٹ نہ ملے کہ تم نے کسی سے لفٹ لی ہے یا رکشہ ٹیکسی میں گئی ہو۔ اپنی کار کی چابی سنی کو دے دو۔"

پھر انہوں نے بڑے بیٹے برکت شاہ کی طرف گھوم کر کہا۔ "اپنے بدنیت اور عیاش بیٹے کو لگام دو۔ آئندہ میری نواسی کو میلی آنکھوں سے دیکھے گا تو بیٹے کی آنکھیں نکال کر باپ کے ہاتھوں پر رکھ دوں گا۔"

وہ غصے سے پلٹ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ بیگم برکت اپنے میاں کو خونخوار نظروں سے دیکھ کر تنتناتی ہوئی اپنے بیڈروم کا دروازہ کھول کر اندر چلی آئی۔ اس کے

پیچھے برکت شاہ' رحمت شاہ اور بیگم رحمت بھی اندر آ گئے۔ بیگم برکت نے پلٹ کر شوہر سے کہا۔ "میرے پیچھے کیا لینے آ رہے ہیں۔ اپنے ہٹلر باپ کے پاس جائیں۔ وہ حکم دیں گے کہ بیوی اور بیٹے کو گولی مار دو تو ہمیں مار ڈالیے گا۔ اپنا کلیجا ٹھنڈا کر لیں۔"

برکت شاہ نے بے بسی سے سر کو جھکا لیا۔ چھوٹے بھائی رحمت شاہ نے کہا۔ "بھابی جان! آپ جانتی ہیں کہ ان کے ہاتھوں میں ہماری کمزوریاں ہیں۔"

بیگم برکت نے کہا۔ "جانتی ہوں۔ آپ دونوں کو بھی اور آپ کے باپ کو بھی۔ توبہ توبہ' پہلا باپ دیکھا ہے جو بیٹوں کو قدموں میں جھکائے رکھنے کے لیے مجبور اور بے بس بنائے رکھتا ہے۔"

بیگم رحمت نے کہا۔ "تعجب ہے' آپ دونوں ایک عرصے سے وہ دستاویزات ڈھونڈ رہے ہیں لیکن ان کا سراغ لگانے میں ناکام ہو رہے ہیں۔"

برکت شاہ نے کہا۔ "اب تو یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ انہوں نے ہماری کمزوریاں اس گھر میں چھپا کر نہیں رکھی ہیں۔ شاید کسی بینک کے لاکر میں ہیں۔ آج اپنے جوان بیٹے کی بے عزتی پر مجھے شدت سے غلامی کا احساس ہو رہا ہے۔"

بیگم برکت نے بیٹے کے ذکر پر چونک کر اپنے سینے پر ہاتھ مارا پھر کہا۔ "ہائے میرا بچہ! وہ ایک ٹانگ پر کھڑا ہوگا۔"

وہ تیزی سے چلتی ہوئی کمرے سے باہر بالکونی میں آئی۔ نیچے ڈرائنگ روم میں دیکھا تو ممتا تڑپ گئی۔ وہ فوراً ہی زینے سے اترتے ہوئے بیٹے کے پاس آنے لگی۔ وہ ایک ٹانگ پر کھڑا تھا۔ اس کے سامنے کچھ فاصلے پر ایک مسلح گارڈ ایک کشن پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ قریب آ کر گارڈ سے غصے میں بولی۔ "میرا بیٹا سزا پا رہا ہے اور تم آرام سے بیٹھے ہوئے ہو؟"

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر بولا۔ "سوری بیگم صاحبہ! مجھے صرف نگرانی کا حکم دیا گیا ہے۔"

"تو پھر کھڑے ہو کر نگرانی کرو۔"

"معافی چاہتا ہوں' ہم صرف فرار ہونے والے یا کسی خطرناک مجرم کی نگرانی کے



لیے اسٹینڈ بائی رہتے ہیں۔"

بیگم نے سختی سے ہونٹوں کو بھینچ کر اسے دیکھا پھر بیٹے کے پاس آئی۔ اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر بولی۔ "ہائے میرا بچہ' کتنی تکلیف میں ہے اور وہ بڈھا آرام سے سو رہا ہوگا۔"

جمشید نے درد بھرے لہجے میں ممتا کو بھڑکایا۔ "ممی! ہم پتھر کے گھر میں نہیں' پتھر کے سائے میں رہتے ہیں۔ پلیز' مجھے نجات دلائیں' میرا یہ پاؤں سُن ہو رہا ہے۔"

وہ اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ "میں سن رہی ہوں بیٹا۔"

"میں سننے کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ جب خون کی روانی سست پڑ جاتی ہے اور جسم کے کسی ایک حصے میں رکنے لگتی ہے تو وہ حصہ سُن ہو جاتا ہے یعنی بے حس ہونے لگتا ہے۔ میرے ایک پاؤں کے اندر چیونٹیاں سی رینگ رہی ہیں۔"

وہ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں چٹخاتے ہوئے بولی۔ "اللہ کرے' بڈھے کو شوگر ہو جائے اور یہاں کی تمام چیونٹیاں ادھر چلی جائیں۔"

وہ پلٹ کر گارڈ کے پاس آئی پھر بڑی رازداری سے بولی۔ "میں ابھی پانچ ہزار دوں گی' اسے دونوں پیروں پر کھڑا رہنے دو۔ صبح پھر ایک پاؤں پر نظر آئے گا تو پیر صاحب کو پتہ نہیں چلے گا۔"

گارڈ نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔ "سوری بیگم صاحبہ!"

وہ پیچھے ہٹ کر بولی۔ "کیا سوری سوری لگا رکھی ہے۔ کیا تمہاری ماں نہیں ہے؟"

"نہیں بیگم صاحبہ! وہ میری پیدائش کے بعد اللہ کو پیاری ہو گئی۔ میں نے کبھی ماں کو نہیں دیکھا۔"

بیگم نے گارڈ کو سنجیدگی سے دیکھا پھر نظریں اٹھائیں۔ بالکونی میں برکت شاہ' رحمت شاہ اور بیگم رحمت نظر آ رہے تھے۔ وہ اپنے بیٹے کے پاس آ کر گارڈ سے بولی۔ "تمہاری ماں زندہ ہوتی تو تم اس سے شکایت کرتے کہ اس نے تمہیں گارڈ کیوں بنایا؟ گاڈ فادر کیوں نہیں بنایا؟ میں تمہیں بتاتی ہوں' میں اپنے بیٹے کی ماں ہوں۔ ابھی زندہ ہوں' اس کے دادا کی طرح اسے گاڈ فادر بناؤں گی۔ اسے سزاوار نہیں رہنے دوں گی۔"

اس نے بیٹے کے پاس آکر اپنے شوہر اور اس کے بھائی رحمت شاہ کو دیکھا پھر کہا۔ "باپ کے غلامو! پتھر کے آگے جھکنے والو! اولاد مصیبت میں ہو تو ماں کبھی نہیں جھکتی۔ جھکتی ہے تو صرف بیٹے کے لیے۔"

وہ جھک کر بیٹے کے قدموں کے پاس دوزانو ہو گئی۔ وہ ایک پیر پر کھڑا تھا۔ دوسرا پیر گھٹنے کی طرف سے مڑا ہوا تھا۔ ماں نے اس مڑے ہوئے پیر کو اپنے کاندھے پر رکھ لیا پھر تنبیہہ کے انداز میں انگلی اٹھا کر گارڈ سے بولی۔ "دور سے نگرانی کرو۔ گاڈ فادر کے حکم کے مطابق میرا بیٹا ایک ٹانگ پر کھڑا ہے۔ اس حکم کے بعد باقی تمام حقوق ماں کے ہیں۔ کسی دن بیٹا مجھے کاندھا دے گا۔ آج ماں اسے کندھے کا سہارا دے رہی ہے۔"

ان ماں بیٹے کو سب ہی گم صم ہو کر دیکھ رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ صبح کو جب پیر عظمت اللہ شاہ سلطانی بیدار ہو کر آئیں گے تو اپنی دی ہوئی سزا کو دیکھیں گے یا ماں کی ممتا کو........ جس نے دادا کی دی ہوئی سزا کو بھی برقرار رکھا تھا اور اپنے ماں ہونے کا حق بھی حاصل کیا تھا۔

گاڈ فادر! تم ساری دنیا کو پتھر مارو۔ کسی کے بیٹے کو نہ مارو۔ مارو گے تو وہ پتھر ماں کے کلیجے پر لگے گا۔

★============★============★

خوشی کا موقع ہو تو رت جگا منایا جاتا ہے لیکن کوٹھی کے وہ دو افراد رت جگے کی سزا پا رہے تھے۔ جمشید کا ایک پیر فرش پر تھا دوسرا پیر گھٹنے کی طرف سے مڑا ہوا اپنی ماں کے کاندھے پر رکھا ہوا تھا۔ جمشید کے دادا پیر عظمت اللہ شاہ سلطانی نے اسے صبح ہونے تک ایک ٹانگ پر کھڑا رہنے کی سزا دی تھی اور خود جا کر سو گئے تھے۔ ان کی گونگی بہری نواسی شہناز بھی اپنی خواب گاہ میں سو رہی تھی۔

صرف وہی دو افراد نیند کے مزے لوٹ رہے تھے۔ خاندان کے باقی افراد جاگ رہے تھے۔ بیٹے کو سزا ملی تھی۔ والدین سو نہیں سکتے تھے۔ اس کی چچی اور چچا بھی ان کے غم میں برابر کے شریک تھے۔ اس کی سزا معاف نہیں کرا سکتے تھے اس لیے بیداری میں ان کا ساتھ دے رہے تھے اور زینے کے پائیدان پر بیٹھے ہوئے تھے۔ سزا پانے والے بھائی



کی بہن روبی ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے سامنے سنی سینے پر دونوں ہاتھ باندھے سر جھکائے کھڑا تھا۔ روبی نے اسے گھور کر دیکھا پھر پوچھا۔ "کیا میرے غلام ہو؟ اس طرح کیوں کھڑے ہو؟"

"تم سے شادی کرنے کے بعد زندگی گزارنے کی پریکٹس کر رہا ہوں۔"

"شادی کرے گی میری جوتی۔ ممی! ڈیڈ! آنٹی! انکل! آپ سب اچھی طرح سن لیں۔ میں ایسے سچ بولنے والے الو سے شادی نہیں کروں گی۔"

سنی کی والدہ بیگم رحمت نے کہا۔ "بیٹے! تمہیں یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ جمشید اپنی بہن روبی کے کمرے میں نہیں تھا۔ اس طرح اس گونگی کے ساتھ خواہ مخواہ جمشید بدنام ہو کر سزا پا رہا ہے۔"

سنی نے کہا۔ "میں کیا کروں؟ یہ زبان سچ کی چکناہٹ پر پھسل جاتی ہے۔ میں خود کو لاکھ سمجھاتا ہوں کہ آپ لوگوں کی نیک ہدایات پر عمل کروں اور جس موقع پر سچ کو چھپانا چاہیے وہاں ضرور چھپاؤں اور جہاں سفید جھوٹ بولنا چاہیے وہاں قسمیں کھا کر جھوٹ بولا کروں لیکن جس طرح ضمیر بولتا ہے اسی طرح روبی میرے اندر بولتی ہے' خبردار! سچ بولا کرو۔"

روبی نے کرسی سے اٹھ کر پوچھا۔ "اے جھوٹے! مکار! میں نے کب تمہیں سچ بولنے کا سبق پڑھایا ہے۔"

"ایمان سے بولو جب ہماری شادی ہو جائے گی تو کیا تم نہیں کہو گی کہ بیوی سے ہمیشہ سچ بولا کرو۔"

جمشید اور روبی کی ماں بیگم برکت نے اپنے شوہر کو اور سنی کی ماں بیگم رحمت نے اپنے شوہر کو دیکھا۔ وہ بھی اپنے شوہروں سے یہی کہتی تھیں بلکہ دنیا کی تمام بیویاں اپنی شوہروں کو یہی تاکید کرتی ہیں کہ وہ باہر ہزار جھوٹ بولا کریں مگر اپنی گھر والی سے ہمیشہ سچ بولنا چاہیے۔ اس طرح ہوم سویٹ ہوم رہا کرتا ہے۔"

اور یہ احمقانہ سوچ ہے کہ بندہ جگہ جگہ جھوٹ اور فریب سے کام لے اور گھر میں سچا اور فرمانبردار شوہر بن جائے۔ اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ جھوٹ ہمیشہ اپنے گھر

سے شروع ہوتا ہے۔

سنی نے کہا۔ "روبی! میں چاہتا ہوں کہ جب ہم اپنا گھر آباد کریں' تب تک مجھے تمہارے سامنے بے اختیار سچ بولنا آ جائے میں نے جمشید بھائی کے خلاف اس لیے سچ کہا کہ تم میرے سامنے کھڑی تھیں۔"

رحمت شاہ سلطانی نے بیٹے سے کہا۔ "سنی! اس وقت جمشید سزا کی تکلیف برداشت کر رہا ہے اور تم روبی کو پریشان کر رہے ہو۔ ہونے والی بیوی کے سامنے سچ بول کر بیوی کے بھائی کو سزا دلانا کون سی دانشمندی ہے۔"

"ڈیڈی! سچ بولنے کے لیے دانشمندی کی نہیں' بیوی کی تابعداری کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"میں کہہ چکی ہوں' تم سے شادی نہیں کروں گی۔ نہیں کروں گی۔ انکل' آپ اپنے بیٹے کو علاج کے لیے یوکے یا اسٹیٹس لے جائیں۔ اسے سچ بولنے کا کینسر ہو گیا ہے۔"

بیگم برکت نے بیٹی سے کہا۔ "روبی! یہ کیا بکواس ہے۔ جو منہ میں آتا ہے کہہ دیتی ہو۔ کینسر ہو اس بڈھے کو جو میرے بچے کو سزا دے کر آرام سے سو رہا ہے۔"

وہ بیٹے کے دوسرے پیر کو کاندھے پر رکھے قالین پر دو زانو بیٹھی تھی اور کہہ رہی تھی۔ "میں سنی سے ناراض ہوں کہ اس نے سچ کہا اور میرے جمشید کو سزا مل رہی ہے لیکن میں نے بیٹے کی سزا کو بانٹ لیا ہے۔ سوچ رہی ہوں' سنی کی سچائی نے ہم پر یہ وقت لا کر اس کوٹھی میں ہماری اوقات بتا دی ہے۔ ہم خون کے رشتوں میں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے پیر صاحب کے اعلیٰ خاندان کے افراد ہیں لیکن غلام ہیں۔ ہمارے شوہر حضرات غلام ہیں اور ہم کنیزیں ہیں۔ ان کے ابا حضور جب چاہیں ہمیں چابک مار سکتے ہیں اور ہمارے بچوں کو تمام رات ایک ٹانگ سے اپاہج بنا سکتے ہیں۔ اگر وہ سچ مچ ہمارے بچوں کو اپاہج بنا دیں تو ہمارے شوہر حضرات اپنے باپ کا کیا بگاڑ لیں گے۔"

برکت شاہ سلطانی نے جھکا ہوا سر اٹھا کر اپنی بیگم کو دیکھا پھر کہا۔ "میں یہاں زینے پر بیٹھا ہوا ہوں۔ میرے سامنے نیچے فرش پر میرے بیٹے کو ایک پیر پر کھڑا کر دیا ہے اور تم



بیٹے کے لیے بیساکھی بن کر ممتا کا ثبوت دے رہی ہو اور میں کیا کر رہا ہوں؟ کچھ نہیں۔ اور میرا یہ بھائی رحمت شاہ کیا کر رہا ہے؟ کچھ نہیں کیونکہ ابا حضور نے ہمیں "کچھ نہیں" رہنے کے قابل بنا دیا ہے۔ ہم آج تک اپنے اور اپنی بیویوں کے معاملات میں صفر تھے لیکن اپنی اولاد کے معاملے میں زیرو بن کر نہیں رہیں گے۔"

چھوٹے بھائی رحمت شاہ نے کہا۔ "میں بھی بڑی دیر سے یہ فیصلہ کر رہا ہوں کہ ہمیں احتجاج کے طور پر کوئی ایسا قدم اٹھانا چاہیے جس کے نتیجے میں ہم ابا حضور کے دباؤ سے نکل جائیں۔"

بیگم رحمت نے کہا۔ "آپ کبھی ایسی ہمت نہیں کر سکیں گے ایسا کرنے کے لیے سینے میں دل نہیں پتھر ہونا چاہیے۔ یہ پتھر صرف اس بڈھے کے سینے میں ہے۔"

"وقت اور ناقابل برداشت حالات پتھر تو کیا فولاد بنا دیتے ہیں۔ صبح ہونے دو' ہم ابا حضور سے دو ٹوک فیصلہ کریں گے۔ ہم بتا دیں گے ہم صرف ان کے بیٹے نہیں ہیں' اپنے بیٹوں کے بھی باپ ہیں۔ ہم اپنے بیٹوں کے لیے جیل جا سکتے ہیں لیکن باپ کی بنائی ہوئی اس جیل میں نہیں رہیں گے۔"

روبی نے کہا۔ "صبح ہو رہی ہے۔ کچن سے آواز آ رہی ہے۔ عبداللہ چائے تیار کر رہا ہو گا۔ وہ دیکھیے' میڈم گونگی چلی آ رہی ہے۔ یہ صبح ٹھیک ساڑھے چار بجے بیدار ہو جاتی ہے۔"

پہلی منزل کی لابی پر شہناز ایک شان بے نیازی سے چلی آ رہی تھی۔ اس کی زلفیں کھلی ہوئی تھیں۔ اس نے زینے کے اوپری سرے پر آ کر اہل خاندان کو دیکھا جو جمشید کے سزا پانے پر سوگ منا رہے تھے۔ ان کی نیند سے بوجھل گھورتی ہوئی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ سب تمام رات جاگتے رہے ہیں۔

شہناز نے پیچھے ہاتھ لے جا کر بکھری ہوئی زلفوں کو سمیٹ کر جوڑا بناتے ہوئے ناگواری سے جمشید کو دیکھا پھر زینے سے اترنے لگی۔ جمشید کی ماں بیگم برکت نے اسے کوسنے کے انداز میں انگلیاں چٹخاتے ہوئے کہا۔ "پتہ نہیں یہ گونگی چڑیل یہاں آ کر کیوں رہنے لگی ہے۔ اس نے میرے بیٹے سے دشمنی کی ہے۔ میں اس کا بدلہ ضرور لوں گی۔"

ایک ٹانگ پر کھڑے ہوئے جمشید نے کہا۔ "ممی! بدلہ لینا کون سی بڑی بات ہے؟ یہ کمبخت اتنی حسین ہے کہ کوئی بھی اسے اٹھا کر لے جا سکتا ہے۔"

اس کے باپ برکت شاہ نے کہا۔ "تم نے بڑے پتے کی بات کی ہے لیکن غلط وقت پر کی ہے۔ ابا حضور کا یہ وفادار گارڈ سن رہا ہے۔ اس کے سامنے قسم کھاؤ کہ شہناز کو کوئی نقصان نہیں پہنچاؤ گے۔"

شہناز کچن کی طرف چلی گئی تھی۔ جمشید نے باپ کی معنی خیز بات کو سمجھ کر قسم کھائی اور کہا۔ "میں تو یونہی غصے میں بول رہا تھا۔ یہ گونگی ہمارے خاندان کی عزت ہے۔ کس کی مجال ہے کہ اسے اغوا کرے۔"

بیٹے کے قدموں میں بیٹھی ہوئی ماں نے کہا۔ "میں بھی غصے میں بول رہی تھی ورنہ سوچنے کی بات ہے۔ اس کی ماں کو پہلے ہی کسی نے اغوا کر لیا ہے۔ ابا حضور نے ابھی تک باہر والوں سے یہ بات چھپائی ہے۔ بیٹی کے بعد اس کو اغوا کیا جائے گا تو بات چھپی نہیں رہے گی۔ ابا حضور اس کوٹھی کے اندر زندہ رہیں گے اور باہر ان کی عزت کا جنازہ نکلے گا۔ کیا خیال ہے؟"

اس نے اپنے شوہر برکت سے پوچھا۔ برکت نے تائید میں سر ہلایا پھر کہا۔ "عزت کا جنازہ نہیں نکلے گا۔"

چھوٹے بھائی رحمت شاہ نے بھی ہاں کے انداز میں سر ہلا کر کہا۔ "ہاں گونگی کا جنازہ نہیں نکلنا چاہیے۔"

بیگم رحمت اور روبی نے بھی تائید کی۔ جو بات وہ سب کہہ رہے تھے اس کے مطابق انہیں "نہیں" کے انداز میں سر ہلانا چاہیے تھا لیکن زبانیں کچھ کہہ رہی تھیں' ہلتے ہوئے سر کچھ اور معنی خیز منصوبہ بندی کا دوغلا پن ظاہر کر رہے تھے۔ ان سب نے سنی کو دیکھا۔ وہ "نہیں" کے انداز میں مسلسل سر ہلا رہا تھا۔ روبی نے پوچھا۔ "یہ کیا حرکت ہے؟"

وہ بولا۔ "اپنی ہونے والی کے سامنے سر سچائی سے ہل رہا ہے اور میں زبان کو جھوٹ بولنے پر راضی کر رہا ہوں۔ پتہ نہیں یہ آپ تمام بزرگ ایک ہی وقت میں دو کام



کیسے کر رہے ہیں۔"

بیگم برکت نے کہا۔ "اے سنی کے بچے! ہر وقت مسخری نہ کیا کرو ورنہ کان پکڑ کر دو تھپڑ ماروں گی پھر داماد نہیں بناؤں گی۔"

"آنٹی! داماد نہ بنانے کا یہ طریقہ پہلی بار سن رہا ہوں۔"

سب کی توجہ شہناز کی طرف گئی۔ وہ کچن سے ایک ٹرے میں چائے لے کر آئی تھی اور زینے پر چڑھتی ہوئی اوپر جا رہی تھی۔ روبی نے کہا۔ "بڑی نانا کی خدمت گزار نواسی ہے۔ بیڈ ٹی لے جا رہی ہے۔"

سنی نے کہا۔ "تمہیں اس کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ وہ دادا جان کو چائے کے لیے جگائے گی تو وہ یہاں آ کر جمشید بھائی کی سزا معاف کریں گے۔"

بیگم برکت نے کہا۔ "اے دفع کرو۔ بڑے آئے سزا معاف کرنے والے۔ معاف نہ کریں۔ میں اپنے بیٹے کو آخری سانس تک سہارا دیتی رہوں گی۔"

"آنٹی! آپ کا جذبہ سلامت رہے لیکن اس حالت میں جمشید بھائی کی تصویر نہیں اتاری جا سکتی۔ ایسی تصویر جس گھر میں جائے گی' لڑکی والے رشتہ دینے سے انکار کر دیں گے۔"

بیگم برکت نے طمانچے کے لیے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "کمبخت ابھی اٹھوں گی اور پٹائی شروع کر دوں گی۔"

"آنٹی! ایسی غلطی نہ کیجئے۔ جمشید بھائی کا مجسمہ آپ کے سہارے کھڑا ہے' آپ بیٹھی رہیں۔"

"دیکھ رہے ہو رحمت! تم میاں بیوی نے اپنے بیٹے کو دو کوڑی کا بنا دیا ہے۔"

"معاف کیجئے گا بھابی جان! ہم نے تو بیٹا آپ کو دیا ہوا ہے۔ آپ ہی اسے سر پہ چڑھائے رکھتی ہیں۔ آپ ہی نے اسے مسخرہ بنایا ہے۔"

سنی نے کہا۔ "آپ حضرات میرے خلاف محاذ بنا رہے ہیں لہٰذا میں اوپر جا کر دیکھتا ہوں۔ اگر شانی دادا جان کو یہاں نہیں لائے گی تو میں لے آؤں گا۔"

وہ زینے پر چڑھتے ہوئے اوپر جانے لگا۔ اس کی ماں نے کہا۔ "اس گونگی کا نام

شہناز ہے۔ تم اتنے پیار سے شانی کیوں کہتے ہو؟"

بیگم برکت نے کہا۔ "خوب صورت چڑیل ہے۔ میری بیٹی کے حق پر ڈاکہ ڈالنے آئی ہے۔"

روبی نے کہا۔ "ممی! اس کے پیچھے جانے دیں۔ سنی کی اوقعات یہی ہے۔ سار عمر دونوں ہاتھ نچانچا کر اس گونگی سے ازدواجی مذاکرات کیا کرے گا۔"

روبی زبان سے ایسا کہہ رہی تھی مگر یہ سوچ کر توہین محسوس کر رہی تھی کہ جو اس کا منگیتر تھا' اسے شہناز اپنی طرف کھینچ کر اپنے حسن کو برتر اور اس کے حسن کو کم تر رہی تھی۔

★============★============★

پیر عظمت اللہ شاہ سلطانی اصولوں کے پابند تھے اور تمام گھر والوں کو بھی پابند بنائے رکھتے تھے۔ ان میں سے ایک پابندی یہ تھی کہ گھر کا ہر فرد صبح چار بجے بیدار ہو کر بستر چھوڑ دیا کرے۔ نماز پڑھنے کی پابندی نہیں تھی لیکن یہ سختی سے تاکید کی گئی تھی کہ باہر سے مہمان وغیرہ آیا کریں تو نماز ضرور پڑھا کرو تاکہ باہر چرچا رہے کہ واقعی وہ پیر صاحب کا مکان ہے۔

وہ اپنے وقت پر بیدار ہو گئے تھے۔ انہوں نے دروازے پر دستک سنی پھر زیر لب کہا۔ "ہماری لاڈلی چائے لائی ہو گی۔"

ان کے سامنے والی دیوار کے ساتھ ایک ٹی وی تھا۔ انہوں نے ریموٹ کنٹرول سے اسے آن کیا۔ اسکرین پر شہناز چائے کی ٹرے ہاتھوں میں لیے نظر آ رہی تھی۔ انہوں نے مسکرا کر ٹی وی کو آف کیا پھر دوسرا ریموٹ کنٹرولر اٹھا کر اس کا رخ دروازے کی سمت کیا۔ اس کے ایک بٹن کو دبایا تو کھٹ کی آواز سے دروازے کا لاک کھل گیا۔ انہوں نے دوسرا بٹن دبایا۔ دروازہ آہستہ آہستہ کھلنے لگا۔ وہ ٹرے اٹھا کر اندر آئی۔ نانا کو دیکھ کر سر کے اشارے سے سلام کیا۔ انہوں نے کہا۔ "وعلیکم السلام۔ ہماری نواسی دن کی بہت پابند ہے۔"

اس نے بستر کے سرہانے والی میز پر ٹرے رکھی مگر پیالی میں چائے نہیں انڈیلی



دونوں ہاتھوں کے اشاروں سے کچھ کہنے لگی۔ وہ غور سے اس کے اشاروں کو دیکھنے اور سمجھنے لگے پھر بولے۔ "بھئی ہم کئی مہینوں سے اشاروں والی زبان سمجھنے اور سیکھنے کی کوششیں کرتے ہیں لیکن اتنی مصروفیات ہیں کہ اس کا موقع ہی نہیں ملتا۔"

وہ سوالیہ نظروں سے نانا کو دیکھ رہی تھی۔ یہ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ نانا صاحب کیا فرما رہے ہیں پھر وہ ایک ذرا پیچھے ہٹ کر انگلی سے نیچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک پیر پر کھڑی ہو گئی پھر دوسرا پاؤں اٹھا کر گھٹنے کی طرف سے موڑ لیا۔ سنی نے کمرے میں داخل ہو کر کہا۔ "دادا جان السلام علیکم۔ یہ شانی کہہ رہی ہے کہ لنگڑی بن کر باہر بھیک مانگنے جائے گی۔"

انہوں نے کہا۔ "تم آ گئے بکواس کرنے؟ سیدھی طرح بتاؤ یہ کیا کہہ رہی ہے؟"

"سیدھی سی بات یہ ہے کہ پچھلی رات سے جمشید بھائی کی ایک ٹانگ گم ہو گئی ہے۔ یہ شانی اس کی دوسری ٹانگ کا عطیہ حاصل کرنا چاہتی ہے۔"

وہ فوراً ہی بستر سے اترتے ہوئے بولے۔ "اوہو ہم تو اپنے پوتے کو سزا دے کر بھول ہی گئے تھے۔"

وہ گاؤن اٹھا کر پہنتے ہوئے کمرے سے باہر آئے۔ شہناز اور سنی ان کے پیچھے تھے۔ وہ تینوں بالکونی میں آئے۔ پیر شاہ سلطانی نیچے جمشید اور اس کی ماں بیگم برکت کو دیکھ کر ٹھٹک گئے۔ تمام رات ڈیوٹی دینے والے گارڈ نے انہیں دیکھ کر سلیوٹ کیا۔ انہوں نے اسے باہر جانے کو کہا۔ وہ چلا گیا۔

رحمت شاہ' بیگم رحمت اور برکت شاہ اٹھ کر زینے پر کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے زینے کی طرف بڑھتے ہوئے بڑی بہو سے کہا۔ "اچھا تو ماں نے بیٹے کی آدھی سزا کا بوجھ اپنے کاندھے پر اٹھائے رکھا ہے؟"

بڑی بہو خاموش رہی۔ وہ سسر کی طرف سے نظریں پھیر کر دوسری طرف دیکھ رہی تھی۔ انہوں نے کہا۔ "جمشید! تم چاہو تو اپنے دونوں پاؤں استعمال کر سکتے ہو۔"

اس نے ماں کے کاندھے سے پیر ہٹا کر قالین پر رکھا پھر تکلیف سے کراہتے ہوئے ذرا ڈگمگایا۔ ماں اور بہن روبی نے جلدی سے اسے سہارا دیا۔ برکت شاہ سلطانی' رحمت

شاہ سلطانی اور بیگم رحمت سب ہی زینے سے اترتے ہوئے اس کے پاس آئے۔ جمشید اپنے باپ اور چچا کے سہارے لنگڑاتے ہوئے ایک صوفے پر آ کر بیٹھ گیا۔

باپ اور چچا اس کے ایک ایک پاؤں کے پٹھوں کو مالش کرنے کے انداز میں درست کرنے لگے۔ دونوں پیروں میں خون کی روانی بحال کرنے لگے۔ پیر عظمت اللہ شاہ سلطانی، شہناز اور سنی کے ساتھ زینے سے اترتے ہوئے نیچے آئے پھر آرام سے جمشید کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئے اور کہنے لگے۔ "اگر یہ قانون بنایا جائے کہ پھانسی چڑھنے والے کی جگہ اس کی ماں جان کا نذرانہ دینا چاہے تو بیٹے کی سزا معاف ہو جائے گی تو شاید دنیا کی تمام مائیں اپنے مجرم بیٹوں کی جگہ تختۂ دار پر چلی آئیں گی لیکن ایسا قانون دنیا کے کسی ملک میں نہیں ہے۔ ہر مال واسباب اور ہر محبت میں حصے داری ہوتی ہے مگر ایک کی سزا میں دوسرا حصے دار نہیں بن سکتا۔ ایسا کرنے کی قانونی اور اخلاقی اجازت نہیں ہے۔"

برکت شاہ سلطانی نے کہا۔ "ابا حضور! ماں باپ کو حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنے بچوں کی تکالیف کو شیئر کریں۔ آپ اخلاقی اجازت کی بات کرتے ہیں۔ والدین کے اخلاقی تقاضوں کی بات کریں۔"

انہوں نے کہا۔ "والدین کا فرض ہے کہ اولاد کی غلطیوں سے چشم پوشی نہ کریں۔ اولاد کو پہلی غلطی پر سمجھائیں، دوسری غلطی پر وارننگ دیں اور تیسری غلطی پر اسے سزا ضرور دیں۔ انہیں والدین کے رعب، دبدبے اور اصول پسندی کا احساس دلائیں۔ جو باپ ایسا نہیں کرتے وہ بیٹے کو اپنا باپ بنا لیتے ہیں پھر اس کی بے راہ روی کے آگے بے بس اور بزرگانہ اختیارات سے محروم ہوتے چلے جاتے ہیں۔"

انہوں نے بڑی بہو کی طرف دیکھا پھر کہا۔ "مائیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو اولاد کی غلطیوں پر پردہ ڈالتی چلی جاتی ہیں۔ انہیں بڑے سے بڑے جرم کی سزا سے بچائے رکھنے کی کوششیں کرتی ہیں۔ اگر ناکامی ہو تو بیٹے کی سزا کا پتھر اپنے کلیجے پر رکھ لیتی ہیں۔ ایسی مائیں اپنی اولاد کی دشمن ہوتی ہیں۔ ممتا بھرے عمل سے اولاد کو ڈرامائی انداز میں یہ تاثر دیتی ہیں کہ بیٹے جاؤ، باپ دادا کے نام کی دھجیاں اڑا کر آؤ تمہیں چھپنے کے لیے ماں کا



آنچل مل جائے گا۔"

بیگم برکت نے اپنے بیٹے سے کہا۔ "جمشید! اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ اور دیکھو کہ اپنے پیروں سے چل سکتے ہو یا نہیں؟"

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اپنے دونوں پیروں کو آہستہ آہستہ جھٹک کر جوگنگ کے انداز میں اچھلتا ہوا بولا۔ "ممی! آئی ایم آل رائٹ۔ میں چل سکتا ہوں۔"

ماں نے کہا۔ "تم اور روبی سامان پیک کرو۔ ہم یہاں سے جا رہے ہیں اب اس قید خانے میں نہیں رہیں گے۔"

پیر شاہ سلطانی دھیمی آواز سے کھانسنے کے انداز میں ہنستے ہوئے بولے۔ "اس قید خانے کے باہر کئی مسلح گارڈز ہیں۔ فرار ہونے والے قیدیوں کو گولی مار دیتے ہیں چونکہ ہمارے رشتے دار ہو اس لیے نقصان نہیں پہنچائیں گے، باہر کے دروازے بند کر دیں گے۔"

رحمت شاہ نے کہا۔ "آپ کی گفتگو سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے اس شاندار کوٹھی کو ہمارے لیے قید خانہ بنا رکھا ہے۔"

"قید خانے کا لفظ بڑی بہو نے ادا کیا ہے پھر یہ ہمارے پوتے پوتی کو، ہمارے خون کو چرا کر لے جانا چاہتی ہے۔ ایسی مجرمہ کے لیے تو یہ کوٹھی قید خانہ ہی لگے گی۔"

برکت شاہ نے کہا۔ "رات سے صبح تک میرے بیٹے کو سزا دی گئی ہے۔ ایسی جگہ صرف قید خانہ ہی نہیں، عقوبت خانہ بھی کہلاتی ہے پھر آپ میرے بچوں کی ماں کو مجرمہ کہہ رہے ہیں۔ کیا یہ ان بچوں کی ماں نہیں ہیں۔ کیا انہیں یہاں سے لے جائیں گی تو یہ کوئی جرم ہو جائے گا۔"

"یہ ہماری اور تمہاری اجازت سے لے جائیں گی تو جرم یا اپنی من مانی نہیں ہو گی۔ جب باپ دادا زندہ ہوں تو بچوں پر صرف ماں کا حق نہیں ہوتا۔"

"ابا حضور! میں ان بچوں کا باپ ہوں۔ میں ریحانہ کے ساتھ بچوں کو یہاں سے لے جا سکتا ہوں۔"

"بے شک لے جا سکتے ہو۔ یہ قید خانہ نہیں ہے اور تم سب قیدی نہیں ہو۔ اپنے

حقوق حاصل کرنے کے لیے جس طرح چاہو اپنے طور پر آزادی سے زندگیاں گزار سکتے ہو۔"

رحمت شاہ سلطانی نے کہا۔ "ابا حضور! آپ ہمارے حقوق کو تسلیم کر کے فراخدلی سے کام لے رہے ہیں۔ میں بھی سلمیٰ اور اپنے بیٹے سنی کو لے کر بھائی جان کے ساتھ جانا چاہتا ہوں۔"

"ہمیں خوشی ہے کہ تم دونوں بھائیوں میں بڑی محبت ہے اور تم دونوں اپنی ذاتی کوٹھیوں میں جا کر رہنا چاہتے ہو۔ تم دونوں کا الگ الگ کاروبار ہے۔ سال میں پندرہ بیس لاکھ کما لیا کرتے ہو۔ باپ کے محتاج نہیں ہو۔ جانے سے پہلے ہمارے وکیل کو بلاؤ۔ دونوں بھائی پکے کاغذات پر لکھ کر جاؤ کہ اپنی مرضی سے باپ کو چھوڑ کر جا رہے ہو۔ لہٰذا باپ کی زندگی اور باپ کی موت کے بعد اس کی تمام دولت اور جائیداد میں سے ایک پیسے کے بھی حقدار نہیں رہو گے۔"

دونوں بھائیوں نے سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر برکت شاہ سلطانی نے کہا۔ "لیکن ابا حضور! ہم ہمیشہ کے لیے آپ کو چھوڑ کر نہیں جا رہے ہیں۔"

"کیا پکنک منانے جا رہے ہو اور شام کو واپس آ جاؤ گے؟"

شہناز نے ٹرے میں چائے لا کر نانا کو پیش کی۔ برکت شاہ اور رحمت شاہ سوالیہ نظروں سے اپنی بیویوں کو دیکھنے لگے۔ بیگم برکت نے اپنے میاں سے کہا۔ "آپ مرد ہیں میری طرف کیا دیکھ رہے ہیں۔ کیا آپ اپنی اولاد کی بہتری کے لیے اپنے طور پر زندگی نہیں گزاریں گے؟ آپ لاکھوں روپے کماتے ہیں۔ ہمارے پاس کوٹھی ہے' کار ہے' بینک بیلنس یہاں بھی ہے اور لندن میں بھی۔ اگر آپ ابا حضور کے کروڑوں اور اربوں روپے کے لالچ میں یہاں دھرنا مار کر بیٹھیں گے تو بیوی اور بچوں کو محتاج اور غلام بنا کر' قیدی اور اپاہج بنا کر رکھیں گے۔"

جمشید نے کہا۔ "میں اٹھائیس برس کا ہوں' اپنی مرضی سے فیصلہ کر سکتا ہوں۔ میرا فیصلہ ممی کے حق میں ہے۔"

روبی نے کہا۔ "میں اپنی ممی اور بھائی جان کو چھوڑ کر یہاں نہیں رہوں گی۔"



رحمت شاہ سلطانی نے کہا۔ "بھائی جان! ہم یہاں سے جا کر بھی لکھ پتی رہیں گے۔ ہم دونوں بھائیوں کی دولت کا حساب کیا جائے تو ہم کروڑ پتی کہلائیں گے۔"

برکت شاہ سلطانی نے کہا۔ "بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ ہمارے جتنے دھندے ہیں وہ دو نمبر کے ہیں۔ ان کے دستاویزی ثبوت ابا جان کی تحویل میں ہیں۔ ہم دولت کے لحاظ سے خوش حال' آزاد اور خود مختار ہیں لیکن اپنے کاروبار کے لحاظ سے ابا حضور کے محتاج ہیں۔"

پیر سلطانی نے چائے کی خالی پیالی رکھی۔ سنی نے ان کے قریب حقہ رکھ کر اس کا پلگ سوئچ بورڈ سے لگا دیا۔ شہناز ہیٹر کے اوپری حصے میں زعفرانی تمباکو ڈالنے لگی۔ انہوں نے چاندی کے تھال سے تھوڑا سا خشک میوہ لے کر چبایا پھر حقے کی نے کو تھام کر کہا۔ "یہ حقہ ہمیں اولاد کی طرح سکون بھی پہنچاتا ہے اور اولاد کی طرح اپنی آگ میں جلتا رہتا ہے۔ ہم یہ نہیں دیکھتے کہ تم دونوں اندر سے کیسے سلگ رہے ہو۔ ہم صرف جوان بیٹوں کی موجودگی سے اپنے بڑھاپے کا سکون حاصل کر رہے ہیں۔"

انہوں نے حقے کی نے کو ہونٹوں کے درمیان رکھ کر ایک کش لگایا پھر کہا۔ "آج یہ بات سمجھ میں آ رہی ہے کہ کسی دن حقے کا ہیٹر ناکارہ ہو جائے گا تو اسے بھی گھر سے باہر پھینک کر نیا ہیٹر لانا ہو گا۔"

انہوں نے پھر ایک کش لگایا اور کہا۔ "تم جوان بیٹوں کے لیے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ ہم نادان نہیں کہ اپنے گھر کو آگ لگا دیں اور اپنی اولاد کو تباہ و برباد کر دیں۔ تم دونوں خواہ کتنے ہی نافرمان رہو' ہم باپ ہیں۔ دعائیں ہی دیتے رہیں گے۔"

برکت شاہ نے کہا۔ "کیا آپ دعاؤں کے ساتھ دوائیں نہیں دے سکتے؟ آپ ہماری تباہی و بربادی نہیں چاہتے اس لیے جو دستاویزی ثبوت ہمارے خلاف ہیں آپ وہ تمام دستاویزات ہمیں دے دیں۔ ہمارے دلوں میں خوف ہے۔ طرح طرح کے اندیشے ہیں۔ پتہ نہیں ہمارے یہاں سے جانے کے بعد کب آپ کا مزاج بدل جائے' کب آپ ہم سے کسی بات پر ناراض ہو جائیں۔ آپ کی ناراضی سے ہمارے ہنستے بستے گھر اجڑ جائیں گے۔"

"ہم نے وہ دستاویزات اس لیے اپنے پاس محفوظ نہیں رکھی ہیں کہ اپنی اولاد کو بلیک میل کریں یا کبھی ہم پر جنون سوار ہو جائے تو ہم بیٹوں کے خلاف کوئی زبردست کارروائی کریں۔"

"تو پھر وہ آپ کے کس کام آئیں گی' آپ نے انہیں کیوں سنبھال کر رکھا ہے؟"

"صرف اس لیے کہ تمہارے سروں پر ایک تلوار لٹکتی رہے۔ یہ بات چھپی نہیں رہے گی کہ بیٹوں نے باپ کا ساتھ چھوڑ دیا ہے ایسے وقت ہماری مخالف ایجنسی کا گاڈ فادر سب سے پہلے تمہارا ہمدرد اور دوست بنے گا۔ تمہارے دو نمبر کے کاروبار کو چار چاند لگا دے گا' حکمران طبقوں سے تمہیں حسب ضرورت مراعات دلائے گا پھر ہماری کچھ ڈھکی چھپی کمزوریاں اور گھر کے کچھ اندرونی راز جو صرف تمہارے جیسے بیٹوں کو معلوم ہو سکتے ہیں وہ سب بڑی آسانی سے اگلواتا جائے گا۔"

"ہم ایسے احمق نہیں ہیں کہ یہاں سے جا کر دشمنوں سے مل جائیں گے۔"

"جو باپ جیسے بچپن کے دوست کو چھوڑ دیتے ہیں وہ دشمنوں کو گلے بھی لگا سکتے ہیں۔ ایک راستہ چھوڑنے والوں کو دوسرا راستہ اختیار کرنا ہی پڑتا ہے۔ پھر دو نمبر کا کاروبار کرنے والوں کو آگے دوسرے راستے پر تحفظ فراہم کرنے والے صرف ہمارے دشمن ہی ملیں گے۔"

انہوں نے ایک کش لگایا۔ حقے سے گڑگڑاہٹ کی آواز ابھری۔ رحمت شاہ سلطانی نے کہا۔ "ابا حضور! ہم آپ کو کیسے یقین دلائیں کہ ہم گھریلو معاملات میں آپ سے مخالفت کر سکتے ہیں لیکن گھر کی بات باہر نہیں لے جائیں گے۔"

"گھر سے جانے والوں کا صرف جسم باہر نہیں جاتا' ان کی عقل بھی باہر جاتی ہے۔ وہ عقل جو انہیں باپ سے جدا اور گھر سے باہر کرتی ہے ایسی عقل پر ہم بھروسہ نہیں کریں گے۔ ان دستاویزات کو ڈھال بنا کر رکھیں گے۔ جس لمحے میں معلوم ہو گا کہ تم میں سے کوئی میرے مخالفوں کے ساتھ بیٹھ کر پانی پی رہا ہے میں تم سب کو کالے پانی پہنچا دوں گا۔"

انہوں نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ سنی نے سوئچ بورڈ سے پلگ نکال دیا پھر کہا۔ "دادا



جان! اب آپ جا کر غسل کریں گے۔ پھر ناشتہ کرنے آئیں گے۔ ڈیڈی اور انکل شاید وکیل صاحب کو بلا کر آپ کی مرضی کے مطابق تحریری بیانات لکھیں گے لیکن میں اس گھر سے نہیں جاؤں گا۔"

اس کے باپ رحمت شاہ نے کہا۔ "کیا بکواس کر رہے ہو؟ کیا باپ کو چھوڑ کر یہاں رہو گے؟"

"ڈیڈی! آپ ہی مشورہ دیں۔ کیا باپ کو نہیں چھوڑنا چاہیے؟"

رحمت شاہ نے ہچکچاتے ہوئے اپنے ابا حضور کو دیکھا پھر بیٹے سے کہا۔ "فضول باتیں نہ کرو' تم ہمارے ساتھ جاؤ گے۔"

"ڈیڈی! ذرا غور کریں' میرے یہاں رہنے کے کتنے فائدے ہیں۔ پہلا فائدہ تو یہ کہ میں دادا جان کی دولت اور جائیداد میں سے حصہ حاصل کروں گا پھر یہ کہ گھر کا بھیدی بن کر یہاں کے راز آپ لوگوں تک پہنچاتا رہوں گا پھر یہ سراغ لگاتا رہوں گا کہ وہ تمام دستاویزات کہاں چھپا کر رکھی گئی ہیں جن کے باعث آپ اور انکل دادا جان سے بغاوت کرنے کے باوجود ان کے سامنے ہاتھ جوڑنے اور سر جھکانے پر مجبور رہتے ہیں۔"

برکت شاہ نے کہا۔ "تم ابا حضور کے خلاف ہمارے فائدے کے لیے سازشیں کرو گے اور یہ بات ابا حضور کے سامنے ہی کہہ رہے ہو...... یعنی اپنے باپ اور دادا سب ہی کو احمق سمجھ رہے ہو۔ یا ہمارا مذاق اڑا رہے ہو؟"

"انکل! آپ سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں زبان پر آنے والے سچ کو روک نہیں پاتا۔ آپ کی صاحب زادی روبی نے بھی فرمایا ہے کہ مجھے سچ بولنے کا کینسر ہو گیا ہے اور کینسر اب تک لاعلاج سمجھا جاتا ہے۔"

دادا جان نے زینے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ "تم پکے شیطان ہو اور میرے گھر میں تمہارے جیسے شیطان کی بہت زیادہ گنجائش ہے۔ باقی جانے نہ جانے کا فیصلہ اپنے والدین سے کرو۔"

وہ زینے پر چڑھتے ہوئے اوپر اپنے کمرے کی طرف جانے لگے۔ شہناز بھی ان کے ساتھ جا رہی تھی۔ جب وہ بالکونی سے گزرنے کے بعد نظروں سے اوجھل ہو گئے تو روبی

نے کہا۔ "اب یہ گونگی اپنے نانا کے لیے غسل خانے میں صابن اور تولیہ وغیرہ رکھے گی پھر الماری سے دوسرا لباس نکال کر دے گی۔ یہاں ملازموں کی کمی نہیں ہے مگر نانا کے جوتوں پر پالش لگا کر چمکائے گی۔"

برکت شاہ نے کہا۔ "اس کی اغوا ہونے والی ماں نے اسے خوب سکھایا پڑھایا ہے۔ ابا حضور کی دولت اور جائیداد پر ہاتھ صاف کرنے کا راستہ صاف کر رہی ہے۔"

سنی نے کہا۔ "انکل! اس کی اغوا ہونے والی ماں آپ کی ہمشیرہ ہیں۔ ایک سچ بات کہوں گا تو پھر الزام آئے گا کہ سچ بول رہا ہوں مگر میں نہیں بولوں گا کہ دادا جان کی دولت اور جائداد پر ہاتھ صاف کرنے کا موقع خود آپ یہاں سے جا کر دے رہے ہیں۔"

بیگم برکت نے کہا۔ "ہاں ہم جا رہے ہیں۔ ! بڈھے نے جتنی بھی دولت جمع کر رکھی ہو ہم اس پر لعنت بھیجتے ہیں۔ کیوں جی، آپ کس سوچ میں پڑ گئے ہیں؟ فون کریں اور وکیل کو بلالیں۔"

برکت شاہ نے چونک کر کہا۔ "بیگم! وکیل کو جب بھی فون کیا جائے گا وہ دوڑا چلا آئے گا لیکن آج پہلی بار سنی کی سچی بات دل کو لگ رہی ہے۔ ابھی سوچنے کا وقت ہے۔ کہیں ہم اپنے پاؤں پر کلہاڑی تو نہیں مار رہے ہیں؟"

"ہم اپنے پاؤں پر نہیں، پاؤں میں بندھی ہوئی زنجیروں پر کلہاڑی مار رہے ہیں۔ میرے مجازی خدا! آپ وہ بچے ہیں جو چلنے کی عمر سے اب تک باپ کی انگلی پکڑ کر چلتے آئے ہیں اور اب انگلی چھوڑتے ہوئے ڈر رہے ہیں کہ سہارے کے بغیر اوندھے منہ نہ گر پڑیں۔"

برکت شاہ نے کہا۔ "پلیز بیگم! میری بات کو سمجھنے کی..........."

جمشید نے بات کاٹ کر کہا۔ "ڈیڈ! اپنی کوئی بات سمجھانے سے پہلے آنکھوں دیکھی حقیقت کو سمجھیں۔ میں دادا جان کے بغیر، آپ کے بغیر یعنی اپنے باپ کے بغیر صبح تک ایک پیر پر کھڑا رہا لیکن کسی نے مجھے اوندھے منہ گرتے نہیں دیکھا کیونکہ میری ممی نے مجھے گرنے نہیں دیا۔ یہ آپ کو بھی گرنے نہیں دیں گی۔ دادا جان خواہ کتنے ہی بھاری پتھر کی طرح آپ کے سر پر رہیں اور آپ کو اپنے بوجھ تلے رکھیں، میری ممی پتھر شکن ہیں۔



اس بوڑھے پتھر کو ریزہ ریزہ کر دیں گی۔ آپ میری ممی پر بھروسہ کریں یا نہ کریں آپ یہاں سے جائیں نہ جائیں، میں اپنی ممی اور بہن کے ساتھ ضرور جاؤں گا۔"

رحمت شاہ نے کہا۔ "بھائی جان! میں آپ سے زیادہ بھابی جان پر بھروسا کرتا ہوں۔ یہ ہم سے زیادہ ابا حضور کو سمجھتی ہیں۔ یہ ذہانت سے سوچتی ہیں پھر بڑی چالاکی سے عمل کرتی ہیں۔ میں اس بات کو سمجھ گیا ہوں کہ جس پتھر کو ہم باپ کہتے ہیں وہ ہمارے جاتے ہی آدھا ٹوٹ جائے گا۔"

اس نے ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرتے ہوئے کہا۔ "میں وکیل صاحب کو بلا رہا ہوں۔ میرے بیٹے سنی نے ہمارے ساتھ جانے سے انکار کیا ہے مگر میں بھائی جان، جمشید، روبی اور اپنی سلمٰی بیگم کے ساتھ جاؤں گا۔ مجھے امید ہے آپ بھی ہمارا ساتھ دیں گے۔"

رابطہ قائم ہونے پر اس نے کہا۔ "ہیلو بیرسٹر طاہر نقوی صاحب..........."

★==========★==========★

اور سیاہ ویسٹ کوٹ نکالو۔ ابھی ہم یہاں کی ایک بہت بڑی شخصیت سے ملاقات کرنے جائیں گے۔"

شہناز ان کا منہ تکنے لگی۔ وہ بولے۔ "کیا مصیبت ہے، ہم بھول جاتے ہیں کہ یہ باتیں سن نہیں سکتی ہے۔"

انہوں نے اشارے سے کہا کہ وہ یہ لباس نہیں کوئی دوسرا لباس پہنیں گے۔ وہ جواباً اشاروں میں بولی کہ انہیں یہ سفید لباس ہی پہننا ہوگا۔ انہوں نے ہنستے ہوئے فون پر کہا۔ "بھئی یہ ہماری لاڈلی ضد کر رہی ہے کہ ہمیں سفید لباس ہی پہننا پڑے گا۔ ہم تم سے بعد میں رابطہ کریں گے بلکہ ضروری کاموں سے فارغ ہو کر تمہارے پاس آئیں گے۔"

انہوں نے فون بند کرنے کے بعد ایک کاغذ پر لکھا۔ "ہمیں سفید لباس کیوں پہننا چاہیے؟ تم ضد کیوں کر رہی ہو؟"

شہناز نے جواباً کاغذ پر لکھا۔ "کیا آپ نہیں دیکھ رہے ہیں کہ میں نے بھی سفید لباس پہنا ہے۔"

انہوں نے نواسی کے لباس کو دیکھا پھر لکھا۔ "واقعی، ہم نے توجہ نہیں دی تھی۔ یہ بتاؤ کہ سفید لباس کیوں ضروری ہے؟"

"آپ نے مجھے نادان بچی سمجھ کر بہلایا اور یہ سمجھا دیا کہ ممی ملک سے باہر گئی ہیں جبکہ انہیں کسی نے اغوا کیا ہے۔ پلیز آپ حقیقت سے انکار نہ کریں۔"

"ہم انکار نہیں کریں گے، ہمیں بتاؤ کہ تمہیں یہ بات کیسے معلوم ہوئی؟"

"جس نے بتایا اس نے مہربانی کی۔ میں نہیں چاہتی کہ کسی مہربان پر آپ ناراض رہیں۔"

"ہم تمہیں صدمہ پہنچانے والی بات نہیں بتانا چاہتے تھے۔ کسی نے بتا کر تمہارا دل دکھایا۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ ایک شخص جسے صدمہ پہنچانے والی بات سمجھتا ہو وہ دوسرے کے لیے مہربانی ہوتی ہے۔"

"ناناجان! میں اتنا جانتی ہوں کہ کسی کو حقائق سے بے خبر نہیں رکھنا چاہیے۔"



"یعنی ہم خطاکار ہیں، ہم نے بے خبر رکھا۔ وہ مہربان ہے جس نے تمہارا دل توڑنے والی بات بتائی۔ کیا تم ہمیں اس سے کمتر بنا رہی ہو؟"

"آپ کسی سے کمتر نہیں ہو سکتے۔ میں یہ بات سمجھتی ہوں کہ آپ اپنی نواسی کا دل نہیں دکھانا چاہتے تھے۔"

انہوں نے مسکرا کر اسے دیکھا پھر لکھا۔ "اچھا اب بتاؤ تمہیں کس نے تمہاری ممی کے بارے میں بتایا ہے؟"

"جو دشمن ہیں وہی طعنہ دیتے ہیں۔ روبی نے میری توہین کرنے کے لیے ایک کاغذ پر لکھا تھا کہ میری ممی کو اغوا کیا گیا ہے۔ پھر اس نے اپنی اس تحریر کو جلا دیا تھا تاکہ میں اس سلسلے میں اسے کوئی الزام نہ دے سکوں۔ بہرحال اس نے اپنے طور پر ممی کی توہین کی لیکن مجھے حقیقت بتا کر مہربانی کی ہے۔"

یہ غصے میں آنے والی بات تھی۔ انہوں نے غصہ برداشت کرتے ہوئے لکھا۔ "ہم نے تم سے وعدہ کیا ہے لہٰذا اس مہربانی کرنے والی دشمن پوتی سے کچھ نہیں کہیں گے۔ ویسے بھی وہ اپنے والدین کے ساتھ یہاں سے جانے والی ہے۔ اچھا ہے خس کم جہاں پاک۔"

وہ اٹھ کر غسل کرنے کے لیے باتھ روم کی طرف جانے لگے۔ اسی وقت موبائل فون نے متوجہ کیا۔ انہوں نے بیڈ کے سرہانے آ کر وہاں سے موبائل فون اٹھایا پھر اسے آن کرتے ہوئے کہا۔ "ہیلو! ہم بول رہے ہیں۔"

دوسری طرف سے بیرسٹر طاہر نقوی نے کہا۔ "جناب عالی! ابھی آپ کے صاحب زادے رحمت شاہ نے فون کر کے مجھے طلب کیا ہے اشارتاً کہا ہے کہ سنجیدہ معاملہ ہے لہٰذا میں چند کورٹ پیپرز اور اپنی مہر لے کر آؤں۔ میں نے یہ مناسب سمجھا کہ پہلے آپ سے اجازت حاصل کرلوں۔"

"دونوں بیٹوں نے ہمیں چھوڑ کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ اپنی ذاتی کوٹھیوں میں رہنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ ہمیں اس بڑھاپے میں چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ ہم اپنی زندگی میں ہی ان رشتوں سے انکار کرنا چاہتے ہیں۔ آپ یہاں آ کر دونوں بیٹوں سے اسٹامپ پیپرز پر

لکھوائیں کہ وہ ہمیں چھوڑ کر جانے کے بعد باپ کے طور پر ہمارا نام استعمال نہیں کریں گے۔ وہ پورے ہوش و حواس میں رہ کر ہم سے علیحدگی اختیار کر رہے ہیں لہٰذا ہماری موت کے بعد نہ ہمارے جنازے کو کاندھا دیں گے اور نہ ہی ہماری چھوڑی ہوئی منقولہ وغیر منقولہ جائیداد کے حق دار رہیں گے۔ آپ یہاں تشریف لائیں۔ دونوں بیٹوں کے تحریری بیانات کے بعد ہم ایک وصیت لکھیں گے۔"

وہ فون بند کر کے باتھ روم میں چلے آئے۔ شہناز نے حقے کا پلگ لگایا۔ ہیٹر آن ہو گیا۔ نانا اور نواسی نے اب تک تحریر کے ذریعے جو گفتگو کاغذات پر کی تھی وہ ان کاغذات کو ایک ایک کر کے ہیٹر کی آگ میں جلانے لگی۔

★============★============★

انیکسی کے ایک کمرے میں صداقت علی ایک صوفے پر بیٹھا تھا۔ دوسرے صوفوں پر اس کے خاص ماتحت بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے ایک انٹیلی جنس افسر سے کہا۔ "میری وائف نے فون پر جو خط پڑھ کر سنایا اس سے یقین کی حد تک شبہ ہوتا ہے کہ دوسری ایجنسی کے گاڈ فادر نے اس کو اغوا کیا ہے۔"

افسر نے پوچھا۔ "سر! وہ چاہتا کیا ہے؟"

صداقت علی نے کہا۔ "میرا استعفیٰ۔ اس نے دھمکی دی ہے کہ میں نے یہ شعبہ نہ چھوڑا تو میری بیوی مجھے صحیح سلامت نہیں ملے گی۔ میری ایک جوان بیٹی ہے۔ یہ بڑے لوگوں کی سرپرستی میں پرورش پانے والے مجرم حد سے بڑھ رہے ہیں۔ ان کی وارننگ ہے کہ میں بیٹی کو لے کر لندن چلا جاؤں۔ میری بیوی کو کسی دوسری فلائٹ سے میرے پاس پہنچا دیا جائے گا۔"

"واقعی یہ مجرم تو انتہا کر رہے ہیں۔ آپ جیسے طاقت ور افسر کی بیوی اور بیٹی تک پہنچ رہے ہیں۔"

"مجھ سے استعفیٰ دلانے اور مجھے اپنے فرائض کی ادائیگی سے دور رکھنے کا یہی ایک راستہ ان کے پاس ہے۔"

"یہاں کے تمام بااختیار اور وسیع ذرائع رکھنے والے مجرم آپ کے سامنے اس قدر



بے بس ہو گئے ہیں کہ آپ کو پاکستان سے نکل جانے پر مجبور کر رہے ہیں۔"

صداقت علی نے ایک افسر کو ایک کاغذ پیش کرتے ہوئے کہا۔ "یہ میرا استعفیٰ ہے۔"

"استعفیٰ؟" سب نے حیرانی سے اسے دیکھا۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ فولادی ارادے رکھنے والا ان کا ڈائریکٹر جنرل اتنی جلدی میدان چھوڑ دے گا۔

صداقت نے کہا۔ "آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں ایک عورت کی خاطر اپنے فرائض سے منہ موڑ رہا ہوں لیکن وہ عورت جب اپنے گھر کی عزت ہو' اپنی اولاد کی ماں ہو تو ہم قانون کے محافظ دو راہے پر آ جاتے ہیں۔ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب ہم اپنے گھر کی عزت اور آبرو کی حفاظت کرنے میں ناکام رہیں گے تو پھر اپنے وطن کے عزت اور وقار کو کس طرح قائم رکھیں گے۔"

ایک ماتحت نے کہا۔ "جی ہاں! ہم جان ہتھیلی پر رکھ کر بڑے بڑے بدنام زمانہ مجرموں سے ٹکرا جاتے ہیں۔ ہم سے پہلے کتنے ہی فرض شناس افسران نے جان کی قربانیاں دی ہیں لیکن ہمیں کیا حق پہنچتا ہے کہ ہم اپنی بیوی بیٹیوں اور بہنوں کی بھی جان اور ان کی عزت آبرو کو داؤ پر لگائیں۔"

"فوج' پولیس' انٹیلی جنس ڈپارٹمنٹ اور ہر اس شعبے میں جہاں جان کا خطرہ ہوتا ہے۔ جہاں بیوی بچوں کی سلامتی مشکوک ہو جاتی ہے وہاں فرض کی ادائیگی کی ذمہ داریاں قبول کرنے سے پہلے اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ ہم اپنے پورے خاندان کو داؤ پر لگا رہے ہیں۔"

صداقت علی نے کہا۔ "میں نے شادی کی رات اپنی بیوی سے کہا تھا' میں قانون کا محافظ ہوں لیکن شوہر کی حیثیت سے تمہارا مکمل محافظ نہیں ہوں۔ تم آج سے میرے ساتھ تلوار کی دھار پر چلا کرو گی۔ اس نے میری بات کو مسکرا کر تسلیم کیا۔ جانتے ہو کیوں؟"

سب نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اس نے کہا۔ "اس لیے کہ وہ پیر عظمت اللہ شاہ سلطانی کی بیٹی ہے۔ وہ جانتی تھی کہ جہاں قانون کے محافظ بے بس ہو جاتے ہیں

وہاں صرف گاڈ فادر کا بس چلتا ہے۔"

افسر نے کہا۔ "آپ کے سسر اپنی بیٹی کو پاتال سے بھی نکال کر لا سکتے ہیں۔"

"ہاں مگر وہ بھی کشمکش میں ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ یہ قرض نادہندگان میں سے کسی کی مجرمانہ حرکت ہے۔ وہ سودے بازی میں وقت ضائع کر رہے ہیں اور میرے پاس صرف آج پانچ بجے تک کا وقت ہے۔ ہمارا دفتر پانچ بجے بند ہوتا ہے۔ آپ میرا یہ استعفیٰ پانچ بجے سے چند منٹ پہلے منظور کرائیں گے۔"

"یعنی آپ پانچ بجے تک اپنی بیوی کو تلاش کرنا چاہتے ہیں اگر وہ مل جائیں گی تو یہ استعفیٰ پیش نہیں کرنا چاہیں گے۔"

"ہاں اگر بیوی کا سراغ نہ ملا تو استعفیٰ پیش کرنے کے علاوہ اخبارات میں یہ خبر شائع کرانی ہوگی کہ میرا استعفیٰ منظور ہوگیا ہے اور میں کل شام کی فلائٹ سے اپنی بیٹی کے ساتھ لندن جا رہا ہوں۔"

"سر! خدا نے چاہا تو ایسا نہیں ہوگا۔ ہم سب آج شام پانچ بجے تک آپ کی وائف کو تلاش کریں گے۔"

"میں نے اسی لیے آپ لوگوں کو یہاں بلایا ہے۔ آپ اپنے اپنے طور پر سراغ لگانے کی کوشش کریں۔ پچھلی رات میری بیوی نے موبائل فون کا جو کوڈ نمبر استعمال کیا تھا اس سے ظاہر ہوگیا کہ وہ کراچی میں ہے۔"

وہ سب اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ افسر نے کہا۔ "سر! ہم وقت ضائع نہیں کریں گے۔ ابھی یہاں سے نکل کر ان کا سراغ لگانے کے لیے اپنے تمام ذرائع استعمال کریں گے۔"

صداقت ان کے ساتھ انیکسی کے برآمدے میں آیا۔ وہ سب اس سے مصافحہ کر کے رخصت ہو گئے۔ اس نے کوٹھی کی طرف دیکھا۔ شہناز ایک ٹرے میں ناشتہ اور چائے لے کر آ رہی تھی۔ وہ مسکرانے لگا۔ وہ بھی برآمدے میں آکر مسکرائی پھر دونوں باپ بیٹی کمرے میں آگئے۔ سینٹر ٹیبل پر ٹرے رکھنے کے بعد وہ ایک ہی صوفے پر بیٹھ گئے۔ پھر بیٹی نے چپکے سے ایک تہ کیا ہوا کاغذ باپ کی طرف بڑھایا۔ باپ نے کاغذ لے کر کھڑکی کی



طرف دیکھا۔ وہاں مسلح گارڈ کی ڈیوٹی بدل گئی تھی۔ دوسرا گارڈ کھڑا ہوا تھا۔

صداقت اس کاغذ کو جیب میں رکھ کر وہاں سے اٹھ کر باتھ روم میں چلا آیا۔ وہاں واش بیسن کے آئینے کے پاس تہ کیے ہوئے کاغذ کو کھول کر پڑھنے لگا۔

آئینے میں وہی نظر آتا ہے جو آئینے کے مقابل ہوتا ہے۔ صداقت کاغذ کے جس رخ کو پڑھ رہا تھا اس کا پچھلا حصہ آئینے میں نظر آ رہا تھا۔ اس پر شہناز کے ہاتھ کی تحریر تھی۔ آئینے میں الٹی تحریر دکھائی دے رہی تھی۔ اگر اسے سیدھا پڑھنے کی کوشش کی جاتی تو بیٹی نے باپ کو اطلاع دی تھی کہ باپ بیٹوں کے درمیان شدید اختلافات پیدا ہو گئے ہیں' دونوں بیٹے اپنے بیوی بچوں کے ساتھ اپنے باپ کو چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کا بیرسٹر طاہر نقوی ابھی آنے والا ہے۔

کاغذ کے دوسری طرف بھی کچھ لکھا تھا جسے صداقت پڑھ رہا تھا۔ چونکہ وہ تحریر صداقت کے مقابل تھی' آئینے کے مقابل نہیں تھی اس لیے نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ پڑھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی طاری ہو رہی تھی پھر وہ نظریں اٹھا کر آئینے میں اپنے عکس کو سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔

اس کے تصور میں وہ آئینہ چٹخ گیا۔ اس کے درمیان لکیر پڑ گئی۔ وہ دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ رشتے بھی چٹخ رہے تھے' ٹوٹ رہے تھے' بکھر رہے تھے۔ ایسا تو ہوتا ہی ہے لیکن اس نے نہیں سوچا تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔

★============★============★

کوٹھی کے بڑے ہال میں ان تمام خون کے رشتوں کے درمیان بیرسٹر طاہر نقوی بیٹھا پیر شاہ سلطانی کے دونوں بیٹوں سے بیانات لکھوا رہا تھا اور وہ الگ الگ کورٹ پیپرز پر لکھ رہے تھے۔ خون کے رشتوں کو چھری کی بجائے قلم سے کاٹ رہے تھے۔

بیگم ریحانہ برکت نے اپنے بچوں سے کہا۔ "روبی! جمشید! اپنے کمروں میں جاؤ اور سامان پیک کرو۔"

وہ دونوں اٹھنے لگے۔ دادا جان نے حقے کا کش لگایا پھر ان سے کہا۔ "بیٹھ جاؤ۔ ابھی یہاں سے کوئی نہیں جائے گا۔ تمہارے باپ اور چچا جو کچھ لکھ رہے ہیں اس پر

تمہاری ماں اور چچی کے علاوہ تم دونوں کے بھی تائیدی دستخط ہوں گے تاکہ بیٹوں کے بعد کوئی بہو ادھر نہ آئے اور تم میں سے کوئی پوتا اور پوتی کا رشتہ نہ جتائے۔"

روبی اور جمشید نے اپنی ممی کی طرف دیکھا لیکن دادا کے گھر میں تھے لہٰذا ان کے حکم کے مطابق بیٹھ گئے۔ ایک سیکیورٹی گارڈ نے آکر اطلاع دی۔ "جناب عالی! ڈاکٹر عارف مدنی تشریف لائے ہیں۔"

پیر شاہ سلطانی نے کہا۔ "انہیں یہاں آنے دو۔"

گارڈ چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں ایک معمر ڈاکٹر ہاتھ میں بیگ لیے ہوئے آیا۔ پیر شاہ سلطانی نے اٹھ کر اس سے مصافحہ کیا پھر کہا۔ "آپ کی تشریف آوری کا شکریہ۔ آپ یہاں کے نہایت معروف، معتبر اور مستند ڈاکٹر ہیں۔ ہم نے اس لیے زحمت دی ہے کہ ایک اہم وصیت لکھنے والے ہیں اس سے پہلے آپ ہمارا طبی معائنہ کر کے یہ سرٹیفکیٹ لکھ دیں کہ ہم جسمانی اور ذہنی طور پر صحت مند ہیں اور پورے ہوش وحواس میں رہ کر وصیت نامہ لکھ رہے ہیں۔"

ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا۔ "جناب پیر صاحب آپ تو اس عمر میں بھی خاصے جوان لگتے ہیں۔ ویسے آپ کے بیرسٹر صاحب کی گواہی کافی ہوتی لیکن آپ ہر معاملے میں بڑے محتاط رہنے کے عادی ہیں۔"

ڈاکٹر عارف مدنی بیگ کھولنے کے بعد ان کا بلڈ پریشر وغیرہ چیک کرنے لگا اور کہنے لگا۔ "یہاں آپ کے خاندان کے تمام افراد موجود ہیں لیکن سب خاموش ہیں۔ کیا کوئی سنجیدہ معاملہ ہے؟"

"ہم آپ کی اس بات کا جواب ضرور دیں گے۔ پہلے آپ ہیلتھ سرٹیفکیٹ دے دیں۔"

ڈاکٹر سینٹر ٹیبل پر اپنا لیٹر پیڈ رکھ کر لکھنے لگا۔ پیر عظمت اللہ شاہ سلطانی نے بھی ایک کورٹ پیپر لے کر وصیت لکھی۔ اتنی بڑی کوٹھی میں سب ہی موجود تھے مگر ایسے خاموش تھے جیسے سب پر سکتہ طاری ہو گیا ہو۔

سنی دروازہ کھول کر اس بڑے سے ہال میں آیا۔ اس کی والدہ بیگم سلمیٰ رحمت



اسے دیکھ کر پوچھا۔ "یہ تمہارے سر میں اور ہاتھوں میں مٹی کیسی ہے؟ کہاں سے آ رہے ہو؟"

اس نے کہا۔ "میں نے سوچا گھر میں سب وصیتیں لکھ رہے ہیں مجھے باہر لکھنا چاہیے۔ باہر ایسی مٹی تھی کہ کچھ نہ پوچھیں۔ میں ابھی غسل کر کے آتا ہوں۔"

وہ اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ ماں نے کہا۔ "عجیب سر پھرا لڑکا ہے' کسی بات کا سیدھی طرح جواب نہیں دیتا ہے۔"

بیرسٹر طاہر نقوی نے کہا۔ "جناب پیر صاحب آپ کا وصیت نامہ اور دونوں صاحب زادوں کی تحریریں میرے پاس ہیں۔ ڈاکٹر عارف مدنی نے بھی آپ کو صحت مند اور نارمل ہونے کا سرٹیفکیٹ دیا ہے۔ اب آپ حضرات ایک دوسرے کی تحریریں پڑھ کر دستخط کریں۔"

وہ سب پڑھنے لگے۔ ڈاکٹر نے وصیت نامہ اور ان کے بیٹوں کا علیحدگی نامہ پڑھ کر حیرانی سے پوچھا۔ "جناب پیر صاحب! یہ گھر کیوں ٹوٹ رہا ہے؟"

پیر شاہ سلطانی نے کہا۔ "ابھی آپ نے پوچھا تھا کہ تمام افراد کی موجودگی میں ایسی خاموشی کیوں ہے۔ اب آپ کو سمجھ لینا چاہیے کہ ماتمی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ آپ نے برکت اور رحمت کی بھی تحریریں پڑھ لیں۔ انہوں نے واضح طور سے لکھا ہے کہ یہ اپنی خوشی سے اور اپنی مرضی سے علیحدگی اختیار کر رہے ہیں۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک ہرے بھرے خاندان کے اجڑنے اور بکھرنے کا سرٹیفکیٹ دینے اور ایسی تحریروں پر گواہ کی حیثیت سے دستخط کرنے آیا ہوں۔"

انہوں نے کہا۔ "ایسا ہوتا ہے۔ جو ہم نہیں سوچتے وہ ہو جاتا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہم نے ساری عمر جدوجہد کر کے ایسی دولت اور ایسے لامحدود اختیارات حاصل کیے ہیں جو ترقی پذیر ممالک کے حکمرانوں کو بھی حاصل نہیں ہوتے لیکن بڑھاپے میں انسان کا صرف ایک ہی بڑا سرمایہ ہوتا ہے اور وہ سرمایہ ہے سعادت مند اولاد۔ ہم نے اولاد کو اپنے قابو میں رکھنے اور انہیں لگام دینے کی بڑی کوششیں کیں لیکن مقدر سے کون لڑ سکتا

ہے اب یہ جوان بچے بوڑھے باپ کو کاندھا دینے سے پہلے چلے جائیں گے۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "آپ مایوسی کی باتیں نہ کریں۔ کاندھا مُردوں کو دیا جاتا ہے۔ آپ انشاء اللہ ایک لمبی عمر گزاریں گے۔"

"ڈاکٹر! آپ ہمیں ڈیتھ سرٹیفکیٹ نہیں دیں گے، ہمیں مُردہ تسلیم نہیں کریں گے لیکن ہمارے پاس اپنی موت کا ثبوت ہے۔ آپ دیکھیں، ہماری آنکھوں میں ایک آنسو نہیں ہے۔ یہی موت کی پہچان ہے۔ مُردے کبھی نہیں روتے۔"

ڈاکٹر عارف مدنی نے کہا۔ "جب ہمارا جوان بیٹا چھوڑ کر گیا تھا تو ہم بھی کچھ ایسا ہی محسوس کر رہے تھے لیکن خود کو مُردہ نہیں سمجھ رہے تھے۔ آج یہ تسلیم کرتے ہیں کہ صرف سانسیں لینے کا نام زندگی نہیں ہے۔ آنکھ سے آنسو مرجائے تو آدمی سانس لیتے مرا رہتا ہے۔"

بیٹے، بہو، پوتا اور پوتی سب ہی تینوں کاغذات پر تائیدی دستخط کر رہے تھے اور اپنا اپنا سامان سمیٹتے جا رہے تھے۔ راستے بدل گئے تھے۔ نئی منزل کی طرف جانا تھا۔ پیر عظمت اللہ شاہ سلطانی نے کہہ دیا تھا کہ اس کوٹھی سے جس قدر سامان لے جا سکو لے جاؤ اور ایک ہی وقت میں لے جاؤ۔ دوسری بار سیکیورٹی گارڈز ان میں سے کسی کو کوٹھی کے احاطے میں قدم نہیں رکھنے دیں گے۔

برکت شاہ، رحمت شاہ اور جمشید ہلکا اور بھاری سامان اٹھا اٹھا کر کوٹھی کے باہر لے جا کر رکھ رہے تھے۔ چونکہ ان سے کوئی رشتہ نہیں رہا تھا اس لیے کسی ملازم یا سیکیورٹی گارڈ کو ان کا سامان اٹھانے کی اجازت نہیں تھی۔

سنی غسل کرنے کے بعد لباس تبدیل کر کے آ گیا۔ بیرسٹر طاہر نقوی نے کہا۔ "ان تینوں کاغذات پر سب کے دستخط ہو چکے ہیں، تم بھی دستخط کر دو۔"

سنی نے کھڑکی کے پاس آ کر اس کے پردے کو سرکا کر ایک طرف کر دیا پھر کہا۔ "میں نے بھی باہر ایک وصیت لکھی ہے۔ پہلے اس پر دستخط چاہتا ہوں۔"

پیر عظمت اللہ شاہ سلطانی، بیرسٹر، ڈاکٹر، برکت شاہ اور رحمت شاہ نے اس بڑی سی کھڑکی کے باہر دیکھا۔ سنی نے کہا۔ "اس بڑے آہنی گیٹ کے باہر میں نے وہ خیمہ لگایا



ہے۔ آج سے میری رہائش وہیں رہے گی۔"

دادا نے پوچھا۔ "یہ کیا تُک ہے؟ کوئی نئی شرارت کر رہے ہو؟"

"نہیں۔ میں آپ کی کوٹھی کے باہر آپ کے سامنے رہوں گا۔ آپ کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔"

اس کے باپ رحمت شاہ نے کہا۔ "جب کوٹھی سے باہر ہو گئے ہو تو ہمارے ساتھ چلو۔"

"آپ میری سعادت مندی دیکھیں۔ آپ نے کوٹھی چھوڑی، میں نے بھی چھوڑ دی لیکن سوچتا ہوں کس رشتے سے آپ کے ساتھ رہوں۔"

"کیا بکواس کرتے ہو۔ میں تمہارا باپ ہوں۔"

"جس باپ کا باپ نہ ہو۔ وہ میرا باپ کیسے ہو سکتا ہے؟"

ماں نے کہا۔ "کیا تیرا دماغ چل گیا ہے۔ میں تیری ماں ہوں۔ میں نے تجھے پیدا کیا ہے؟ میں گواہی دیتی ہوں کہ یہ تیرے باپ ہیں۔"

"دنیا کا کوئی باپ، دادا کے بغیر پیدا نہیں ہوا اور انہوں نے تحریری بیان دیا ہے کہ آئندہ اپنے باپ کا نام استعمال نہیں کریں گے اور ان کے باپ نے انہیں عاق کر دیا ہے۔ گویا ولدیت سے محروم کر دیا ہے تو پھر میرا شمار کس رشتے سے ہو رہا ہے؟"

پیر عظمت اللہ شاہ سلطانی نے کہا۔ "ہم تمہیں بچپن سے پسند کرتے آئے ہیں۔ ہمارا کسی سے رشتہ ہو یا نہ ہو مگر تم سے رہے گا۔ تم ہمارے پوتے ہو۔"

"سوری دادا جان! جب تک بیٹا نہ ہو، تب تک پوتا پیدا نہیں ہوتا۔ آپ کا تو کوئی بیٹا نہیں ہے پھر یہ بیچارہ پوتا کہاں سے آ گیا؟"

انہوں نے غصے سے کہا۔ "اے لڑکے! کیوں میرا دماغ خراب کر رہا ہے؟ ان بے مروتوں کے ساتھ جانا ہے تو جا یا پھر اس کوٹھی میں رہ جا۔"

"میں اس خیمے میں رہوں گا۔ اس عظیم ہستی کی کوٹھی کے سامنے جو کبھی میرا کہلاتا تھا۔ کچھ فاصلے پر باپ کہلانے والے شخص کی کوٹھی ہے۔ میں دونوں کے درمیان رہوں گا۔ اکثر مکانوں کے دروازے پر نام کی تختی لگی ہوتی ہے۔ میرے خیمے کے سامنے

کس کے نام کی تختی ہو گی۔ یہ میرا خیمہ ہے' میرے نام کی تختی ہو گی مگر مجھے اپنا نام لکھے ہوئے شرم آئے گی کیونکہ دنیا والوں کی بری عادت ہے' نام کے ساتھ باپ دادا کا نام بھی پوچھتے ہیں۔"

دادا نے پوچھا۔ "احمق لڑکے! تم کتنے عرصے اس خیمے میں رہو گے؟"

"جب تک اس خیمے کے سامنے باپ اور دادا کے نام کی تختی نہیں لگائی جائے گی جب تک مجھے میری مکمل شناخت نہیں ملے گی۔"

اس نے خیمے کی سمت انگلی اٹھا کر کہا۔ "وہ زیرو پوائنٹ ہے حضرت آدم علیہ السلام جس زیرو پوائنٹ سے آئے تھے وہاں ان کے باپ دادا نہیں تھے۔ ان سے پہلے نسل انسانی کا کوئی شجرہ نہیں تھا۔ آج میرے بزرگوں نے مجھے اسی زیرو پوائنٹ پر پہنچا دیا ہے۔"

وہ ان سے دور جاتے ہوئے بولا۔ "میں احتجاج کرتا ہوں اور اپنے بزرگوں سے اپنی شناخت کا مطالبہ کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے صرف حضرت آدم علیہ السلام کو شجرے کے بغیر شناخت دی۔ باقی تمام آدم زاد شجرے کے محتاج ہیں۔ میں جا رہا ہوں۔ جب تک مجھے شجرے کا سایہ نہیں ملے گا میں اس زیرو پوائنٹ کے خیمے میں رہوں گا۔"

وہ بولتا ہوا کوٹھی کے باہر چلا گیا۔ تمام افراد گم صم کھڑے اس دروازے کو دیکھتے رہے جہاں سے وہ گزر کر گیا تھا۔ اس نے جس انداز سے خون کے رشتوں اور جذبوں کو جھنجھوڑا تھا اس سے یہی توقع کی جا سکتی تھی کہ مثبت پہلو سے انسانی احساسات بیدار ہوں گے لیکن سنی کوئی پہلا دانشور یا مبلغ نہیں تھا۔ اس سے پہلے لاکھوں کروڑوں حساس مبلغ خوابیدہ ضمیر کو جھنجھوڑنے کی ناکام کوششیں کر کے دنیا سے جا چکے ہیں۔ آدمی جب انا اور خودغرضی کے سائے میں سوتا ہے تو پھر جاگنا نہیں چاہتا۔ بیداری صرف اسے ملتی ہے جس سے خدا راضی ہوتا ہے۔ بیٹے' بہو' پوتا' پوتی سب کے سب نظریں چراتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔

کراچی صرف انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر نہیں ہے' دھواں اڑاتی ہوئی گاڑیوں کا بھی لہر لہر سمندر ہے۔ ٹیکسیاں' رکشے' بسیں' کوچز' مال بردار ٹرک' واٹر ٹینکرز



اور آئل ٹینکرز وغیرہ سمندری لہروں کی طرح کچھ یوں غضب ناک رہتی ہیں کہ سڑکوں کے علاوہ فٹ پاتھ پر بھی بپھرتی ہوئی لہریں سیلابی انداز میں یہاں کے باشندوں کو للکارتی ہیں' تم رہو گے یا ہم..........

باشندوں کو تو یہ چیلنج قبول کر کے رہنا ہی پڑتا ہے کیونکہ یہ بندہ پرور شہر ہے۔ یہ شہر دن کے وقت شاید کچھ لوگوں کو بھوکا رکھتا ہو لیکن کسی کو بھوکا نہیں سلاتا۔ یہاں کی چند شاہراہیں ایسی ہیں جہاں ٹریفک کا زوروشور کم ہوتا ہے۔ ان شاہراہوں پر حادثات کا اندیشہ کم رہتا ہے اس لیے تاجروں' وڈیروں' سیاستدانوں اور دست غیب سے امیروکبیر بننے والوں کی نہایت بیش قیمت کاریں اور پجیرو وغیرہ حفاظت سے ایسی راہوں پر سے گزرتی رہتی ہیں۔

ایسی شاہراہیں دولت مند افراد کے لیے جتنی محفوظ رہتی ہیں' اتنی ہی پولیس والوں کے لیے دردسری بنی رہتی ہیں کیونکہ مجرموں کو ہوائی جہاز کی رفتار سے گاڑیاں چلا کر بہ آسانی فرار ہونے کے مواقع ملتے رہتے ہیں۔ پیر عظمت اللہ شاہ سلطانی کی پجیرو ایسی ہی تیزرفتاری سے جا رہی تھی۔ جب وہ اپنوں اور غیروں سے چھپ کر کسی اہم معاملے کو نمٹانے کے لیے کسی خاص جگہ جاتے تھے تو صرف اسی پجیرو کی پچھلی سیٹ پر اپنے خاص ڈرائیور اور باڈی گارڈ کے ساتھ ایسے ہی قدرے ویران راستوں سے گزرتے تھے اور بار بار پیچھے سر گھما کر دیکھتے تھے کہ کوئی چالاکی سے تعاقب تو نہیں کر رہا ہے۔

صداقت علی تعاقب کر رہا تھا اور کار ٹیلی فون کے ذریعے کہہ رہا تھا۔ "آگے کئی موڑ ہیں۔ پجیرو کہیں بھی مڑ سکتی ہے۔ ہر موڑ پر ہماری جو گاڑیاں کھڑی ہیں ان سب سے برابر رابطہ رکھو۔ جہاں پجیرو راستہ بدلے' وہاں کے موڑ پر ہماری ایک گاڑی اس کا تعاقب کرے گی۔ میں اس کا تعاقب چھوڑ کر سیدھے راستے پر ڈرائیو کرتا چلا جاؤں گا۔ اس طرح انہیں ہم پر شبہ نہیں ہو گا۔"

ایک گول چوراہے کے پاس انٹیلی جنس والوں کی دو گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ ان گاڑیوں میں ٹیلی فون اور وائرلیس سیٹ وغیرہ لگے ہوئے تھے۔ ایک ماتحت افسر ہاتھ میں مائیک پکڑے کہہ رہا تھا۔ "آل رائٹ سر! تعاقب کے دوران ہر موڑ پر ہماری گاڑیاں

بدلتی رہیں گی۔ پیر صاحب کو کسی طرح کا شبہ نہیں ہو گا۔"

صداقت نے اپنے تجربے کے مطابق درست کہا تھا۔ وہ پجیرو آگے جا کر دوسرے راستے پر مڑ گئی تھی۔ وہ پجیرو کے پیچھے نہیں گیا۔ اب دوسری گاڑی تعاقب کر رہی تھی۔ پیر شاہ سلطانی نے مڑ کر دیکھا۔ انہیں جس گاڑی پر شبہ ہوا تھا' وہ سیدھے راستے پر چلی گئی تھی۔ کسی دوسری گاڑی پر وہ شبہ نہیں کر سکتے تھے کیونکہ اگلے موڑ سے تیسری گاڑی ان کے تعاقب میں چل پڑی تھی۔

صداقت نے اپنے راستے پر آگے جا کر کار روک دی۔ کار ٹیلی فون کے ذریعے کہا۔ "میں اپنی کار میں رہوں گا۔ کوئی نئی تبدیلی یا پرابلم ہو تو فون پر اطلاع دینا۔"

اس نے فون بند کر دیا کیونکہ اسے ہاجرہ کے فون کا انتظار تھا۔ جس نے اسے اغوا کر کے حبس بے جا میں رکھا تھا اس نے ہاجرہ کو موبائل فون نمبر دے کر اس فون سے رابطے کا نمبر نہیں بتایا تھا۔ اس طرح صرف ہاجرہ اس فون کے ذریعے بات کر سکتی تھی۔ صداقت کو اگر یہ نمبر معلوم ہوتا تو وہ معلوم کر لیتا کہ اس نمبر والا فون کس کی ملکیت ہے۔ ہاجرہ نے صبح فون پر بتایا تھا کہ وہ بعد میں کسی وقت فون کرے گی۔ وہ اسی فون کا منتظر تھا۔ کار ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے ریسیور اٹھا کر کہا۔ "ہیلو! رپورٹ ہے؟"

"سر! پجیرو ہاکس بے کے راستے پر جا رہی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ تعاقب کرنے والوں سے کہو کہ بہت محتاط رہیں۔ اس راستے پر گاڑیاں کم چلتی ہیں۔ ہمارے آدمی گاڑیاں بدلتے رہیں۔ دور ہی سے معلوم کریں کہ گاڑی کہاں جا کر رکے گی۔"

اس نے فون بند کر دیا۔ چند منٹ کے بعد موبائل فون نے اسے متوجہ کیا۔ اس نے بٹن دبا کر کہا۔ "ہیلو' میں صداقت بول رہا ہوں۔"

"میں ہاجرہ ہوں۔ آپ کہاں ہیں؟"

"میں اپنی کار میں ہوں اور ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ کیا تم کسی کھڑکی روشن دان سے جھانک کر اس جگہ کو پہچان سکتی ہو؟"



"انہوں نے مجھے کسی کوٹھی کے اندرونی کمرے میں قید کیا ہے۔ میں پہلے کہہ چکی ہوں کہ کھڑکیاں اور دروازے بند رکھے جاتے ہیں۔ میں تو کہتی ہوں' آپ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔ میری وجہ سے آپ کو یہ ملک چھوڑنے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔"

"تم جانتی ہو کہ میں ساتھ چھوڑ کر بھاگنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ اگر تمہیں تلاش نہ کر سکا تو کل شام تک تمہیں پانے کے لیے بیٹی کو لے کر لندن چلا جاؤں گا۔"

"مجھے آپ کی محبت پر ناز ہے۔ آپ میری خاطر اتنی بڑی ملازمت اور اپنے وطن کو چھوڑ کر جانا چاہتے ہیں۔"

"میں تمہاری رہائی کے لیے سب کچھ کر سکتا ہوں۔ جس نے تمہیں یرغمال بنا کر رکھا ہے' اس نے وعدہ کیا ہے کہ ہمارے لندن پہنچتے ہی تمہیں بھی ہمارے پاس پہنچا دے گا لیکن یہ سوچ کر پریشان ہو جاتا ہوں..........." اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

ہاجرہ نے پوچھا۔ "کہ؟"

"تم اپنے ابا حضور سے زیادہ عرصے دور نہیں رہتی ہو۔ اگر مہینے دو مہینے میں ان سے ملاقات کرنے یہاں آؤ گی تو دشمن یہ شبہ کر سکتے ہیں کہ میں بھی تمہارے پیچھے آیا ہوں۔"

"میں یہاں نہیں آیا کروں گی۔ ابا حضور کو اپنے پاس بلا لیا کروں گی۔ وہ مجھے اتنا چاہتے ہیں کہ میری ایک آواز پر چلے آئیں گے۔"

"تمہارے لیے ان کی چاہت میں شبہ نہیں ہے لیکن وہ شاید نہیں آ سکیں گے کیونکہ وہ یہاں تنہا رہ گئے ہیں۔ تمہارے دونوں بھائیوں' بھابیوں' روبی اور جمشید نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ وہ سب اپنے محترم بزرگ کو چھوڑ کر کوٹھی سے چلے گئے ہیں۔"

"خدا نہ کرے ایسا ہو۔ آپ کو غلط اطلاع ملی ہو گی۔ میرے دونوں بھائی ایسے بے ضمیر نہیں ہو سکتے کہ اس بڑھاپے میں باپ کو تنہا چھوڑ دیں۔"

"میری بات کا بھروسا نہیں ہے تو تصدیق کر لو۔ تمہارے پاس فون ہے۔"

"میں نے کل رات ابا حضور سے بات کی تھی۔"

"رات سے صبح تک کا فاصلہ بہت ہوتا ہے۔ صبح ہونے تک خون کے رشتوں میں

فاصلے پیدا ہو جاتے ہیں۔ میں نے تو سنا ہے کہ انہوں نے بیٹوں کو عاق کر دیا ہے۔ انہیں اپنی ولدیت سے' اپنی دولت سے محروم کر دیا ہے۔"

"میں ابھی فون کر کے معلوم کروں گی۔"

"ضرور معلوم کرو۔ تصدیق ہو جائے تو اس پہلو پر بھی غور کرنا کہ جو باپ تنہا رہ گیا ہے' اسے چھوڑ کر میرے پاس لندن کیسے آؤ گی؟ نہیں آؤ گی تو دشمن اپنی دشمنی برقرار رکھے گا۔ ان حالات میں میرا استعفیٰ دینا' ملازمت اور ملک چھوڑنا کیا مناسب ہوگا؟"

"آپ نے مجھے ایک نئی الجھن میں مبتلا کر دیا ہے۔ پلیز میرا انتظار کریں۔ ابھی میں ابا حضور سے بات کرنے کے بعد پھر آپ سے رابطہ کروں گی۔"

ہاجرہ نے رابطہ ختم کر دیا۔ صداقت اپنی کار ڈرائیو کرتا جا رہا تھا۔ ہر پندرہ بیس منٹ کے بعد کار ٹیلی فون کے ذریعے اپنے ماتحتوں سے رابطہ کر رہا تھا۔ پھر ہاجرہ نے موبائل فون پر مخاطب کیا۔ اس نے پوچھا۔ "کیا میری اطلاع کی تصدیق ہو گئی؟"

"جی ہاں۔ آپ نے درست کہا تھا۔ آپ خیال نہ کریں۔ میں آپ کی کسی بات کو کبھی جھوٹ نہیں سمجھتی لیکن باپ بیٹوں کی علیحدگی کی بات سن کر مجھے صدمہ پہنچا تھا۔ میں اپنا دکھ بیان نہیں کر سکتی۔ میرے ابا حضور اس بڑھاپے میں تنہا رہ گئے ہیں۔"

"صدمہ نہ کرو۔ وہ بوڑھے ہیں مگر لاچار اور مجبور نہیں ہیں۔ قانون سے کھیلنے والوں کو عمر کی ایسی ہی پختگی گاڈ فادر بنا دیتی ہے۔ دو بیٹے باغی ہو گئے تو کیا ہوا۔ موصوف کتنے ہی جرائم پیشہ افراد اور نوسرباز سیاستدانوں کے گاڈ فادر ہیں۔"

"آپ ابا حضور کو ایسے طعنے دے کر میرا دل دکھاتے ہیں۔"

"کیا تمہارے ابا حضور میرے لیے نیک کلمات ادا کرتے ہیں؟"

"میں ان سے بھی شکایتیں کرتی ہوں۔ وہ کہتے ہیں' ان کے خلاف اقدامات کرنے والے زندہ نہیں رہتے لیکن وہ آپ کو داماد سمجھ کر ڈھیل دیتے ہیں۔ میرا سہاگ سلامت رکھنے کی خاطر آپ کے دوسرے دشمنوں کو ٹھکانے لگا دیتے ہیں۔ بے شک آپ ذہین اور زبردست ہیں۔ اپنی حکمت عملی سے اپنا بچاؤ کرتے ہیں اس کے باوجود ابا حضور نے اکثر آپ کو خطرات سے محفوظ رکھا ہے۔"



"میں جس عہدے پر ہوں' وہاں قانون کی حد میں رہنا پڑتا ہے۔ اگر کبھی حد سے تجاوز کروں گا تو اس ملک میں دور دور تک کسی گاڈ فادر کا وجود نظر نہیں آئے گا۔ کبھی اپنے باپ کے علاوہ میرا قصیدہ بھی پڑھ لیا کرو کہ وہ ابھی سلامتی سے زندگی گزار رہے ہیں۔"

"کیا میں آپ کے گن نہیں گاتی ہوں؟ آپ کیا جانیں کہ میں آپ کے لیے کس طرح ابا حضور سے جھگڑتی رہتی ہوں۔ آپ دونوں کے درمیان میری جان عذاب میں رہتی ہے۔ مجھے جب بھی نماز پڑھنے کا وقت ملتا ہے' میں آپ دونوں کی سلامتی کے لیے دعائیں مانگتی رہتی ہوں۔"

"کیا طرفہ تماشا ہے۔ سسر اور داماد دشمن بھی ہیں اور ایک دوسرے کے لیے دل میں نرم گوشہ بھی رکھتے ہیں۔ ہم ایک دوسرے کو پتھر نہیں مارتے مگر راستے کا پتھر بن کر ایک دوسرے کو جارحانہ اقدامات سے باز رکھتے ہیں اور تم؟ تم ہمارے درمیان دعاؤں کی قندیلیں روشن کرتی رہتی ہو۔"

وہ بولی۔ "نفرتوں کے ہجوم میں جب بھی ہماری سانسیں اکھڑنے لگتی ہیں ہم ایک دوسرے کو محبت کی تھوڑی سی آکسیجن دیتے ہیں اور گہرے رشتوں کو رسمی طور پر قائم رکھتے ہیں لیکن اب ایک نیا دھڑکا سا لگا ہے۔ دونوں بھائیوں کی علیحدگی سے دشمن فائدہ اٹھائیں گے۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "بڑی بھولی ہو۔ مستقبل بعید کا صیغہ استعمال کر رہی ہو کہ دشمن فائدہ اٹھائیں گے۔ بھئی حالات کا تجزیہ کرو۔ انہوں نے تمہارے خاندان میں سرنگ بنا کر پہنچنے کے بعد خون کے رشتوں کو تقسیم کیا ہے۔"

"آپ کی بات دل کو لگتی ہے۔ میرے دونوں بھائی دشمنوں کی چال میں آ گئے ہیں۔"

"تمہارے ابا حضور اتنے منظم اور مستحکم ہیں اور ایسے ٹھوس ذرائع کے مالک ہیں کہ دوسری ایجنسی کا گاڈ فادر اتنے ہائی لیول پر انہیں توڑ نہیں سکتا تھا اس لیے اس نے خون کے رشتوں میں شگاف ڈالا ہے۔"

"میری تو آدھی جان نکلی جا رہی ہے۔ آپ چاہیں تو میرے بھائیوں کو مزید حماقتوں سے باز رکھ سکتے ہیں۔"

"میری یہی کوشش ہو گی۔ آخر وہ میرے سالے ہیں۔ میرا خیال ہے وہ اپنی بیگمات کے بھائیوں یعنی اپنے سالوں کی باتوں میں آ کر دوسری ایجنسی کے سالوں کے چکر میں پڑ گئے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ دوسرے گاڈ فادر کے بھی دو سالے ہیں۔ کیا پتہ کہ ان دونوں سالوں کے بھی سالے ہوں۔ میں ان سب سے نمٹ لوں گا۔ میری طرح نہ جانے کتنے بہنوئی ہیں جو اپنے سالوں سے نمٹتے رہتے ہیں۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ یہ سالے رشتے کی نزاکت کو گالی بنا دیتے ہیں۔"

"خدا کے لیے بس کریں۔ کیا سالے سالے کی رٹ لگا رہے ہیں۔ ابا حضور کے خلاف سازشیں ہو رہی ہیں اور آپ سالوں کا مذاق اڑا رہے ہیں۔"

"ہم سب جیسی زندگی گزار رہے ہیں اس میں ہر منفی ردعمل کا پیش لفظ سالا ہے۔ جس طرح رائفل چلانے سے پہلے کارتوس لوڈ کیے جاتے ہیں اسی طرح ہاتھا پائی کرنے سے پہلے ایک دوسرے کو سالا کہا جاتا ہے۔ تمہارے ابا حضور بھی اکثر نفرت سے کہتے ہیں' اس سالے سرکاری افسر کو دیکھ لوں گا۔ اس پیش لفظ کے بعد اس بیچارے افسر کا تبادلہ کسی چھوٹی جگہ ہو جاتا ہے۔ ایک بار انہوں نے میرے ماتحت کے سامنے غصے سے کہا تھا' میرے سامنے تمہارے اس سالے ڈائریکٹر جنرل کی کیا حیثیت ہے؟ وہ ایسا کہتے وقت بھول گئے تھے کہ اپنے داماد کو سالا کہہ رہے ہیں۔"

"پلیز صداقت! وہ ہمارے بزرگ ہیں۔ ان کے غصے کو نظرانداز کر دیا کریں۔ ان کے اپنے بیٹے علیحدہ ہونے کے بعد نہ جانے انہیں کس طرح نقصان پہنچائیں گے۔ وہ تنہا رہ گئے ہیں۔ ہمیں ان کے کام آنا چاہیے۔"

"ہمیں نہیں' تمہیں۔ میں تو ملک اور قانون کے حوالوں سے کام آتا ہوں۔ تم اپنی بات کرو۔ کیا ایسے وقت اپنے والد محترم کو چھوڑ کر میرے پاس لندن آ سکو گی؟"

"آپ خود ہی انصاف سے کہیں' کیا برے وقت میں اس گھر کو خالی کر کے جانا چاہیے' جہاں بچپن گزار چکی ہوں؟"



"صرف انصاف کا ہی نہیں' اخلاق کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اپنے بزرگوں کا ساتھ نہ چھوڑا جائے لیکن جس نے تمہیں قیدی بنا کر رکھا ہے' وہ اخلاق اور انصاف کو نہیں سمجھنا چاہے گا۔ تم میرے پاس لندن نہیں آؤ گی تو وہ تمہیں باپ کے پاس بھی نہیں جانے دے گا۔"

"میں اس سے التجا کروں گی کہ وہ اپنے فیصلے میں لچک پیدا کرے۔ مجھے اپنے ابا حضور کے پاس رہنے دے۔ میں قسم کھا کر اسے یقین دلاؤں گی کہ آپ مجھ سے ملنے پاکستان کبھی نہیں آئیں گے بلکہ میں آپ سے اور بیٹی سے ملنے لندن جایا کروں گی۔"

"تو پھر ابھی رابطہ کر کے دشمن کے فیصلے میں لچک پیدا کرو۔"

"میں ابھی فون کرتی ہوں۔" وہ کچھ گڑبڑا سی گئی تھی' جلدی سے بولی۔ "لیکن فون کیسے کروں؟ دشمن نے اپنے رابطے کا نمبر نہیں بتایا ہے۔ مجھے اس کے فون کا انتظار کرنا پڑے گا۔"

"انتظار کرو۔ میں پیش گوئی کرتا ہوں کہ وہ تمہاری اس التجا کو ٹھکرا دے گا۔ ابھی میں نے کہا تھا کہ حالات کا تجزیہ کرو۔ جس نے بیٹوں کو باپ سے جدا کیا ہے وہ بیٹی کو باپ کے پاس کیوں رہنے دے گا۔ اس کی زبردست مخالفانہ چال یہی ہے کہ پہلے گھر اجاڑو۔ پھر گھر والا آپ ہی اجڑتا چلا جائے گا۔"

"آپ بالکل صحیح تجزیہ کر رہے ہیں لیکن میرے التجا کرنے سے اور اس کے ٹھکرا دینے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا' ابا حضور جب کسی کے پیچھے پڑ جاتے ہیں تو اسے موت سے پہلے کفن اور کافور کا تحفہ بھیج دیتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ انہوں نے دشمن کے لیے تحفہ تیار کر لیا ہو گا۔"

"ہاں تم بیٹی ہو۔ تمہارے لیے وہ دشمن کی موت بن سکتے ہیں لیکن وہی دشمن داماد کو ملک بدر کرے تو تمہارے ابا محترم خاموش تماشائی بن جاتے ہیں۔"

"کیا آپ اس طرح نہیں سمجھ سکتے کہ میری خاطر دشمن کی موت بن جانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ داماد کو ملک بدری سے روکنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"ایسا ہے تو اپنے ابا حضور سے پوچھو' مجھے استعفیٰ دے کر ملک چھوڑنا چاہیے یا

نہیں؟"

"اگر آپ کچھ دنوں کے لیے لندن چلے جائیں گے تو کوئی حرج نہیں ہو گا۔ دشمن کے خاک میں ملتے ہی آپ آ جائیں گے۔"

"دشمن کے خاک میں ملنے تک آپ کے والد محترم کا بھی بھلا ہو گا۔ وہ میری عدم موجودگی میں اپنے کچھ اہم مشن میں کامیاب ہو جائیں گے۔"

"میں آپ داماد سسر کی طنزیہ باتیں سن سن کر عاجز آ گئی ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں؟"

"کچھ نہ کرو۔ خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دو۔ خدا جو کرے گا بہتر کرے گا۔ بہرحال پھر کسی وقت فون کرو۔ اب میں دوسرے معاملے میں مصروف رہوں گا۔"

اس نے فون بند کر دیا۔ اس فون کو پاس والی سیٹ پر رکھ دیا۔ کار ٹیلی فون کے ذریعے ماتحتوں سے رابطہ کیا۔ پتہ چلا' ہاکس بے کے ساحل پر ایک خوبصورت کاٹیج کے سامنے وہ پجیرو کھڑی ہے۔ وہاں مزید تین کاریں نظر آ رہی ہیں اور کاٹیج کے چاروں طرف مسلح گارڈز کھڑے ہوئے ہیں۔

صداقت نے کہا۔ "وہاں یقیناً اہم ڈیلنگ ہو رہی ہو گی۔ اگر چھاپا مارنے سے کوئی ثبوت ان کے خلاف ہاتھ نہیں آئے گا تو وہ بڈھا پیر صاحب تم لوگوں کی نوکری کھا جائے گا۔"

"سر! کیا ہم دور سے نگرانی کرتے رہیں۔"

"کوئی ضروری نہیں ہے۔ پیر صاحب کا ایک کاٹیج نظروں میں آ گیا ہے۔ اب صرف ایک جاسوس سے کہو' آس پاس کا کوئی کاٹیج کرائے پر حاصل کرے اور وہاں سے ان پر نظر رکھے۔ اس طرح مزید تین کاروں میں آنے والے بھی پہچان لیے جائیں گے۔"

وہ ضروری ہدایات دینے کے بعد ہاکس بے سے دور ایک کاٹیج میں آ گیا۔ وہاں کے ملازم کو سو روپے کا نوٹ دے کر بولا۔ "میں یہاں ایک یا دو گھنٹے گزار کر چلا جاؤں گا۔"

وہ کار کے ڈیش بورڈ سے کاغذ قلم نکال کر موبائل فون اٹھا کر کاٹیج کے اندر آ گیا۔ اسے اپنی گونگی بیٹی کے فون کا انتظار تھا۔



یا حیرت! کیا گونگے ریسیور کے ماؤتھ پیس پر بول سکتے ہیں؟ کیا ریسیور کے ہیئرنگ پیس کے ذریعے بہرے سن سکتے ہیں؟

★============★============★

مسلح گارڈز کے باعث کوٹھی باہر سے آباد تھی لیکن اندر سے ویران ہو چکی تھی۔ اندر شہناز اور ملازم عبداللہ کے سوا تیسرا کوئی نہیں تھا۔ وہ اپنے کمرے سے نکل کر بالکونی سے گزرتی ہوئی زینے سے اتر رہی تھی اور کوٹھی کی ویرانی اور خاموشی کو دیکھ رہی تھی پھر بڑے ہال سے گزرتی ہوئی کچن کے دروازے پر آئی۔ عبداللہ نے اسے دیکھ کر اشارے سے پوچھا۔ "کھانا نکالوں؟"

اس نے انکار میں سر ہلایا۔ وہ بولا۔ "بی بی جی! لنچ کا وقت ہو چکا ہے۔ کیا آپ دیر سے کھائیں گی؟"

پھر اسے یاد آیا کہ وہ ایک بہری کے سامنے بول رہا ہے۔ اس نے دیوار گیر گھڑی کی طرف اشارہ کیا تاکہ وہ لنچ کا وقت سمجھ لے۔ شہناز نے انکار میں سر ہلا کر اشارے سے سمجھایا کہ ابھی بھوک نہیں ہے وہ چلا جائے۔ وہ کچن کا پچھلا دروازہ بند کر لے گی' پھر اس نے چھ انگلیاں دکھا کر گھڑی کی طرف اشارہ کر کے سمجھایا کہ وہ یہاں چھ بجے واپس آئے۔

وہ بولا۔ "بڑی مہربانی ہے بی بی جی! میں آپ سے چھٹی مانگنے والا تھا۔"

وہ کچن کی ضروری چیزوں کو ان کی جگہ ٹھکانے سے رکھنے کے بعد اسے سلام کر کے چلا گیا۔ شہناز نے دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔ اب کوئی کوٹھی کے اندر نہ آ سکتا تھا اور نہ ہی اسے کھڑکی سے جھانک کر دیکھ سکتا تھا۔

وہ کچن سے ایک چینی کی خالی پلیٹ اور چمچہ اٹھا کر بڑے ہال میں آئی جہاں ایک بڑا سا قیمتی پیانو رکھا تھا۔ وہاں موسیقی سے کسی کو لگاؤ نہیں تھا لیکن پیانو کو ڈیکوریشن پیس کے طور پر رکھا گیا تھا۔ شہناز نے پلیٹ اور چمچہ پیانو کی ریڈز کے پاس لا کر رکھ دیا پھر سینٹر ٹیبل سے فون اٹھا کر لے آئی۔ اسے بھی ریڈز کے قریب ہی رکھ دیا۔ اس کے بعد پیانو کے سامنے بیٹھ گئی۔ ریسیور اٹھا کر اپنے کان سے لگایا اور نمبر ڈائل کرنے لگی۔

صداقت ہاکس بے کے ایک کاٹیج میں کاغذات کا پیڈ اور قلم لیے بیٹھا تھا۔ موبائل

فون کی آواز سن کر اس نے اسے اٹھایا۔ اس کا بٹن دبایا۔ دوسری طرف سے گونگی آوازیں سنائی دیں۔ اس نے جیب سے ایک سیٹی نکال کر زور سے فون کے سامنے بجائی۔

شہناز نے ریسیور اپنے کان سے ہٹا کر اپنے اس کان پر ہاتھ رکھا۔ وہ سن نہیں سکتی تھی لیکن سیٹی ہو یا کوئی تیز آواز ہو تو اپنے کان کے آس پاس کی جلد پر آواز کی تھرتھراہٹ محسوس کر سکتی تھی۔

وہ محسوس کر کے مسکرائی۔ سمجھ گئی کہ باپ فون ریسیو کر رہا ہے۔ اس نے ریسیور کو کریڈل سے ہٹا کر پیانو کی ریڈز کے قریب رکھا پھر اس کے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں پیانو کی ریڈز پر حرکت کرنے لگیں۔ اس حرکت سے ظاہر تھا کہ اس نے لندن میں رہ کر گونگوں بہروں کے اسکول میں صرف لکھنا پڑھنا ہی نہیں بلکہ موسیقی کی کلاس میں پیانو کی ایک ایک ریڈ کو سُر کے حساب سے سیکھا بھی تھا اور ان سُروں کے مطابق اسے اپنا مافی الضمیر' اپنے اندر کی باتیں ظاہر کرنے کی مکمل تربیت حاصل ہو گئی تھی۔

پیانو پر جو ریسیور رکھا ہوا تھا اس کے ذریعے سُروں کی آواز صداقت علی سن رہا تھا اور کاغذ پر کچھ لکھ رہا تھا۔ لکھتے وقت اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی اور اسے یاد آ رہا تھا۔

اسے یاد آ رہا تھا۔ اسکاٹ لینڈ یارڈ کے ایک شعبے کے دروازے پر لکھا تھا Musical Signal Message (موسیقی کے اشارتی پیغامات) اس شعبے کے ایک کمرے میں چودہ برس کی شہناز پیانو کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس پیانو کی ایک ریڈ پر A' دوسری ریڈ پر B' تیسری ریڈ پر C اور اسی طرح تمام ریڈز پر انگریزی حروف Z تک لکھے ہوئے تھے۔ ایک بوڑھا انگریز ٹیچر اسے سمجھا رہا تھا کہ شہناز کس طرح مختلف حروف کی ریڈز کو دبا کر ایک لفظ مکمل کر سکتی ہے۔ پیانو کے پیچھے کھڑا ہوا صداقت علی ایک ایک ریڈ کی آواز سن کر کاغذ پر حروف کی ترتیب سے الفاظ اور الفاظ کی ترتیب سے فقرے بنا رہا تھا۔

وہی صداقت علی ہاکس بے کی کاٹیج میں کاغذات کے پیڈ پر جھکا ہوا کان سے موبائل فون لگائے پیانو کی آوازیں سن کر لکھ رہا تھا۔ "دی فرنٹ لاک آف دی سیف از



اے شو پیس۔ دی رئیل ون از اٹیچڈ ودھ دی وال" (آئرن سیف کا سامنے والا لاک محض نمائشی ہے' اصل لاک دیواری طرف والے حصے میں ہے۔)

وہ پیانو پلے کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "اب آپ لاک کا نمبر نوٹ کریں۔"

باپ نوٹ کر رہا تھا۔ بیٹی ایک ہاتھ میں چمچ لے کر ریسیور کے سامنے اسے پلیٹ پر بجانے لگی۔ پہلے اس نے تین بار چمچ سے پلیٹ کو بجایا پھر ایک ذرا وقفے سے پانچ بار بجایا۔ اس کے بعد وہ پلیٹ پر چمچ کو گھسنے لگی۔ گھسنے کا مطلب تھا صفر۔ اس سگنل کے مطابق صداقت کاغذ پر لکھ رہا تھا۔ تھری' فائیو' زیرو' ٹو' ڈبل نائن۔

دونوں باپ بیٹی کے درمیان ایسی خفیہ میوزیکل زبان سے گفتگو ہو رہی تھی جسے صرف اسکاٹ لینڈ یارڈ کے تربیت یافتہ جاسوس سمجھ سکتے تھے۔ کوٹھی اور ہاکس بے کے کاٹیج میں کوئی تیسرا سمجھنے والا نہیں تھا۔ آخر میں صداقت نے دو بار مختصر سی سیٹی بجائی۔ شہناز نے کان سے لگے ہوئے ریسیور کے ذریعے آواز کی تھرتھراہٹ محسوس کی۔ سمجھ گئی کہ باپ پوچھ رہا تھا۔ "اور کوئی انفارمیشن؟"

اس نے میوزیکل سگنل کے ذریعے کہا۔ "دیٹس آل۔"

صداقت نے ایک لمبی سیٹی بجائی۔ اس سگنل کے ذریعے اس نے بیٹی کو شاباش کہا تھا پھر ان کا فون کا رابطہ ختم ہو گیا۔

وہ پیانو کے پاس سے اٹھ گئی۔ اس نے ٹیلی فون کو وہاں سے اٹھا کر سینٹر ٹیبل پر لے جا کر رکھ دیا پھر چمچ اور پلیٹ کو کچن میں لے گئی۔

کوٹھی کے احاطے کے باہر خیمے کی محدود فضا میں گٹار کی آواز گونج رہی تھی اور باہر تک سنائی دے رہی تھی۔ یہ ثناء اللہ شاہ عرف سنی کا مشغلہ تھا۔ ذہن الجھا ہوا ہو' کوئی بات صدمہ پہنچا رہی ہو تو وہ غم غلط کرنے کے لیے سُر سنگیت سے دل بہلانے لگتا تھا۔

پیر عظمت اللہ شاہ سلطانی نے اپنے دونوں بیٹوں اور دونوں پوتوں کی ایسے ایسے سرکاری شعبوں میں سرکاری افسروں کی حیثیت سے تقرری کرائی تھی جہاں سے وہ مطلوبہ سرکاری راز معلوم کرتے رہتے تھے۔ برکت شاہ' رحمت شاہ اور جمشید سلطانی کبھی کبھی کی ضرورت کے تحت دفتروں میں جاتے تھے لیکن حاضری روزانہ لگتی رہتی تھی۔ ان کا

زیادہ وقت دو نمبر کے دھندوں کے ذریعے دولت کمانے میں صرف ہوتا تھا۔ سنی کو
سیاست اور صحافت سے دلچسپی تھی اس لیے دادا کی سفارش پر اسے ایک اخبار میں معاون
مدیر کی ملازمت مل گئی تھی۔

ویسے ان امیرزادوں کو ملازمت کی ضرورت محض اس لیے تھی کہ وہ اپنے ان
عہدوں کے ذریعے امیر ترین بننے کے لیے رعایتیں اور سہولتیں حاصل کرتے رہتے تھے۔
صرف سنی ان سے مختلف تھا۔ صحافت سے ذہنی لگاؤ رکھتا تھا چونکہ سچ بولنے کی عادت سے
مجبور تھا اس لیے سچے اور بے لاگ تبصرے لکھتا تھا۔ وہ باپ دادا کے اندرونی حالات جانتا
تھا۔ پس پردہ اور زیر زمین جرائم اس سے پوشیدہ نہیں رہتے تھے۔ اگرچہ وہ ثبوت کے
ساتھ سب کچھ نہیں جانتا تھا لیکن سطحی طور پر خاصی معلومات رکھتا تھا۔ وہ جب بھی اس
سلسلے میں کالم لکھ کر شائع کرانا چاہتا تو اخبار کے مدیر اعلیٰ اور مالک کو خوف و دہشت سے
پسینہ آ جاتا تھا۔ وہ اس کی تحریر کو چھاپنے سے پہلے اس کے دادا کے پاس پہنچا دیتے تھے
جس کے نتیجے میں دادا جان اسے اچھی طرح ڈانٹنے لگتے تھے۔ اس کا لکھا ہوا کالم اس کے
منہ پر پھینک کر کہتے تھے۔ ”ہمیں تمہارا سچ اچھا لگتا ہے۔ خاندان میں کوئی تو ہے جو
اختیار سچ بولتے وقت یہ نہیں سوچتا کہ اپنے بزرگوں پر کیچڑ اچھال رہا ہے۔“

”پھر آپ مجھے ڈانٹتے کیوں ہیں؟“

”تمہاری حماقت پر۔ تمہارا سچ کسی اخبار میں شائع نہیں ہو سکے گا۔ سنسر بورڈ میں
ہمارے زر خرید بیٹھے رہتے ہیں۔ اپوزیشن پارٹی کے اخبارات بھی ایسا سچ چھاپنے سے
معذرت چاہیں گے کیونکہ آئندہ الیکشن میں انہیں کامیابی کی امید ہے۔ وہ اقتدار میں آئیں
گے تو ہم سے اچھی صاحب سلامت رکھنے پر مجبور ہوں گے۔“

سنی نے اپنی صحافتی زندگی کے آغاز میں سیاسی اور سماجی حالات پر بھرپور انداز میں
بہت کچھ لکھا لیکن سیاست کے چونکا دینے والے خفیہ گوشوں کو جب بھی اپنے قلم سے
ظاہر کرنا چاہا اس پر سنسر کی قینچی چل گئی۔ ظاہری طور پر صحافت اور اخبارات بڑی حد تک
آزاد ہیں۔ تمام اخبارات میں سچائیاں کسی حد تک شائع ہوتی تھیں لیکن ایسا ہی لگتا تھا
سچائی برقع پہن کر آئی ہے۔ قارئین کو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ سچائی ہے مگر کیسی ہے؟



کتنی زوردار ہے‘ یہ بتانے کے لیے برقعے کا نقاب الٹنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ اسی
طرح کم وبیش یہ بھرم قائم رہتا ہے کہ صحافت آزاد ہے۔

وہ گٹار بجاتے بجاتے رک گیا۔ شہناز خیمے کا پردہ ہٹا کر آئی تھی۔ اس کے شانے
سے ایک بیگ لٹک رہا تھا۔ وہ قریب آ کر اس کی فولڈنگ چارپائی پر بیٹھ گئی۔ اپنے ہاتھوں
اور انگلیوں کے اشارے سے بولی۔ ”کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔ میں نے بھی نہیں کھایا
ہے۔ کیا میرے ساتھ نہیں کھاؤ گے؟“

سنی بڑی حد تک گونگے اشاروں کا مفہوم سمجھنے لگا تھا۔ اس نے بھی اشارے سے
کہا۔ ”مجھے بھوک نہیں ہے۔ پھر کسی وقت باہر جا کر کسی ہوٹل میں کھا لوں گا۔“

شہناز نے اپنے بیگ سے کاغذات کا ایک پیڈ اور قلم نکال کر لکھا۔ ”میں جانتی
ہوں‘ تمہارے دل پر بوجھ ہے۔ سنی! ہمارا خاندان جیسا بھی ہے ہمارا ہے۔ آج وہ بکھر گیا
ہے۔ تم بھی گھر سے باہر نکل آئے ہو۔ میں جانتی تھی‘ گھر سے کھانا لاؤں گی تو نہیں کھاؤ
گے لہٰذا میں بھی بھوکی ہوں اور اس وقت تک بھوکی رہوں گی جب تک میرے ساتھ کسی
ریستوران میں چل کر نہیں کھاؤ گے۔“

سنی نے پیڈ اور قلم لے کر لکھا۔ ”تم بہت پیار کرنے والی بہن بھی ہو اور ایک
اچھی اور سچی دوست بھی۔ قدرت نے تمہیں قوت سماعت اور قوت گویائی سے محروم رکھا
ہے لیکن بہت ہی حساس اور درد بھرا دل دیا ہے۔ بزرگوں نے بھوک اڑا دی ہے۔ پھر
بھی تمہارے ساتھ کھاؤں گا۔ مجھے تمہارا ساتھ چاہیے اور تمہاری قربت مسیحائی کا کام
کرے گی۔“

شہناز نے لکھا۔ ”تم کوٹھی کی کوئی چیز بھی استعمال کرنے سے انکار کرو گے لیکن کار
میں بیٹھو گے کیونکہ وہ کار مجھے میرے پاپا نے خرید کر دی ہے۔ وہ میرے نام ہے اور تم
میری کسی چیز کو استعمال کرنے سے انکار نہیں کرو گے۔“

وہ مسکرایا پھر دونوں خیمے سے باہر آ گئے۔ کوٹھی کے آہنی گیٹ سے وہ خیمہ دس
قدم کے فاصلے پر تھا۔ وہاں کھڑے ہوئے سیکیورٹی گارڈز نے انہیں دیکھ کر سلیوٹ کیا۔
سنی نے کیبن کے پاس آ کر سیکیورٹی افسر سے کہا۔ ”شانی باہر کسی ریستوران میں لنچ کرنا

چاہتی ہے۔ اس کی سیکیورٹی کا انتظام کرو اور کسی گارڈ سے کہو اس کی گاڑی باہر لے آئے۔"

سیکیورٹی افسر نے کہا۔ "سنی بابا! آپ کا حکم سر آنکھوں پر لیکن.........."

وہ بات کاٹ کر بولا۔ "یہ میرا نہیں شانی کا حکم ہے۔ جب میں کوٹھی سے نکل آتا ہوں تو حکم دینے کا خود کو حقدار نہیں سمجھتا ہوں۔"

"آپ لاکھ دوری کے باوجود ہمارے آقا پیر صاحب کے لاڈلے ہیں۔ ہم آپ کے احکامات کی تعمیل کرتے رہیں گے لیکن آقا پیر صاحب نے سختی سے حکم دیا ہے کہ شہناز بی بی کو باہر نہ جانے دیا جائے۔ دشمن انہیں نقصان پہنچا سکتے ہیں۔"

"تم ان سے فون پر بات کرو۔ شاید تمہیں شانی کی ضد پوری کرنے کا حکم مل جائے۔"

سیکیورٹی افسر فون کا ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگا۔ ان سے رابطہ کرنے کے کئی نمبر تھے مگر وہ کسی نمبر پر نہیں مل رہے تھے۔ شہناز نے ان کے مخصوص موبائل فون کا نمبر لکھ کر دیا۔ اس نمبر پر فوراً ہی رابطہ ہو گیا۔ دوسری طرف سے آواز آئی۔ "ہیلو! ہم بول رہے ہیں۔"

اس نے آواز کی تھرتھراہٹ محسوس کی پھر کہا۔ "آں۔ مم.......... ما۔ما۔ ایں ایں.........."

دوسری طرف سے پیر عظمت اللہ شاہ سلطانی نے حیرانی اور بے چینی سے کہا۔ "ارے شانی! تم ہو؟ کیا کوئی گڑبڑ ہے؟ کوئی پریشانی ہے؟ اوہ خدایا! ہم خواہ مخواہ بول رہے ہیں۔ بھول جاتے ہیں کہ تم سن نہیں سکتی ہو۔"

شہناز نے فون سنی کو دیا۔ وہ اسے کان سے لگا کر بولا۔ "میں ایک خانہ بدوش بول رہا ہوں۔"

"یہ تم شانی سے کیا شرارتیں کر رہے ہو؟ وہ ہم سے کیا کہنا چاہتی ہے؟"

"میری کیا حیثیت ہے کہ میں ایک بہت ہی عظیم نانا کی نواسی سے کوئی شرارت کروں۔ یہ خود میرے پاس آئی تھی۔ تحریر کے ذریعے مجھ سے کہہ رہی تھی کہ میں



نہیں کروں گا تو یہ بھوکی رہے گی۔"

"ہم ایک اہم میٹنگ میں مصروف ہیں۔ اتنی سی بات کے لیے ڈسٹرب نہ کرو۔ جاؤ اس کے ساتھ کھا لو۔"

"میں بڑے گھر کا کھانا نہیں کھاؤں گا۔"

"بکواس مت کرو۔ ہماری مصروفیات کا خیال کرو۔"

"آپ جانتے ہیں' میں کیسا ضدی ہوں۔ شانی بھی سمجھتی ہے۔ اس لیے میرے ساتھ کسی ریستوران میں جا کر کھانا چاہتی ہے۔"

"ہرگز نہیں۔ کوٹھی سے باہر شانی کے لیے خطرہ ہے۔"

"آپ نے اتنی لمبی عمر گزار کر بے حساب دولت حاصل کر کے اپنی نسل کے لیے بے حساب خطرہ بھی کمایا ہے۔"

"شٹ اپ۔ یہ تمام سیکیورٹی گارڈز کہاں مر گئے ہیں؟"

"سب زندہ ہیں۔ سیکیورٹی افسر بھی آپ کے حکم کے مطابق شانی کے باہر جانے سے پریشان ہو رہا ہے۔ میں اسے روک نہیں سکتا۔ آپ بھی فون کے ذریعے کیسے سمجھائیں گے اور روک سکیں گے۔ وہ نہ سن سکے گی اور نہ ہی ضد سے باز آئے گی۔ جبراً روکا جائے گا تو میری طرح بھوکی رہے گی۔"

"ہم آج بہت مصروف رہیں گے۔ ہو سکتا ہے' واپسی میں آدھی رات ہو جائے۔ کیا تم بھوکے رہ کر اسے بھی بھوکا رہنے دو گے؟"

"آپ نواسی کے ذمے دار ہیں۔ اسے بھوکا رکھنا نہیں چاہتے لہٰذا کچھ کریں۔"

"تم ہماری کوٹھی میں نہیں جاؤ گے۔ کوئی بات نہیں' کسی ملازم کو بھیج کر ریستوران سے کھانا منگوا لو۔"

"آپ پلیز ہولڈ آن کریں۔ میں شانی سے پوچھتا ہوں۔"

اس نے شانی سے کاغذ قلم لے کر لکھا۔ "تمہارے نانا فرما رہے ہیں' باہر نہ جاؤ۔ ریستوران سے کھانا منگوا لو۔"

اس نے جواباً لکھا۔ "بات محض کھانے کی نہیں ہے۔ میں باہر جا کر خطرہ مول لینا

چاہتی ہوں۔ اگر مجھے اغوا کیا گیا تو یہ میری خوش قسمتی ہو گی کیونکہ وہ اغوا کرنے والے مجھے وہیں پہنچائیں گے جہاں میری ممی ہوں گی۔"

سنی نے وہ تحریر پڑھی۔ اسے حیرانی سے دیکھا پھر زیرلب کہا۔ "اس نے کیسی عجیب سی بات لکھی ہے۔ ماں کی آغوش تک پہنچنے کے لیے دشمنوں کے ہتھے چڑھ جانا خوش قسمتی ہے۔"

اس نے فون پر وہ تحریر پڑھ کر سنائی۔ انہوں نے گرج کر کہا۔ "کیا آج ہمارے خاندان کے ہر فرد کا دماغ پھر گیا ہے۔ تم سب نے کوٹھی چھوڑ دی اور وہ نادان لڑکی اغوا ہو جانے کی خواہش کر رہی ہے۔"

"آپ غصہ نہ کریں۔ اپنی جگہ مصروف رہیں۔ وہ آج رات تک بھوکی رہے گی تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ واپسی میں آپ کو زندہ ملے گی۔"

وہ نواسی کا پیغام سن کر سوچ میں پڑ گئے تھے۔ انہوں نے کہا۔ "ہم اسے بھوکا نہیں رہنے دیں گے۔ یہ بیٹیاں اور نواسیاں' بیٹوں کے مقابلے میں اپنے بزرگوں کو زیادہ محبت اور توجہ دیتی ہیں۔ تم سیکیورٹی افسر کو فون دو۔"

سنی نے افسر کو فون دیا۔ اس نے کہا۔ "لیس سر! آپ کا خادم بول رہا ہے۔"

انہوں نے کہا۔ "اپنی نواسی کی ضد سے ایک آئیڈیا ذہن میں آیا ہے۔ اسے شہر میں کھانے پینے اور گھومنے پھرنے دو اور دشمنوں کو اسے اغوا کرنے کا موقع دو۔"

وہ شدید حیرانی سے بولا۔ "سر! یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟"

انہوں نے پوچھا۔ "کیا ہمارے پاس اسلحہ اور جاں نثار محافظوں کی کمی ہے؟"

"نو سر! ہماری کوٹھی کے اطراف پندرہ گارڈ ہیں۔ باقی تیس مسلح گارڈز جو باری باری ڈیوٹی پر آتے ہیں انہیں ابھی کال کروں گا تو وہ آدھے گھنٹے کے اندر یہاں پہنچ جائیں گے۔"

"ایسے انتظامات کرو کہ مسلح گارڈز سے بھری ہوئی چار گاڑیاں دور ہی دور سے اس کی نگرانی کریں۔ تم سادہ لباس میں ڈرائیور بن کر جاؤ۔ دشمن گن پوائنٹ پر شانی کو لے جانا چاہیں تو اسے جانے دو۔ ہمارے دوسرے گارڈز بڑی رازداری سے ان کا تعاقب کریں



گے۔ ہمیں یقین ہے کہ جہاں ہماری ہاجرہ بیٹی ہو گی' وہیں ہماری نواسی کو پہنچا دیا جائے گا۔ اس طرح ہمیں دشمن کے اس خفیہ اڈے کا پتہ چل جائے گا۔"

"آل رائٹ سر! میں ابھی تمام مکمل انتظامات کر کے خود سادہ لباس میں ڈرائیور بن کر شہناز بی بی کے ساتھ جاؤں گا۔"

"ہم سے اسی فون پر رابطہ رکھو اور ہر آدھے گھنٹے بعد ہماری نواسی کی خیریت کی اطلاع دیتے رہو۔"

انہوں نے فون بند کر دیا۔ وہ ہاکس بے کے ایک کاٹیج میں تھے۔ ان کے سامنے سینٹر ٹیبل کے اطراف تین خوش لباس افراد صوفوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ کاٹیج کے آگے پیچھے دائیں بائیں مسلح گارڈز کھڑے ہوئے تھے۔ کچھ فاصلے پر حد نظر تک پھیلا ہوا سمندر کھڑکی سے نظر آ رہا تھا۔

پیر عظمت اللہ شاہ سلطانی ان تینوں کو دیکھ رہے تھے۔ وہ تینوں اپنے ہاتھوں میں ایک ایک فائل لیے ان کی ورق گردانی کرتے ہوئے بڑے انہماک سے پڑھ رہے تھے۔ ایک نے آخری صفحہ پڑھنے کے بعد فائل کو بند کیا پھر انہیں حیرانی اور تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ واقعی پیر صاحب ہیں۔ پتہ نہیں کیا عمل کرتے ہیں۔ میری مکمل فائل وہاں سے غائب کر کے میرے ہاتھوں میں پہنچا دی ہے۔"

انہوں نے فاتحانہ انداز میں کہا۔ "مسٹر ہمدانی! دوسرے نادہندگان کے مقابلے میں آپ کی گردن بری طرح پھنسی ہوئی تھی۔ ہمارا داماد پورے یقین سے یہ سمجھتا ہے کہ اس کی بیوی کو یعنی ہماری صاحب زادی کو آپ نے اغوا کیا ہے اور آپ تاوان کے طور پر ہمارے خلاف انکوائری ختم کرانا چاہتے ہیں۔"

رئیس ہمدانی نے دونوں کانوں کو پکڑ کر کلمہ پڑھتے ہوئے کہا۔ "اس کلمہ پڑھنے والی زبان سے کہتا ہوں' ہم اپنی عزت کا بھرم رکھنے والے آپ جیسی ہستی کے خلاف قدم اٹھانے کی کبھی حماقت نہیں کر سکتے۔"

"ہم جانتے ہیں مگر ہمارا داماد نہیں مانتا۔ اس نے اپنی بیوی کو بازیاب کرانے کے لیے آپ کی فائل ریکارڈ روم سے نکال لی تھی اور اسے اپنے بنگلے میں چھپا کر رکھا تھا۔

آپ یہ سمجھیں کہ ہم نے شیر کے منہ میں ہاتھ ڈال کر یہ فائل نکالی ہے۔ آج ہی صبح کی فلائٹ سے ہمارے پاس پہنچی اور ہم نے آپ کے پاس پہنچا دی۔"

"واقعی آپ کے داماد کو اسکاٹ لینڈ یارڈ کے محکمے کی پشت پناہی حاصل ہے۔ وہ نہ تو یہاں کے کسی حاکم کے دباؤ میں آتے ہیں اور نہ ہی آپ جیسے گاڈ فادر سے مرعوب ہوتے ہیں۔ ایسے ناقابل تسخیر ڈائریکٹر جنرل کو آپ ہی نے اپنی چالوں سے الجھا کر تسخیر کیا ہے۔"

دوسرے شخص نے اپنی فائل کو بند کیا پھر اطمینان کی سانس لے کر کہا۔ "آپ جتنی بڑی رقم لیتے ہیں اتنا ہی بڑا پہاڑ سر سے اتار دیتے ہیں۔"

تیسرے شخص نے کہا۔ "آپ نے بہت بڑے قرضے کی ادائیگی سے نجات دلائی ہے۔ اس فائل کے غائب ہو جانے کے بعد ہمارے خلاف نادہندگی کا مقدمہ ناکام رہے گا۔ اب کوئی ثبوت نہیں رہے گا کہ ہم نے کبھی قرضے لیے تھے۔"

انہوں نے کہا۔ "آپ حضرات نے اپنے اپنے اعمال نامے پڑھ لیے اور مطمئن ہو گئے۔ ہمارا مشورہ ہے ایک بار پھر انہیں پڑھ لیں۔"

ایک نے کہا۔ "ہم نے غور سے پڑھا ہے۔ ہم بالکل مطمئن ہیں۔"

"تو پھر ابھی ہمارے سامنے انہیں جلا دیں۔"

تینوں نے انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھا پھر ایک نے پوچھا۔ "کیا انہیں جلانا ضروری ہے؟"

"ہمارے آدمیوں نے دہشت گردی کے بہانے اس ریکارڈ روم کو جلا دیا ہے جہاں سے آپ کی یہ فائلیں لائی گئی ہیں۔ اس طرح یہ فائلیں بھی جل چکی ہیں۔"

"یعنی جن حضرات نے آپ کو بھاری معاوضہ نہیں دیا ہے آپ کے آدمیوں نے ان کی فائلیں بھی جلا ڈالی ہیں؟"

دوسرے نے کہا۔ "اس طرح تو آپ نے انہیں بھی قرضوں کی ادائیگی سے بچالیا ہے۔"

"کروڑوں روپے کے قرضے ہضم کرنے والوں کو ہم اللہ کے نام پر نہیں بچاتے۔



ان سب کی فائلیں ہمارے ایک خفیہ ڈارک روم میں محفوظ ہیں۔ چونکہ وہ حکومتی پارٹی میں ہیں اس لیے مطمئن ہیں کہ ان کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ بھئی حکومتیں موسموں کی طرح بدلتی رہتی ہیں۔ ان مطمئن رہنے والوں کو آئندہ الیکشن کے بعد اپوزیشن کے خانے میں آنے دو۔ انہیں قرض نادہندگان کہلانے دو پھر وہ ہمیں منہ مانگا معاوضہ دینے پر مجبور ہو جائیں گے۔"

ہمدانی نے ہنستے کہا۔ "آپ بدلتے ہوئے موسم کے مطابق پھل کھاتے ہیں۔"

"آپ حضرات اپنی فائلوں کی فکر کریں۔ اگر اس کاٹیج سے باہر انہیں لے جائیں گے اور یہ کسی طرح آپ کی مخالف سیاسی پارٹی کے ہاتھ لگیں گی یا ہمارا داماد انہیں اچک لے گا تو پھر اس کی ذمے داری ہم پر نہیں ہو گی۔"

"آپ درست فرماتے ہیں۔ ہم انہیں ابھی نہیں جلائیں گے تو ہمارے کسی برے وقت میں یہ فائلیں ہمارے سیاسی کیریئر کو جلا ڈالیں گی۔"

ایک نے اپنا لائٹر نکالا پھر فائل کو کھولا۔ اس میں سے ایک ایک کاغذ نکال کر لائٹر کے ننھے سے شعلے سے جلانے لگا۔ باقی دونوں بھی اسی طرح اپنی فائل جلانے لگے۔ ان فائلوں سے بھڑکتے ہوئے شعلوں کے پیچھے پیر شاہ سلطانی صوفے کے دونوں ہتھوں پر ہاتھ رکھے، آرام سے ایک پاؤں پر دوسرا پاؤں چڑھائے بیٹھے تھے۔ ان کے پیچھے دیوار پر قائداعظم محمد علی جناح کی بڑی سی تصویر آویزاں تھی۔ تصویر کی آنکھیں قومی خزانے کو جلتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں کے سامنے شعلے بھڑک رہے تھے اور بھڑکتے ہی جا رہے تھے۔

★==========★==========★

ڈائننگ ہال میں خوش حال اور خوش لباس مرد' عورتیں' بچے اور بوڑھے نظر آ رہے تھے۔ شانی اور سنی ایک چھوٹی سی میز کے اطراف بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک بیرا ان کے سامنے مطلوبہ کھانوں کی ڈشیں رکھ رہا تھا۔ تمام میزوں پر کھانے والے ایک دوسرے سے دھیمی آواز میں گفتگو کر رہے تھے۔ ویٹر کے جانے کے بعد سنی نے ایک کاغذ پر لکھا۔

"تم آس پاس دیکھ رہی ہو؟ سب ایک دوسرے سے باتیں کر رہے ہیں۔ کاش تم بھی بول سکتیں۔ ان بڑے لوگوں کو کسی کے عیب کا پتہ چل جائے تو وہ مذاق اڑا کر خود کو بے عیب اور برتر ظاہر کرتے ہیں۔"

شانی نے لکھا۔ "یہاں سب بولتے ہوئے ایسے لگ رہے ہیں جیسے میری طرح گونگے ہیں۔ لب ہل رہے ہیں' آوازیں نہیں نکل رہی ہیں۔"

اس نے لکھا۔ "تمہیں ان کی آوازیں سنائی نہیں دیں گی۔ یوں بھی بڑے اور تعلیم یافتہ لوگ ایسی محفلوں میں اتنی ہی دھیمی آواز میں بولتے ہیں۔ ایک میز والوں کی آوازیں دوسری میز والوں تک نہیں پہنچتیں۔"

شانی نے لکھا۔ "پھر تو ہماری آوازیں بھی دوسروں تک نہیں پہنچیں گی۔ چلو میں باتیں کرتی ہوں۔ کوئی مجھے گونگا نہیں سمجھے گا۔"

وہ حیران ہو کر لکھنے لگا۔ "شانی! تم بولو گی؟ کیوں مذاق کر رہی ہو؟"

اس نے لکھا۔ "ذرا عقل سے سوچو۔ میں لقمہ چباتے وقت اپنے ہونٹوں کو اس طرح حرکت دوں گی جیسے تمہاری باتوں کے جواب میں بول رہی ہوں۔"

سنی نے ہنستے ہوئے لکھا۔ "یعنی میں بولتا رہوں گا اور تم لقمہ چباتی اور ہونٹ ہلاتی



رہو گی۔ واقعی دیکھا جائے تو یہاں ایسا ہی لگ رہا ہے جیسے سب بول نہیں رہے صرف لقمے چبا رہے ہیں۔ اگرچہ بول رہے ہیں لیکن پرانے زمانے کی خاموش فلموں کے کردار دکھائی دے رہے ہیں۔"

وہ ایک لقمہ منہ میں ڈال چکی تھی۔ اسے یوں چبا رہی تھی جیسے کھانے کے دوران بول رہی ہو۔ سنی نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اب مجھے بھی ہونٹ ہلانے پڑیں گے۔ گونگی فلموں کا دور پھر سے آ گیا ہے۔"

وہ اس کی ہنسی کے جواب میں مسکرا رہی تھی اور کھاتے وقت گویائی کے انداز میں ہونٹوں کو ہلا رہی تھی۔ ایسے ہی وقت برکت شاہ' رحمت شاہ اپنی بیگمات کے ساتھ ہال کے ایک گوشے میں ایک بڑی میز کے اطراف آئے۔ ان کے ساتھ روبی اور جمشید بھی تھے۔ وہاں بیٹھتے ہی سب سے پہلے جمشید نے انہیں دیکھا پھر اپنے انکل رحمت شاہ سے کہا۔

"آپ نے کچھ دیکھا۔ یہاں دو ہنسوں کا جوڑا ہے۔"

برکت شاہ نے اپنے بیٹے سے سخت لہجے میں کہا۔ "آج کے جوان بچے بزرگوں کا لحاظ نہیں کرتے ہیں۔ یہاں تم اپنے انکل کو ہنسوں کا جوڑا دکھا رہے ہو۔ کچھ تو آداب واخلاق کو باقی رہنے دو۔"

"ڈیڈی! میں جدھر دیکھ رہا ہوں ادھر آپ بھی دیکھیں گے تو آداب اور اخلاق کو بھول جائیں گے۔"

سب نے اس کی نظروں کا تعاقب کرتے ہوئے دیکھا۔ وہاں سے کچھ دور شانی اور سنی ایک میز کے اطراف میں نظر آ رہے تھے۔ برکت شاہ نے کہا۔ "اچھا تو سنی نے کوٹھی کے سامنے اس گونگی کے عشق میں خیمہ لگایا ہے۔ دیکھو رحمت! میں بھائی کے رشتے کا خیال نہیں کروں گا۔ سنی کے یہی لچھن رہیں گے تو اپنی بیٹی کی شادی اس سے نہیں کروں گا۔"

روبی نے کہا۔ "ڈیڈی! شادی پر مٹی ڈالیں۔ یہ دیکھیں کہ سنی کچھ بول رہا ہے جبکہ وہ بہری ہے۔ وہ دیکھیں وہ گونگی اس کے جواب میں بول رہی ہے۔ کیا مجھے غلط نظر آ رہا ہے؟ بھلا گونگی کیسے بول سکتی ہے؟"

بیگم برکت نے کہا۔ "تمہیں غلط نظر نہیں آ رہا ہے۔ کیا یہ اب تک گونگی بن کر ہمیں دھوکا دیتی رہی ہے؟"

روبی اپنی کرسی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ بیگم رحمت نے کہا۔ "بیٹی! وہ گونگی بن کر دھوکا دینے والی میرے بیٹے پر جادو کر رہی ہے۔ تم چاہو تو اس کے سحر سے میرے بیٹے کو نکال سکتی ہو۔"

وہ وہاں سے تیزی سے چلتے ہوئے شانی اور سنی کی میز پر آ کر رک گئی۔ دونوں نے اسے چونک کر دیکھا پھر سنی نے پوچھا۔ "روبی! تم؟ اور یہاں؟"

وہ ناگواری سے بولی۔ "حیران کیوں ہو؟ کیا ہم کنگلے ہیں' اس مہنگے ہوٹل میں کیا تم ہی آ سکتے ہو؟"

"میں اس لیے حیرانی سے پوچھ رہا ہوں کہ آج ہی تم سب نے نیا گھر آباد کیا ہے۔ پھر گھر چھوڑ کر یہاں کیسے؟ کیا یہاں سب ہی آئے ہیں؟"

"ہاں۔ نیا گھر ہے مگر اتنی جلدی باورچی اور دوسرے ملازموں کا انتظام نہیں ہو سکتا۔ اس لیے یہاں آنا پڑا۔ یہاں تو بڑا رومانی ماحول ہے۔"

اس نے طنزیہ انداز میں شہناز کو دیکھا۔ سنی نے اس کے طنز کو سمجھ کر شانی سے بذریعہ تحریر پوچھا۔ "اگر میں روبی سے یہاں بیٹھنے کے لیے کہوں تو کیا تمہیں اعتراض ہو گا؟"

شانی نے لقمہ چبانے کے دوران بولنے کے انداز میں ہونٹوں کو ہلایا پھر پیشانی پر لہرانے والی لٹ کو ایک طرف ہٹانے کے لیے سر کو ہولے سے یوں جھٹک دیا جیسے ہاں کے انداز میں سر ہلا رہی ہو۔ سنی نے کہا۔ "شکریہ شانی!"

پھر وہ روبی سے بولا۔ "سنا تم نے۔ کتنی فراخدلی سے کہہ رہی ہے' کوئی بھوکا دروازے پر آئے تو اسے ضرور بٹھا کر کھلانا چاہیے۔ تم اس کرسی پر بیٹھ جاؤ۔"

وہ غصے سے بولی۔ "کیا میں بھوکی ہوں اور اس گونگی کے دروازے پر آئی ہوں؟ سنی! یہ تم شرارت سے بول رہے ہو۔ اس گونگی کے تو صرف ہونٹ ہل رہے تھے۔ آواز نہیں نکل رہی تھی۔"



سنی نے حیرانی سے کہا۔ "یہ صاف الفاظ میں یہ آواز بول رہی ہے اور تمہیں سنائی نہیں دے رہا ہے۔"

پھر اس نے شانی کی طرف کاغذ بڑھایا جس پر لکھا تھا۔ "پلیز شانی! تم ایک بار پھر روبی سے کچھ بولو۔ اسے حسد اور جلن کے باعث تمہاری آواز سنائی نہیں دے رہی ہے۔"

وہ لقمہ چباتے ہوئے روبی کو دیکھ کر بولنے کے انداز میں ہونٹ ہلانے لگی۔ روبی اس کے منہ کو غور سے دیکھ رہی تھی اور سننے کے لیے ذرا اس کی طرف جھک گئی تھی۔ سنی نے کہا۔ "دیکھو روبی! یہ تمہارے لیے کتنے اچھے جذبات رکھتی ہے۔ تمہیں کرسی کی جگہ اپنے دل میں بٹھانا چاہتی ہے۔ کیا اب بھی انکار کرو گی کہ سنائی نہیں دے رہا ہے؟"

وہ ایک پاؤں پٹخ کر بولی۔ "یہ لقمہ چبا رہی ہے۔ ہونٹ ہلا رہی ہے۔ کیا تم مجھے احمق سمجھ رہے ہو؟"

وہ بولا۔ "ذرا آس پاس کی میزوں پر لوگوں کو دیکھو۔ وہ سب بول رہے ہیں لیکن تمہیں ان کی آواز سنائی نہیں دے گی۔ صرف ان کے ہونٹ ہلتے ہوئے نظر آئیں گے۔"

روبی دوسری چند میزوں کی طرف دیکھنے لگی۔ واقعی بولنے والوں کے صرف ہونٹ ہل رہے تھے لیکن کسی کی بات کانوں تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ بس مکھیوں کی بھنبھناہٹ جیسی دھیمی دھیمی سی آوازیں پورے ڈائننگ ہال میں پھیل رہی تھیں۔

وہ چند لمحوں تک سوچتی رہی پھر بولی۔ "وہ سب دور ہیں مگر یہ تو بالکل قریب ہے اور یہ کیسی بات ہے کہ تمہاری آواز سنائی دے رہی ہے اور اس کی آواز میرے کانوں تک نہیں پہنچ رہی ہے۔"

"یہی تو سمجھنے کی بات ہے۔ تم شانی کی آواز کانوں سے سننا چاہتی ہو اور میری آواز دل سے سننے کی عادی ہو گئی ہو۔"

"بکواس مت کرو۔ تم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکو گے۔"

"تعجب ہے۔ اتنی دیر سے بے وقوف بن رہی ہو اور دعویٰ ہے کہ نہیں بنو گی۔ حماقت کی انتہا ہے۔ یہ بیچاری گونگی لقمے چبا رہی ہے اور تم منہ کی حرکتوں سے سمجھ رہی

ہو کہ مہنگے ہوٹلوں میں بیٹھ کر گونگے بھی بولنے لگتے ہیں۔"

وہ اس طرح احمق بننے پر بری طرح جھلا گئی۔ میز پر گھونسا مار کر چیختے ہوئے بولی۔ "میں تمہارا منہ توڑ دوں گی۔"

گھونسا زور دار تھا۔ میز پر رکھی ہوئی پلیٹیں اور ڈشیں اچھل کر ایک دوسرے سے ٹکرائیں۔ روبی کی آواز بھی ہال میں گونجی۔ سب لوگ کھانا چھوڑ کر ادھر دیکھنے لگے۔ سنی نے بلند آواز میں کہا۔ "آنٹی! تم کون ہو؟ میرا منہ توڑ دو گی تو کھاؤں گا کیسے؟"

وہ پھر حلق کے بل چیخ پڑی۔ "آنٹی! تم نے مجھے آنٹی کہا؟ کیا میں تمہیں بوڑھی دکھائی دیتی ہوں؟ میں تمہیں گولی مار دوں گی۔"

برکت شاہ' رحمت شاہ اپنی بیگمات کے ساتھ تیزی سے چلتے ہوئے آئے۔ جمشید دوڑتا ہوا آیا۔ ہوٹل کا منیجر اور ہیڈ ویٹر وغیرہ بھی آ گئے۔ جمشید نے غصے سے کہا۔ "سنی! تم میری بہن کی بے عزتی کر رہے ہو۔ باہر چلو' میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

ایک قریبی میز سے ایک شخص نے کہا۔ "اے مسٹر! یہ جوان تمہاری بہن کے پاس نہیں گیا تھا۔ تمہاری بہن یہاں آئی ہے۔ غیرت مند ہو تو بہن کو قابو میں رکھو۔"

منیجر نے عاجزی سے کہا۔ "پلیز بات نہ بڑھائیں۔ آپ حضرات شریف اور عزت دار لوگ ہیں۔ پلیز اپنی جگہ آرام سے بیٹھ جائیں۔"

دوسری میز سے ایک بوڑھی عورت نے کہا۔ "ہم تو عزت دار ہیں مگر یہ پاگل لڑکی کون ہے؟"

روبی نے بھڑک کر کہا۔ "پاگل ہو گی تو۔ پاگل ہو گا تیرا پورا خاندان۔"

بیگم برکت نے فوراً ہی بیٹی کے منہ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "چپ ہو جاؤ۔ کیوں ان کے پاس تماشا بننے آئی ہو۔"

اس بوڑھی کے ساتھ آنے والے کرسیوں سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے تھے اور کہہ رہے تھے۔ "یہ لڑکی پاگل ہے یا ایب نارمل ہے۔ اسے یہاں سے نکالو ورنہ ہم سب چلے جائیں گے۔"

شہناز ایک ایک بولنے والے کا منہ تک رہی تھی۔ وہ بگڑتے ہوئے حالات کو سمجھ



رہی تھی۔ رحمت شاہ نے ذرا آگے بڑھ کر عاجزی سے کہا۔ "ہم آپ حضرات سے معافی چاہتے ہیں۔ یہ ہمارا آپس کا معاملہ ہے۔ دراصل ہم سب آپس میں رشتے دار ہیں اور یہ نوجوان.........."

اس سے پہلے کہ وہ آگے کچھ کہتے۔ سنی نے فوراً ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "یہ جھوٹ ہے۔ میں کسی کا رشتے دار نہیں ہوں۔ اگر یہاں رشتے داری کی بات چھیڑی گئی تو میں باپ دادا کا نام اور شجرہ پوچھوں گا۔"

برکت شاہ اور رحمت شاہ بے بسی سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ وہ سمجھ گئے کہ ہمیشہ سے سچی اور کھری باتیں کرنے والا پھٹ پڑا تو اونچی سوسائٹی کے ہوٹل میں بڑی سبکی ہو گی۔

وہ بپھر چکا تھا۔ اس نے کہا۔ "خواتین و حضرات! کسی کو گھر سے نکالا جاتا ہے۔ کسی کو شہر یا ملک بدر کیا جاتا ہے۔ میں وہ بدنصیب ہوں جسے خاندانی شجرے سے توڑ کر پھینک دیا گیا ہے۔"

شہناز نے اس کے بپھرے ہوئے انداز کو دیکھا۔ فوراً پانچ سو کا ایک نوٹ بیرے کے ہاتھ پر رکھا پھر سنی کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور اسی طرح کھینچتی ہوئی وہاں سے لے جانے لگی۔ وہ کھنچتا جا رہا تھا اور کہتا جا رہا تھا۔ "کوئی اکیلا عزت دار نہیں ہوتا۔ ایک دوسرے کا احترام کرنے والے اور رشتوں کا حقوق ادا کرنے والے ایک عزت دار گھرانا بناتے ہیں ورنہ ریت کے گھروندے کی طرح ایک ہی ٹھوکر سے بکھر جاتے ہیں۔"

شہناز اسے کھینچتی ہوئی باہر لے آئی۔ سیکیورٹی افسر نے کار کا پچھلا دروازہ کھولا۔ شہناز نے سنی کو دھکا دے کر بٹھایا پھر خود اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ اس نے کاغذ قلم نکال کر لکھا۔ "تم غصے میں کیوں آ گئے تھے؟ وہاں سب لوگوں سے کیا کہہ رہے تھے؟ میں تمہارے تیور دیکھ کر پریشان ہو رہی ہوں۔"

سنی نے وہ تحریر پڑھی پھر ایک ہاتھ سے سر تھام کر اس نے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگانے کے بعد آنکھیں بند کر لیں۔ کار اسٹارٹ ہو کر آگے جانے لگی۔

★==========★==========★

ایک بڑے سے ٹی وی اسکرین پر ایک خاتون سنجیدگی سے کہہ رہی تھیں۔
"ناظرین! اس بیسویں صدی میں انسان نے بڑی ترقی کی ہے۔ ہو سکتا ہے' ہم اکیسویں صدی کے آغاز تک چاند پر اپنا گھر بنالیں۔ اس چاند پر جسے دیکھ کر ہماری گود کے بچے مسکراتے ہیں اور اس چاند کو پالینے کی ضد کرتے ہیں۔ ہم عورتیں چاند کو بھائی کہتی ہیں اور بچوں کو رشتہ بتاتی ہیں کہ یہ تمہارے چندا ماموں ہیں۔

"ہم نے سائنس اور ٹیکنالوجی میں حیرت انگیز کامیاب تجربات کیے ہیں۔ مختلف زاویوں سے چاند کی تصاویر اتاری ہیں۔ چاند پر پڑے ہوئے گڑھے اور اس کی تاریک پچکی ہوئی صورت اپنے بچوں کو دکھائی ہے۔ ان کی بچپن کی خواہشوں اور چندا ماموں کے رشتے کو فنا کر دیا ہے۔

"ناظرین! ہمارے آج کے موضوع کا مرکزی خیال یہی ہے کہ ہم جس قدر کائنات کے راز کو پالینے کے قریب سے قریب تر ہوتے جا رہے ہیں اسی قدر اپنے بچوں کو بہت پیچھے چھوڑتے اور بہت گہری پستیوں میں دھکیلتے جا رہے ہیں۔"

اسکرین پر خاتون نے بڑی عقیدت سے سر پر آنچل رکھتے ہوئے کہا۔ "جب بچوں کا ذکر آتا ہے تو سائیں رب راکھن کا چہرہ اور ان کی عظیم شخصیت ہماری نگاہوں کے سامنے آ جاتی ہے۔ سائیں رب راکھن ایسے بچوں کو سہارا دیتے ہیں جو والدین سے بچھڑ جاتے ہیں یا والدین اپنے دکھ بیماریوں اور فاقوں سے مجبور ہو کر انہیں سائیں کے دروازے پر چھوڑ جاتے ہیں۔ انہوں نے بڑے بڑے شہروں میں غریب اور لاوارث بچوں کے لیے اسکول' اسپتال اور ہاسٹل وغیرہ بنوائے ہیں۔ برسوں سے پرائے بچوں کو وہ تمام حقوق دیتے آ رہے ہیں جو ان کے اپنے سگے ماں باپ نہیں دے سکتے تھے۔

"آج وہ عظیم اور محترم سائیں رب راکھن ہمارے اسٹوڈیو میں موجود ہیں اور بچوں کے سلسلے میں اپنے جذبات و احساسات' تجربات و معلومات آپ تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ تو آیئے ناظرین! ہم اپنے سائیں کی اثر انگیز باتیں سنتے ہیں اور دنیا کے جتنے ممالک میں ہماری نشریات پہنچتی ہیں' وہاں تک اپنے سائیں کے غور طلب افکار پہنچاتے ہیں۔"

کیمرا اس خاتون سے ایک معمر شخص پر گیا۔ اسکرین پر وہ باوقار شخص تنہا نظر آ رہا



تھا۔ اس نے گہرے رنگ کا سیاہی مائل لباس پہنا تھا۔ چہرے پر ہلکی ہلکی سی مونچھیں تھیں۔ داڑھی سے بے نیاز تھا۔ سر کے بالوں سے کہیں کہیں سفیدی جھلک رہی تھی۔ اس کی میز پر ایک طرف دولہا جیسا گڈا تھا۔ دوسری طرف خوبصورت سی سنہری بالوں والی گڑیا کھڑی ہوئی تھی۔ سائیں رب راکھن نے بڑے ہی عاجزانہ انداز میں کہا۔ "ناظرین کرام! السلام علیکم۔ میں اللہ تعالیٰ کا ایک عاجز اور ناچیز بندہ ہوں۔ آپ مجھے سائیں کہتے ہیں۔ یہ آپ کی قدردانی اور عزت افزائی ہے۔

"ابھی اس پروگرام کی ابتداء کرتے وقت میری میز پر پھولوں کے گلدان رکھے جا رہے تھے لیکن میں نے پھولوں کو ہٹا کر اس گڈے اور گڑیا کو اپنے اور آپ کے سامنے رکھا ہے کیونکہ ہمارے سامنے یہ بچے ہوں تو یہ پھولوں سے زیادہ خوبصورت لگتے ہیں۔ ان معصوموں کے پیار کی خوشبو کبھی نہیں مرتی اور جو چیز نہیں مرتی' وہ ہماری دنیا کو زندہ رکھتی ہے۔

"یہ بچے ہماری دنیا کو زندہ رکھتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہے کہ بوڑھے اور جوان مرتے ہیں لیکن بچے عموماً نہیں مرتے' ہر سیکنڈ اور ہر منٹ میں پیدا ہوتے رہتے ہیں اور ہماری دنیا کو انسانوں سے ہمیشہ آباد رکھتے ہیں۔

"یہ جو پیدا ہو کر دنیا کی آبادی کو قائم ودائم رکھتے ہیں ہم انہیں کیا دیتے ہیں؟ ناخواندگی' محتاجی' بھوکی خواہشیں اور عمدہ کھانوں اور کپڑوں کے لیے للچایا ہوا ذہن دیتے ہیں؟

"بیسویں صدی کے اختتام سے پہلے ہم اپنا کچھ محاسبہ کرلیں۔ جب بڑوں پر ہمارا زور نہیں چلتا اور ہمیں غصہ آتا ہے تو ہم اپنے بچوں کی پٹائی کرتے ہیں۔

"جب پورے کنبے کے لیے ہماری کمائی کم پڑتی ہے تو ہم بچوں سے کتابیں چھین کر ان سے محنت مزدوری کراتے ہیں۔ کنبہ ہم بڑھاتے ہیں اور اسے قائم رکھنے کا بوجھ بچوں پر ڈالتے ہیں۔

"جب یہ اسکول میں ہوں تو کسی حکمران کی آمد پر ان کے ہاتھوں میں جھنڈیاں دے کر صبح سے شام تک چلچلاتی دھوپ میں سڑکوں کے کنارے کھڑا رکھتے ہیں۔

"جب یہ کالجوں میں ہوں تو سیاسی پارٹیاں انہیں اپنی اپنی طرف مائل کرنے کے لیے اسلحہ اور لاکھوں روپے دیتی ہیں۔ بچوں کے ہاتھوں میں پتھر دو تو وہ پرندوں اور کتوں کو مارتے ہیں اور پتھر پکڑنے والے ہاتھوں میں اسلحہ دے دو تو وہ اپنی قوم کے پیاروں کو گولیوں سے بھون کر رکھ دیتے ہیں۔

"یہ بچے' ہمارے بچے' آپ کے بچے نہایت کم عمری میں ایسی ہی راہوں سے گزر کر دہشت گردوں کی ٹولیوں میں پہنچتے ہیں۔ کبھی آپ نے سوچا کہ یہ بچے اپنی عمر سے بڑے ہتھیار کس طرح اٹھا بھی لیتے ہیں اور انہیں استعمال کرنا بھی سیکھ لیتے ہیں۔"

جس بڑے ٹی وی اسکرین پر سائیں رب راکھن بول رہا تھا اس ٹی وی کے سامنے کچھ فاصلے پر ایک بڑے سے آرام دہ صوفے پر وہی سائیں رب راکھن بیٹھا ہوا تھا۔ صوفے پر سے قالین تک اس کے دونوں پاؤں پھیلے ہوئے تھے۔ جو ان پیروں کو داب رہے تھے' وہ نو برس اور دس برس کے بچے تھے۔ سائیں کے پیچھے آٹھ اور گیارہ برس کے بچے صوفے سے لگے کھڑے تھے اور اپنے سائیں کے دونوں شانے داب رہے تھے۔ وہ سب حویلی کے اوطاق میں تھے۔ بڑی خاموشی سے ٹی وی اسکرین پر نظریں جمائے ہوئے تھے۔ خاموشی اس لیے بھی ضروری تھی کہ سائیں کے سامنے سائیں بول رہا تھا۔

وہ اسکرین پر کہہ رہا تھا۔ "جو ملک طویل جنگ میں الجھ جاتے ہیں وہاں مرنے والے جوان سپاہیوں کی جگہ کمسن سپاہی لیتے رہتے ہیں کیونکہ یہ ان کے لیے آزادی اور ملک کی بقا کی جنگ ہوتی ہے۔

"برما میں بارہ نسلوں تک ایک نہ ختم ہونے والی جنگ جاری رہی۔ ویت نام اور کوریا میں بھی جوان سپاہی مرتے رہے اور کمسن جاں باز ان کے خلا کو پُر کرنے کے لیے ہتھیار اٹھاتے رہے۔

"فی زمانہ دنیا کے ماہرین کا خیال ہے کہ متعدد ممالک میں تقریباً دو لاکھ کمسن سپاہی ہیں۔ یہ مسئلہ نہیں ہے کہ یہ آٹھ برس سے لے کر اٹھارہ برس کے بچے ہتھیاروں کا استعمال کرنا کس طرح جانتے ہیں؟ اب وہ بھاری گولا بارود والا زمانہ نہیں رہا ہے۔ آج کل کے خطرناک ہتھیاروں میں روسی ساختہ AK-47 رائفلوں اور امریکا کی M-16 رائفلوں



کا وزن صرف تین کلو گرام ہے جنہیں نوخیز جانباز کھلونے کی طرح اٹھائے پھرتے ہیں۔"

حویلی کے اوطاق میں سائیں رب راکھن کے صوفے کے پیچھے کھڑے ہوئے آٹھ اور گیارہ برس کے بچے ہتھیار فرش پر ٹیکے کھڑے تھے۔ انہوں نے AK-47 رائفلوں کو دونوں ہاتھوں میں کھلونوں کی طرح اٹھا لیا۔ سائیں کے قدموں کے پاس نو اور دس برس کے لڑکے بیٹھے پاؤں داب رہے تھے۔ سائیں نے دونوں کو لات مار کر کہا۔ "ہتھیار پیچھے نہیں' آگے رکھے جاتے ہیں۔"

M-16 رائفلیں ان لڑکوں نے اپنے پیچھے قالین پر رکھی تھیں۔ انہوں نے لاتیں کھاتے ہی فوراً اپنی اپنی رائفل اٹھائی پھر انہیں اپنے سامنے اپنی گود میں رکھ کر پھر سے داتا سائیں کے پاؤں دابنے لگے۔

ٹی وی اسکرین پر سائیں راکھن کہہ رہا تھا۔ "یہ ہماری ذمہ داریاں ہیں۔ یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم بچوں کے ہاتھوں میں ہتھیار نہ دیں' پھول دیں۔ مٹھائی دیں' عطر اور گلاب دیں لیکن دہشت گردوں نے ان کمسن سپاہیوں کا رخ جنگ آزادی کے جذبوں سے موڑ دیا ہے اور انہیں تخریب کاری کی راہ پر لے آئے ہیں۔ آج ہمارے شہروں میں یہی ہو رہا ہے۔ پختہ عمر کے دہشت گرد کبھی کبھی گرفتار ہو جاتے ہیں لیکن نوعمر دہشت گرد پکڑے نہیں جاتے۔

"ان بچوں کو پتنگ اڑانے' گلی ڈنڈا یا کرکٹ کھیلنے سے زیادہ لوٹ مار کرنے' مال غنیمت حاصل کرنے اور مزاحمت کرنے والوں کو تڑاتڑ گولیاں چلا کر ہلاک کرنے میں مزا آتا ہے۔ بڑی بڑی ڈگریاں حاصل کرنے والے عالم فاضل بے روزگاروں کے مقابلے میں ان بچوں اور جوانوں کو ہتھیار اٹھا کر غم روزگار سے نجات مل جاتی ہے۔

"بے روزگاری میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ دہشت گرد تنظیموں نے اتنے بڑے مسئلے کو حل کر دیا ہے۔ پہلے بچے' ماں باپ اور استادوں کے علمی سائے میں جوان ہوا کرتے تھے۔ اب زیرزمین جرائم کی بے شمار تربیت گاہوں میں پرورش پا رہے ہیں۔

"ہمارے ملک کے ذمے دار اکابرین کو سوچنا' سمجھنا چاہیے کہ یہ سلسلہ کب تک چلے گا؟ ہم سب کو مل کر وہ راستہ بنانا ہوگا جو بچوں کو دہشت گردوں کے زیرزمین مراکز کی

طرف نہیں' اسکولوں کی طرف لے جاتا ہو۔ بشرطیکہ ان سکولوں میں ایمان' تہذیب اور حب الوطنی کی تعلیم دی جاتی ہو۔

"میں نے مختصر سے وقت میں اس تشویش ناک مسئلے کی نشاندہی کی ہے۔ میں صرف تقریر نہیں کر رہا ہوں' بچوں کی فلاح و بہبود کے لیے عملی اقدامات بھی کرتا رہتا ہوں کیونکہ میں خدا سے ڈرتا رہتا ہوں۔"

سائیں رب راکھن نے ریموٹ کنٹرول کے ذریعے ٹی وی بند کر دیا پھر اپنی ایک ٹانگ اٹھا کر ایک لڑکے کے کاندھے پر رکھتے ہوئے پوچھا۔ "کیوں رے الن! میری تقریر کیسی رہی؟"

وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "سائیں داتا! آپ بہت اچھا بولتے ہیں۔"

"میں نے تقریر کے آخر میں کیا کہا تھا؟"

"آپ نے کہا تھا' آپ خدا سے ڈرتے ہیں۔"

"تم سب کس سے ڈرتے ہو؟"

"ہم تو سائیں داتا! آپ سے ڈرتے ہیں۔"

"شاباش۔ جسے کبھی دیکھا نہیں' اس سے کیا ڈرنا۔ ہمیں دیکھتے رہو۔ ہم سے ڈرتے رہا کرو۔ خود بھی تین وقت کھایا کرو۔ اپنے گھر والوں کو بھی اچھا کھلایا پلایا کرو۔"

ایک نو برس کے لڑکے نے کہا۔ "سائیں داتا! آپ نے ہمیں لاٹ گورنر سے بھی بڑا بنا دیا ہے۔ ہم اکیلے جس گوٹھ سے گزرتے ہیں' وہاں کے بڑے بوڑھے بھی ہمیں جھک جھک کر سلام کرتے ہیں۔"

سائیں راکھن نے کہا۔ "یہی سر اٹھا کر زندگی گزارنے کا طریقہ رہ گیا ہے۔ پہلے عزت داروں کو سلام کیا جاتا تھا۔ آج عزت دار بالشت بھر کے دہشت گردوں کو سلام کرتے ہیں کیونکہ تھانے والے تمہارے خلاف کارروائی نہیں کرتے۔ تمہیں قانون سے بالاتر بنا دیا ہے۔ ہندی میں "بالا" بچے کو کہتے ہیں۔ اردو میں "بالا" اونچائی کو کہا جاتا ہے۔ تم سب بالاتر ہو کر بالشت بھر "بالے" نہیں رہے۔ پہاڑ بن گئے ہو' پہاڑ۔"

ایک بارہ برس کے لڑکے نے آ کر ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ "سائیں داتا! میں



چھت پر دوربین کے ذریعے دیکھا ہے۔ راکھن اپنے چار گھڑسواروں کے ساتھ آ رہا ہے۔"

سائیں راکھن اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے صوفے کے گدے کی زپ ایک طرف سے دوسری طرف سرکائی۔ اوپر اور نیچے گدے کے دو حصے ہو گئے۔ الن رائفل سمیت گدے کے درمیان چلا گیا۔ سائیں راکھن نے گدے کے دونوں حصوں کو دوبارہ ملا کر زپ لگا دی۔

ایک دس برس کا لڑکا فانوس کے نیچے آ کر بیٹھ گیا۔ دوسرا بارہ برس کا لڑکا جو راکھن اور اس کے ساتھیوں کی آمد کی خبر لایا تھا' وہ بیٹھے ہوئے لڑکے کے کاندھوں پر دونوں پاؤں رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اس کا بوجھ اٹھاتے ہوئے آہستہ آہستہ کھڑے ہوتے ہوئے اسے فانوس تک پہنچا دیا۔ وہاں تک پہنچنے والا فانوس کو پکڑ کر لٹکتے ہوئے اس پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ باقی لڑکے اِدھر اُدھر ہو گئے۔ وہ اچھے خاصے تربیت یافتہ تھے' یہ جانتے تھے کہ ایسے حالات میں انہیں کیا کرنا چاہیے۔

ہنہناتے ہوئے گھوڑوں اور ان کی ٹاپوں کی آوازیں قریب آتی جا رہی تھیں۔ راکھن ڈاکو اپنے چار ساتھیوں کے ساتھ حویلی کے بڑے دروازے تک آ پہنچا تھا۔ دو لڑکے اس دروازے کا ایک ایک پٹ کھول رہے تھے۔ تیسرا ایک طرف کھڑا ہوا تھا۔ راکھن کے قریب پہنچنے پر اس نے جھک کر سلام کرتے ہوئے خوشی کا اظہار کیا۔ "اچو سائیں! بھلی کرے آئیو۔ اساں جو سائیں دوو اوطاق ے آں.........."

اس نے راکھن کو خوش آمدید کہتے ہوئے بتایا کہ ان بچوں کا سائیں داتا اپنے ڈرائنگ روم میں ہے۔ وہ سب گھوڑوں سے اتر گئے۔ پانچ لڑکوں نے آ کر ان پانچ گھوڑوں کی لگامیں تھام لیں اور انہیں تھان کی طرف لے جانے لگے۔ راکھن اور اس کے ساتھی اپنی رائفلیں اور کلاشنکوف ہاتھوں میں لیے حویلی کے احاطے میں پہنچے۔ وہاں کھڑے ہوئے ایک لڑکے نے انہیں جھک کر سلام کیا پھر دروازے کو کھول دیا۔ کھلے ہوئے دروازے سے اندر بیٹھا ہوا سائیں رب راکھن نظر آ رہا تھا۔

وہ راکھن کو دیکھتے ہی استقبالیہ انداز میں اٹھ کر آگے بڑھا۔ اسے خوش آمدید کہتے

ہوئے گلے لگنے کے بعد مصافحہ کیا۔ اس کی خیریت دریافت کرتے ہوئے اسے صوفے پر بیٹھنے کے لیے کہا۔ راکھن نے ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے اوطاق کے اندر چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ ایک لڑکا فانوس کے اوپر بیٹھا ایک کپڑے سے اس کے شیشے صاف کرتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے سوا اور کوئی نظر نہیں آیا۔

سائیں رب راکھن نے پوچھا۔ ”ہمارا راکھن جیوے۔ اطلاع دیے بغیر اچانک کیسے آگئے۔ خیریت تو ہے نا' بابا!؟“

راکھن نے کہا۔ ”میں اچانک ایک دم سے نہیں آتا۔ راستہ سمجھ کر آتا ہوں۔“

”ہاں سرکار نے تمہیں زندہ یا مُردہ گرفتار کرنے والے کو پانچ لاکھ روپے دینے کا اعلان کیا ہے۔ تم اطلاع دے کر آؤ گے تو آنے سے پہلے گرفتاری کے انتظامات ہو جائیں گے۔“

”میں آپ کے پاس بے خوف ہو کر اس لیے آتا ہوں کہ اس حویلی میں صرف بچے ہی بچے رہتے ہیں۔ یہاں قد آور جنگجو محافظ نہیں ہوتے۔ آج تک کسی ڈاکو نے یہاں ایک ہتھیار بھی نہیں دیکھا۔“

”جب یہاں کے سبھی ڈاکو میری عزت کرتے ہیں اور مجھے نقصان نہیں پہنچاتے ہیں تو میں ہتھیار کیوں رکھوں؟“

”آپ کی عزت اور شہرت اسلام آباد تک ہے۔ آپ ہمیں قانون کی گرفت میں آنے سے پہلے خطرے سے آگاہ کر دیتے ہیں اس لیے کوئی ڈاکو آپ کی زبان کا دشمن نہیں ہے بلکہ آپ کو نقد نذرانے دیتا ہے لیکن میرے معاملے میں آپ کی زبان جھوٹی پڑ رہی ہے۔ آپ نے وعدہ کیا تھا کہ میرے بھائی کو پولیس کا وڈا افسر بنا دیں گے۔“

”ہاں میں نے وعدہ کیا تھا کہ تمہارا بھائی ٹریننگ حاصل کر لے گا تو میں اسے انسپکٹر سے بھی اونچے عہدے پر ڈی ایس پی لگوا دوں گا۔“

”وہ ٹریننگ پوری کر چکا ہے۔ میں تین مہینے سے انتظار کر رہا ہوں۔“

”تمہارے بھائی کی مارک شیٹ کمزور ہے۔ اس نے بہت کم نمبر حاصل کیے ہیں۔ وہ میرٹ کے بغیر بڑا افسر نہیں بن سکے گا۔“



”میں میرٹ نہیں جانتا۔ رقم جانتا ہوں۔ آپ نے مجھ سے بیس لاکھ روپے مانگے تھے۔ مجھ سے کہا تھا وہ رقم بڑے بڑے عہدیداروں تک پہنچانے سے وہ وڈا افسر بن کر اس علاقے میں آئے گا پھر کوئی میرے سر کی قیمت حاصل کرنے کی جرأت نہیں کر سکے گا۔“

سائیں رب راکھن نے کہا۔ ”جب میں کسی سے رقم وصول کرتا ہوں تو اس کا کام ضرور کرتا ہوں۔ کسی انگوٹھا چھاپ کو بھی اعلیٰ عہدیدار بنا دیتا ہوں لیکن یہ بھی تو سمجھو کہ ہمارے تمہارے راستے میں کوئی پتھر بھی آ سکتا ہے۔“

”میں بڑے بڑے پتھروں اور چٹانوں کو ڈائنامائٹ سے ریزہ ریزہ کر دیتا ہوں۔“

”وہ خود ہی پتھر ہے خود ہی ڈائنامائٹ ہے۔ تم نے ڈائریکٹر جنرل صداقت علی کا نام سنا ہوگا۔ جب کسی کے کاغذات اس کے پاس انکوائری کے لیے جاتے ہیں تو پھر بدعنوانی ناممکن ہو جاتی ہے۔“

”وہ ایسا بھی کیا جن بھوت ہے؟ اگر میں اس علاقے میں کوئی بڑی واردات کروں گا اور وہ مجھے گرفتار کرنے آئے گا تو اسے ایک ہی گولی میں ٹھنڈا کر دوں گا۔“

”تم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکو گے۔ میری باتیں غور سے سنو۔ تم نے دس برس پہلے ایک معمولی ڈاکو کی حیثیت سے واردات کی تھی اور پکڑے گئے تھے۔ تمہاری جو پہلی ایف آئی آر لکھی گئی تھی اس میں تمہارا نام' تمہاری ولدیت' تمہارے آبائی گوٹھ اور مکان کا پتہ درج کیا گیا تھا۔“

”ہاں یہ سب کچھ لکھا گیا تھا مگر اس سے میرا کیا بگڑے گا؟“

”بگڑ چکا ہے۔ جب وہ ڈائریکٹر جنرل خود ہی انکوائری کرتا ہے تو گڑے مُردے بھی اکھاڑتا ہے۔ تمہارے بھائی نے تعلیم حاصل کی۔ میری سفارش سے ٹریننگ سنٹر میں داخل ہو گیا۔ اسکول' کالج اور ٹریننگ سنٹر ہر جگہ اس کے نام کے ساتھ وہی ولدیت لکھی ہوئی تھی جو تمہاری ولدیت ہے۔ اسی مکان اور آبائی گوٹھ کا پتہ درج رہا جو تمہاری پہلی ایف آئی آر میں ہے۔ مزید انکوائری کے بعد تم دونوں سگے بھائی ثابت ہو گئے۔ اب تم اس نازک مسئلے کو سمجھ سکتے ہو۔ اس ڈائریکٹر جنرل نے تمہاری گردن دبوچنے کے لیے

تمہارے بھائی کو کہیں حبس بے جا میں رکھا ہے۔ شاید اس پر ٹارچر بھی کر رہا ہوگا۔"

وہ غصے سے اچھل کر کھڑا ہو گیا' غرا کر بولا۔ "میرا بھائی حبس بے جا میں؟ ٹارچر سیل میں رہے گا؟ ہرگز نہیں' میں اس ڈائریکٹر جنرل اور اس کے پورے خاندان کو خاک میں ملا دوں گا۔"

"تم جنگل کے شیر ہو۔ شہر میں قدم نہیں رکھ سکو گے۔ ڈائریکٹر جنرل اور اس کی خطرناک ٹیم کا بڑا دبدبہ ہے۔ وہ تمہارے بھائی کے حلق میں ہاتھ گھسا کر اس کے اندر سے تمہاری تمام پناہ گاہوں کے پتے معلوم کرلے گا۔"

"بکواس مت کرو وڈے سائیں۔ تم نے مجھ سے بیس لاکھ روپے لیے ہیں۔ میں دنیا کو لوٹتا ہوں اور تم مجھے لوٹنا چاہتے ہو۔ میری رقم ہضم نہیں کر سکو گے۔ ایک گولی' صرف ایک گولی تمہارے سینے میں اترے گی۔ اس کے بعد حویلی میں تم نے جتنی دولت جمع کی ہے میں وہ تمام سمیٹ کرلے جاؤں گا۔"

"اتنی سیدھی سی بات میں نے بہت پہلے سمجھ لی تھی کہ تمہارا بھائی ڈائریکٹر جنرل کے شکنجے میں پھنسے گا اور تمہاری رقم میری مٹھی میں دبی رہے گی تو تم مجھے زندہ نہیں چھوڑو گے۔ اصل کے ساتھ سود بھی وصول کرو گے اور اس حویلی کی دولت لوٹ کرلے جاؤ گے۔"

ایک لڑکا ہاتھوں میں چائے کی ٹرے اٹھائے آیا پھر اسے سینٹر ٹیبل پر رکھ کر چلا گیا۔ سائیں نے مسکرا کر راکھن سے کہا۔ "ان بچوں کو جتنی بھی عقل سکھاؤ آخر بچے ہی رہتے ہیں۔ یہی دیکھو کہ تم ملک الموت بن کر سر پر کھڑے ہو اور وہ کمبخت چائے لے کر آیا ہے۔"

راکھن نے کہا۔ "اسے تم آخری خواہش سمجھ کر پی سکتے ہو۔"

سائیں راکھن نے ایک پیالی میں چینی ڈالی پھر کیتلی کے ڈھکن کو اٹھا کر اس میں جھانکتے ہوئے بولا۔ "گدھے کا بچہ' کیتلی میں چائے لانا بھول گیا۔ یہ دیکھو۔"

اس نے کیتلی کے اندر ہاتھ ڈالا۔ گرم چائے ہوتی تو ہاتھ جل جاتا۔ اگر کیتلی کو اٹھا کر الٹا جاتا تو چائے گر جاتی۔ سائیں راکھن کا ہاتھ اس کے اندر ہی تھا۔ اس نے کیتلی کو



اٹھا کر اسے الٹایا پھر کہا۔ "اس میں چائے کی گرمی نہیں' پانچ لاکھ کی گرمی ہے جو سرکار سے ملے گی۔"

راکھن نے کلاشنکوف سیدھی کی لیکن نشانہ لینے سے پہلے ہی اس اٹھی ہوئی کیتلی کا پیندا فائر کی آواز سے ٹوٹ کر بکھر گیا۔ کیتلی کے اندر رکھے ہوئے ریوالور کی گولی سیدھی راکھن کے سینے میں پیوست ہوئی۔ اس کے ساتھیوں نے چھلانگیں لگا کر صوفوں کے پیچھے مورچا بنانا چاہا۔ دوسری اور تیسری گولی گدے کے ایک سوراخ سے نکلی۔ دوسری تو خالی گئی تیسری نے راکھن کے ایک ساتھی کو ہمیشہ کے لیے اوندھے منہ گرا دیا۔ فانوس پر چڑھے ہوئے لڑکے نے شلوار اور کمر کے درمیان اڑسے ہوئے ایک ٹی ٹی کو نکالا اور صوفے کے پیچھے سے نشانہ لینے والے کو ایک ہی فائر میں اڑا دیا۔ سائیں راکھن نے تیسرے کو گولی ماری۔ آنے والوں کو فوراً جوابی کارروائی کا موقع اس لیے نہیں ملا کہ ان کی موت کے انتظامات پہلے ہو چکے تھے پھر یہ کہ جنگلوں اور دیہاتوں میں زندگی گزارنے والے ڈاکوؤں نے ایسے کمسن گارڈز کبھی نہیں دیکھے تھے۔ وہ انہیں بچے اور نہتے سمجھ کر دھوکا کھا گئے تھے۔

مُردہ راکھن کے چار ساتھیوں مین ایک ابھی باقی تھا۔ وہ بری طرح بدحواس ہو گیا تھا۔ وہاں سے اندھا دھند فائرنگ کرتا ہوا بھاگنے لگا۔ سائیں راکھن نے ایک ہاتھ اٹھا کر اسے گولی مارنے سے منع کر دیا۔ پنجرے کا پنچھی بھلا کہاں جا سکتا تھا۔ ایک منٹ کے بعد ہی حویلی کے احاطے سے تڑتڑاتڑ کی آوازیں سنائی دیں پھر خاموشی چھا گئی۔ سائیں نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر ایک لڑکے سے کہا۔ "تھانیدار سے بات کراؤ۔"

لڑکے نے ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کیے پھر رابطہ ہونے کے بعد کہا۔ "اپنے تھانیدار کو فون دو۔ ہمارے سائیں داتا بات کریں گے۔"

چند لمحات بعد ہی تھانیدار کی آواز سنائی دی۔ لڑکے نے اپنے سائیں کو ریسیور دیا۔ وہ اسے کان سے لگا کر بولا۔ "ڈائریکٹر جنرل اور انٹیلی جنس کے بندوں کے پہنچنے سے پہلے کام ہو چکا ہے۔ تمہاری وردی میں ایک فیتے کا اضافہ ہوگا اور پانچ لاکھ روپے نقد ملیں گے۔"

وہ خوش ہو کر بولا۔ ”جیو سائیں! آپ سچ مچ وڈے سائیں ہیں۔ وہ سچ مچ مر گیا ہے نا؟“

”میرے کھیل میں کوئی جھوٹ موٹ نہیں مرتا۔ کام کی بات کرو۔“

”مجھے یاد ہے وڈے سائیں! پانچ میں سے پچاس ہزار میرے اور ساڑھے چار لاکھ روپے آپ کے۔ میں لین دین میں بے ایمانی نہیں کروں گا۔“

”یہ پرانی گھسی پٹی بات ہے کہ پولیس سے نہ دوستی اچھی‘ نہ دشمنی اچھی۔ میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا نقد ساڑھے چار لاکھ تیار رکھو۔ میں تمہاری سرکار سے انعام حاصل کرنے کا انتظار نہیں کروں گا۔ ایک ہاتھ سے دو اور دوسرے ہاتھ سے راکھن سمیت پانچ لاشیں لے جاؤ۔“

”وڈے سائیں! ایسی بھی کیا بے اعتباری؟ میں پورے ساڑھے چار لاکھ لے کر آ رہا ہوں۔“

”آؤ اور یہاں سے کچرا لے جاؤ۔ راکھن کو پولیس مقابلے میں ہلاک کرنے کا کریڈٹ حاصل کرلو مگر دودھ پینے سے پہلے بالائی مجھے دے کر جاؤ۔“

سائیں نے ریسیور لڑکے کو دیا۔ لڑکے نے اسے کریڈل پر رکھ دیا۔

★============★============★

ہوٹل سے نکلنے کے بعد سنی کا موڈ خراب تھا۔ شہناز اس کے ساتھ کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی اور اس کے ایک ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر تھپک رہی تھیں۔ اس کا غصہ ٹھنڈا کر رہی تھی پھر وہ مسکرا کر اشاروں سے بولی۔ ”مسکراؤ۔“

اس نے شانی کو گہری سنجیدگی سے دیکھا پھر بڑی کنجوسی سے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں تو مسکراتا ہی رہتا ہوں۔ اپنی باتوں سے اور اپنے طرزِ عمل سے دوسروں کو ہنساتا بھی رہتا ہوں مگر یہ عجیب دنیا ہے کہ یہ ہنسانے والوں کو بھی پتھر مارتی ہے۔“

اس نے کاغذ کے پیڈ پر لکھا۔ ”پتہ نہیں‘ کیا بول رہے ہو۔ اتنا بتا دو کہ ہوٹل میں غصہ کیوں آیا تھا؟“

سنی نے کاغذ قلم لے کر لکھا۔ ”دادا جان نے ہمیں اور ہمارے والدین کو بچپن سے



سونے کا نوالہ کھلایا۔ ہمارے والدین کو گھر بیٹھے لکھ پتی بنا دیا لیکن بیٹوں نے ایک رات میں فیصلہ کیا اور دوسری صبح باپ کو چھوڑ دیا۔ برسوں کے رشتے اور بزرگی کا بھی لحاظ نہیں کیا لیکن ابھی ہوٹل میں ہونے والی بہو روبی کی بے عزتی ہو رہی تھی تو ڈیڈی اس کی اور اپنے بھائی جان کی عزت رکھنے کی خاطر رشتے داری ظاہر کرنا چاہتے تھے۔ میں نے اس اظہار سے انہیں روک دیا کہ یہ رشتے داری نہیں دوغلا پن ہے۔ وہ گھر کی چار دیواری میں باپ نہیں ہوئے پھر وہ سرِعام میرے باپ کیسے ہو سکتے ہیں؟“

شانی نے لکھا۔ ”تم نے انہیں انتقاماً باپ کا رشتہ ظاہر کرنے سے روک دیا۔ تم نے انکل کے احساسات کو بھری محفل میں جھنجھوڑا ہے۔ اب تو تمہارا غصہ ختم ہو جانا چاہیے۔ ذہنی انتشار میں مبتلا رہنا دانشمندی نہیں ہے۔“

اس نے سر ہلا کر ”آل رائٹ“ کہا پھر زیرِ لب مسکرانے لگا۔ سیکیورٹی افسر سادے لباس میں ڈرائیور کی حیثیت سے کار چلا رہا تھا۔ سنی نے اسے ایک عمارت کے سامنے کار روکنے کو کہا۔ کار رک گئی۔ شانی نے اشارے سے رکنے کی وجہ پوچھی۔ اس نے کاغذ پر لکھا۔ ”اس عمارت میں اسی اخبار کا دفتر ہے جہاں دادا جان کی سفارش سے مجھے معاون مدیر بنایا گیا ہے۔ میں ابھی یہ سفارشی رشتہ ختم کر کے آتا ہوں۔“

وہ لکھنے کے بعد جانا چاہتا تھا۔ شانی نے اس کا بازو تھام کر جانے سے روکا پھر لکھا۔ ”بے شک میرے نانا جان کا احسان نہ لو۔ اخبار کی ملازمت چھوڑ دو لیکن آزاد صحافی کی حیثیت سے دوسرے اخبارات میں لکھتے رہو۔“

”میں یہی کروں گا اسی لیے اخبار سے اپنا تعلق ختم کرنے جا رہا ہوں۔“

”کوئی ضرورت نہیں ہے جانے کی۔ وہاں جاؤ گے تو تمہارا موڈ اور خراب ہو گا۔ ادھر دائیں طرف دیکھو۔ فٹ پاتھ پر ٹیلی کارڈ فون ہے۔ اس فون کے ذریعے اخبار کے مالک سے کہہ دو کہ اب اس دفتر میں کام نہیں کرو گے۔ اس اخبار کا مالک خود ہی تمہارے دادا جان سے بات کر لے گا۔“

سنی نے تحریری جواب نہیں دیا۔ ایک گہری سانس لے کر اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کبھی کبھی یوں لگتا ہے کہ تم میری بہن اور دوست ہی نہیں بلکہ اماں جان بھی ہو۔“

وہ دروازہ کھول کر باہر گیا۔ اس نے شانی کے مشورے پر عمل کیا۔ ٹیلی کارڈ فون کے ذریعے اخبار کے مالک سے مختصر طور پر کہہ دیا۔ شانی کے مشورے پر عمل کرنے کا فائدہ یہ ہوا کہ وہ اخبار کے مالک کو ملازمت چھوڑنے کی تفصیلات بتانے اور بحث کرنے سے محفوظ رہا۔ ذہن پر بھی کوئی بوجھ نہیں پڑا۔

وہ پچھلی سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔ کار اسٹارٹ ہونے والی تھی۔ اس سے پہلے صداقت علی کی کار ان کے برابر آ کر رک گئی۔ باپ بیٹی نے مسکراتے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھا۔ صداقت نے سنی سے پوچھا۔ "کیوں بیٹے؟ کہاں تفریح ہو رہی ہے۔"

"کیا بتاؤں انکل! میں بہت اپ سیٹ ہوں۔ شانی بہت حساس ہے۔ بہت محبت کرنے والی دادی اماں ہے۔ یہ میرا دل بہلانے کے لیے مجھے یہاں وہاں لیے پھر رہی ہے۔"

صداقت علی نے مسکرا کر کہا۔ "میری بیٹی مسیحا ہے۔ زخموں پر مرہم رکھتی ہے۔ کیا خیال ہے تھوڑا سا مرہم مجھے بھی رکھنے دو۔ میری گاڑی میں آ جاؤ۔ آگے چل کر کولڈ ڈرنک پئیں گے۔ اس کے بعد سیکیورٹی افسر کے ساتھ چلے جانا۔"

سنی نے ہاتھوں کے اشاروں سے بتایا کہ وہ اس کے پاپا کی کار میں بیٹھیں گے۔ کہیں جا کر کولڈ ڈرنک پئیں گے پھر اپنی کار میں واپس آ جائیں گے۔ اس نے سیکیورٹی افسر سے کہا۔ "ہم انکل کے پاس جا رہے ہیں۔ تم ہمارے پیچھے کار لے آؤ۔"

وہ دونوں اس کار سے نکل کر صداقت علی کی کار میں آ گئے۔ صداقت نے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ سیکیورٹی افسران کے پیچھے اپنی کار ڈرائیو کرنے لگا۔ اس کے علاوہ بہت سے سیکیورٹی گارڈز چار مختلف گاڑیوں میں شانی سے کافی فاصلہ رکھے بڑی فرض شناسی سے اس کی نگرانی کر رہے تھے اور دشمنوں پر نظر رکھنے کی کوششیں کر رہے تھے۔

شانی نے ایک کاغذ پر کچھ لکھ کر اپنے باپ کو دیا۔ باپ نے ایک ہاتھ سے کار ڈرائیو کرتے ہوئے پڑھا۔ اس نے لکھا تھا۔ "پاپا! میں نے صبح آپ کو بتایا تھا کہ دادا جان کے تمام رشتے بکھر گئے ہیں۔ سنی بہت حساس ہے۔ اس نے والدین کو چھوڑا اور نہ دادا



جان کو۔ بس عجیب حرکتیں کر رہا ہے۔ دونوں رشتوں کے درمیان اس نے ایک خیمہ لگایا ہے۔ وہ خیمہ ایک سنگم ہے۔ جب تک تمام بھٹکے ہوئے رشتے اس سنگم پر آ کر نہیں ملیں گے تب تک نہ وہ باپ کو تسلیم کرے گا اور نہ دادا جان کو۔ پلیز آپ اسے فرسٹریشن سے بچائیں۔"

صداقت نے اسے پڑھ کر کار ڈرائیو کرتے ہوئے کہا۔ "بیٹے سنی! تم تو بچپن سے ذہین اور زندہ دل ہو۔ بڑی سے بڑی بات کو مذاق میں اڑاتے رہے ہو۔ یہ تو سب جانتے اور مانتے ہیں کہ بے شمار خاندانوں کے افراد آپس میں لڑتے جھگڑتے اور بچھڑتے ہیں پھر حالات کے کسی موڑ پر آ کر مل جاتے ہیں۔"

"انکل! آپ دادا جان کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ وہ کبھی ان کی صورتیں دیکھنا نہیں چاہیں گے۔ ان کا مزاج ہی کچھ ایسا ہے۔ وہ تھوک کر کبھی نہیں چاٹتے۔"

"بیٹے! اولاد انتہائی کم ظرف ہو تو بزرگ انہیں اپنی ذات سے باہر نکالتے ہیں مگر غلاظت سمجھ کر کبھی نہیں تھوکتے پھر یہ کہ دوبارہ کیا چاٹیں گے جبکہ انہوں نے تھوکا ہی نہیں ہے۔ تمہارے ڈیڈی اور چچا نے خود انہیں چھوڑا ہے۔"

"جی ہاں۔ وہ سب خود ہی گئے ہیں لیکن دادا جان انہیں روک سکتے تھے۔"

"یہ ان کی ایک چال ہے۔ وہ اس ملک میں زیر زمین دنیا کے گاڈ فادر یونہی نہیں کہلاتے ہیں۔ ان کی ایک ایک بات میں گہرائی اور ایک ایک چال میں سیاسی اور نفسیاتی حکمت عملی ہوتی ہے۔"

"دادا جان نے خاندان کا شیرازہ بکھیرنے سے اپنے بیٹوں کو نہیں روکا۔ اس میں بھلا کیا حکمت عملی ہے؟"

"وہ ایک پتھر سے ایک بندہ نہیں مارتے' ایک سے زیادہ کو زمین بوس کر دیتے ہیں۔ انہوں نے تمہارے ڈیڈی اور انکل وغیرہ کو بری طرح ٹھوکریں کھانے کے لیے علیحدہ کیا ہے۔ دونوں بیٹے کھونٹے سے بندھے ہوئے بیل ہیں۔ رسے کی لمبائی تک بھاگیں گے پھر جھٹکے کھا کر واپس آئیں گے۔ یہ اپنے بچوں کے لیے ان کی نفسیاتی چال ہے اور سیاسی چال یہ ہے کہ وہ مخالف ایجنسی کے گاڈ فادر کو خوش فہمی میں مبتلا کر رہے ہیں۔

وہ گدھا فادر سمجھ رہا ہے کہ اس نے جوان بیٹوں کے ذریعے تمہارے دادا جان کی کمر توڑ دی ہے۔ بیٹوں سے زیادہ باپ کے اندرونی معاملات کو دوسرا کوئی نہیں جانتا۔ وہ مخالف گاڈ فادر جب بیٹوں کے ذریعے ان کے اندرونی راز اور خفیہ اہم ذرائع معلوم کرنا چاہے گا تب اسے معلوم ہوگا کہ تمہارے دادا جان قفل سلیمانی ہیں جسے کوئی کھول کر ان کے اندر نہیں جھانک سکتا۔"

"انکل آپ کی باتیں بڑا حوصلہ دے رہی ہیں۔ میرے دادا جان ذہانت کے اعتبار سے کبھی بوڑھے نہیں ہوں گے۔ کوئی سازش ان کی کمر نہیں توڑ سکے گی لیکن یہ کیا بات ہے کہ آپ ان کی مخالفت بھی کرتے رہتے ہیں اور تعریفیں بھی کر رہے ہیں؟"

"میں ان کی شیطانی ذہانت اور حکمت عملی کی تعریفیں کر رہا ہوں۔"

سنی نے جھینپ کر کہا۔ "آپ بھی میرے بزرگ ہیں اب میں کیا بحث کروں۔"

"بحث سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ یہ مقدر کا کھیل ہے۔ اس نے مجھے اور تمہارے دادا جان کو آگ اور پانی بنا دیا ہے۔"

وہ ایک سنیک بار کے سامنے رک گئے۔ صداقت نے کولڈ ڈرنک کا آرڈر دیا۔ دوسری کار میں بیٹھے ہوئے سیکیورٹی افسر کو بھی بوتل پلائی۔ سنی نے بوتل سے ایک گھونٹ پی کر کہا۔ "رشتے بھی عجیب ہوتے ہیں۔ اپنے بزرگوں سے لڑنے جھگڑنے اور الگ ہونے کے باوجود ان سے کوئی نامعلوم سا ذہنی لگاؤ ہوتا ہے۔ ہزار عداوت کے باوجود کوئی ہمارے باپ دادا کے لیے گالیاں نکالے تو ہمارا خون کھول جاتا ہے۔"

"یہ پرانی کہاوت ہے کہ پانی میں لاٹھی مارو تو پانی الگ نہیں ہوتا لیکن پانی میں زہر تو گھل سکتا ہے۔ نفرت کا زہر' فرسٹریشن کا زہر۔ تم صبح سے ذہنی انتشار میں مبتلا ہو۔ آج پہلا دن ہے۔ پتہ نہیں آگے چل کر تم کس قدر جذباتی اور جنونی ہوتے رہو گے۔ میرا مشورہ مانو' کچھ دنوں کے لیے یہ شہر چھوڑ دو۔ تمام رشتے داروں سے دور رہ کر صرف اپنی صحافت کے پیشے سے دل لگاؤ۔"

"میں نے صبح سے کئی بار سوچا ہے کہ اپنے لوگوں سے دور بہت دور چلا جاؤں۔ مجھے صرف دو وقت کی روٹی چاہیے' میں کالم لکھ کر یا کسی طرح کی محنت مزدوری کر کے



اپنی ضرورتیں پوری کرلوں گا۔"

"تمہیں کوئی دوسرا کام کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ میں نے تمہارے کالم پڑھے ہیں۔ تمہارے اندر ایک سچا صحافی بیٹھا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے چاہا تو تمہیں بہت عروج حاصل ہوگا۔"

"مجھے واقعی موجودہ گھریلو تنازعات سے دور رہنا چاہیے۔ لاہور میں میرے کئی صحافی دوست ہیں۔ اگر وہاں چلا جاؤں تو وہ مجھے ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔ مجھے خبروں کی کوریج اور کالم نویسی کے لیے بہت اچھا ماحول ملے گا۔"

صداقت نے پی آئی اے کے ایک بکنگ آفس کے سامنے کار روک دی پھر کہا۔ "بیٹے! میں نے یہاں سے جانے کا مشورہ سوچ سمجھ کر دیا ہے۔ ابھی آکر بتاؤں گا۔ ذرا انتظار کرو۔"

وہ کار سے اتر کر بکنگ آفس کی طرف چلا گیا۔ شانی نے کاغذ پر لکھ کر پوچھا۔ "پاپا سے کیا باتیں ہو رہی تھیں؟ وہ کہاں گئے ہیں؟"

سنی اس سے قلم لے کر اس سوال کا تفصیلی جواب لکھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد صداقت واپس آگیا۔ سنی کے پاس کار کی کھڑکی کے پاس جھک کر اسے ایک فلائٹ کا ٹکٹ دیتے ہوئے کہا۔ "آج رات آٹھ بجے کی فلائٹ ہے۔ میں نے آج صبح انیکسی سے نکلتے وقت کوٹھی کے سامنے تمہارا خیمہ دیکھا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نہ تمہارا گھر ہے نہ گرہستی کا سامان ہے۔ تمہیں سفر کی تیاری نہیں کرنی ہوگی۔ خانہ بدوشوں کی طرح جب چاہو گے راستے اور منزلیں بدلتے رہو گے۔"

وہ بولتا ہوا اسٹیئرنگ سیٹ پر آکر بیٹھ گیا پھر ڈیش بورڈ کھول کر اس میں سے بڑے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی۔ اسے پچھلی سیٹ کی طرف سنی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ تمہارے لیے ہیں۔ فی الحال تیس ہزار روپے ہیں۔"

"انکل! یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ مجھے سہارا لیے بغیر محنت سے کمانے کی نصیحت کریں۔"

"مجھے تمہاری خودداری پسند ہے۔ میرے یہ تیس ہزار تم پر قرض رہیں گے۔ یوں

تمہیں اپنی زندگی گزارنے کے علاوہ اس قرض کی ادائیگی کی فکر رہے گی۔ میں قومی خزانے سے قرضہ لینے والے سیاستدانوں اور بڑے بااختیار لوگوں کو معاف نہیں کرتا پھر اپنی جیب سے دی ہوئی رقم تمہیں کیسے معاف کروں گا۔ تم یہ رقم مجھے قسطوں میں ادا کرو گے۔ قرض اس لیے دے رہا ہوں کی دربدری میں کسی کے محتاج نہ رہو۔"

شانی نے باپ کے ہاتھ سے نوٹوں کی گڈی لی پھر مسکراتے ہوئے سنی کی ہتھیلی کھول کر اس پر رکھ دی۔ وہ بولا۔ "مجھے لینا ہی پڑے گا کیونکہ میں ضرورت مند بھی ہوں اور یہ ایک قرضہ بھی ہے۔ ویسے یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ شہر چھوڑ دینے کا مشورہ دیتے ہی یہ ٹکٹ کیوں لے آئے؟ آپ کیوں چاہتے ہیں کہ میں آج ہی یہاں سے چلا جاؤں؟"

"تمہارے ڈیڈی' انکل اور جمشید اور روبی نے گھر چھوڑ کر بہت بڑی غلطی کی ہے۔ وکیل کی موجودگی میں پکے کاغذ پر جو کچھ لکھا ہے اس سے باپ سے عداوت اور علیحدگی کا ثبوت پکا ہو گیا ہے۔ ایسے میں مخالف پارٹی ان کی کوٹھی میں کوئی واردات کرے گی تو پولیس والوں کو عداوت اور علیحدگی کے باعث تمہارے والد اور انکل پر شبہ ہو گا۔ تم پر بھی شبہ ہو گا کہ تم واردات کرنے کی نیت سے دور نہیں گئے تھے کوٹھی کے سامنے ہی تھے اور واردات کے سلسلے میں مخالف پارٹی تمہاری پشت پناہی کر رہی تھی۔"

"انکل! اس کا مطلب ہے کہ دشمن میرے دادا جان کو نقصان پہنچائیں گے اور آپ اتنی معلومات کے بعد کیا کارروائی کریں گے۔"

"میری کارروائیاں مختلف نوعیت کی ہوتی ہیں۔ جس طرح تمہیں دور بھیج رہا ہوں اسی طرح تمہارے دادا جان کو آج رات ان کی کوٹھی میں نہیں جانے دوں گا۔ ان کے معاملات اتنے پھیلے ہوئے ہیں کہ میں ان کے ہی معاملات میں انہیں صبح تک الجھائے رکھوں گا۔ وہ کوٹھی خالی رہے گی۔ باہر سیکیورٹی گارڈز موجود رہیں گے تو کوئی دولت کی خاطر ڈاکا ڈالنے نہیں آئے گا۔ مخالف گاڈفادر کچھ اہم دستاویزات وہاں سے نکالنے کی کوشش کرے گا اور وہ اس سلسلے میں کیسا طریقہ کار اختیار کرے گا یہی میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ بس تم شانی کے ساتھ اس گاڑی میں جاؤ۔"



"انکل! میں بڑی دیر سے ہاجرہ آنٹی کے متعلق پوچھنا چاہتا تھا لیکن گفتگو کا موضوع بدلتا رہا۔ آپ اور دادا جان اتنے زبردست ہیں کہ دشمن ان کے سائے سے بھی بھاگتے ہیں۔ ایسے میں انہوں نے ہماری آنٹی کو اغوا کرنے کی جرأت کیسے کی؟ آپ ان کی بازیابی کے لیے کیا کر رہے ہیں؟"

"بیٹے! ہر کام اپنے وقت پر ہوتا ہے۔ مجھے اس حد تک معلومات حاصل ہو گئی ہیں کہ وہ جہاں بھی ہیں' بڑے آرام سے ہیں۔ دشمن میری شریک حیات کو اغوا کرنے کا حوصلہ کرنے کے باوجود جانتا ہے کہ میری شریک حیات کو عزت دے گا تو آئندہ میں بھی اس دشمن سے نرم رویہ رکھوں گا۔ تم آنٹی کی فکر نہ کرو۔ شانی کے ساتھ جاؤ۔"

پھر باپ نے اشاروں کی زبان میں بیٹی سے کچھ باتیں کیں۔ اس کے بعد وہ سنی کے ساتھ گاڑی سے اتر کر سیکیورٹی افسر والی گاڑی میں آ کر بیٹھ گئی۔

جب وہ گاڑی اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھ گئی اور دور جا کر نظروں سے اوجھل ہو گئی تو ایک شخص کار کے قریب آیا۔ صداقت نے کہا۔ "آؤ بیٹھ جاؤ۔"

صداقت نے اگلی سیٹ کا دروازہ کھولا۔ وہ شخص شکریہ ادا کرتے ہوئے اگلی سیٹ پر بیٹھ کر دروازہ بند کرتے ہوئے بولا۔ "سر! کام ہو گیا؟"

وہ کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھتا ہوا بولا۔ "ہاں۔ سنی آٹھ بجے کی فلائٹ سے لاہور جائے گا۔ میری بیٹی اسے سی آف کرنے ایئرپورٹ جائے گی۔ ابھی تھوڑی دیر بعد پیر عظمت اللہ شاہ سلطانی کو ایسا زبردست جھٹکا پہنچے گا کہ وہ صبح تک اپنی کوٹھی میں آرام سے سونے کے لیے نہیں آ سکے گا۔ اب اپنے انتظامات بتاؤ۔"

"سر! آپ کی ہدایات کے مطابق انتظامات مکمل ہیں۔ ہمارا تعلق پولیس اور انٹیلی جنس سے نہیں ہے۔ ہم آپ کے خفیہ جاسوس ہیں۔ ہمارے چھ جاسوس پولیس کی وردی میں ہوں گے۔ میں آپ کے ساتھ سادے لباس میں رہوں گا۔ ہمیں وقت بتا دیں۔ کس وقت آپ سے ملاقات ہو گی؟"

"میں ساڑھے سات بجے اپنے سرکاری بنگلے میں رہوں گا۔ ہم وہاں سے آٹھ بجے تک پیر شاہ سلطانی کی کوٹھی تک پہنچ جائیں گے۔"

اس نے سڑک کے کنارے کار روک دی پھر کہا۔ "وقت کی پابندی ضروری ہے
اب چلو۔"

وہ سلام کرتا ہوا کار سے باہر آگیا اور دروازے کو بند کر دیا۔ صداقت کار ڈرائیو کرتا ہوا آگے جانے لگا۔ اس وقت شام کے پانچ بجنے والے تھے۔ وہ اپنے بنگلے میں پہنچا۔ سرکاری ملازم نے دروازہ کھولا پھر پوچھا۔ "چائے لاؤں؟"

"نہیں' میں تنہائی چاہتا ہوں۔ فون کا پلگ نکال دو۔ میری کار باہر کھڑی ہے۔ اسے دیکھ کر کوئی ملاقات کرنا چاہے گا تو کہہ دینا میں کمشنر صاحب کے ساتھ ان کی گاڑی میں گیا ہوں۔ میری واپسی آدھی رات سے پہلے نہیں ہو گی۔"

ملازم نے کمرے سے باہر جاتے ہوئے دروازہ بند کر دیا۔ اس کے جانے کے بعد وہ جوتوں سمیت بستر پر آ کر لیٹ گیا پھر آنکھیں بند کر لیں۔ اس رات اسے دو منصوبوں پر عمل کرنا تھا۔ وہ ان منصوبوں پر پھر سے غور کرنے لگا تاکہ کوئی کمزور پہلو ایسا نہ رہ جائے جو ناکامی کا سبب بنے۔

وہ بڑی دیر تک غور کرتا رہا۔ پھر موبائل فون نے اسے متوجہ کیا۔ اس نے فون اٹھا کر اس کا بٹن دبایا پھر کہا۔ "یقیناً تم ہو۔"

ہاجرہ کی آواز آئی۔ "جی ہاں۔ میں ہی بدنصیب ہوں۔ صبح گیارہ بجے سے اب تک کئی بار فون کر چکی ہوں کیا آپ نے موبائل بند کر رکھا تھا؟"

"فون میں خرابی ہو گئی تھی۔ ایک ماہر اسے درست کر رہا تھا۔"

"میں نے آپ کے سرکاری بنگلے میں بھی فون کیا تھا۔ ملازم ہر بار یہی کہتا رہا آپ کسی کام سے باہر گئے ہیں۔"

"تم اچھی طرح سمجھ سکتی ہو کہ میں تمہیں ڈھونڈ نکالنے کے لیے اس شہر میں بھٹک پھر رہا ہوں۔ اگر تمہاری ہلکی سی خوشبو مجھ تک پہنچے گی تو میں تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔"

"قدرتی طور پر پسینے کی ملاوٹ سے انسانی جسم میں جو مہک پیدا ہوتی ہے۔ وہ بیوی کی قربت سے ہوتی ہے اور ہم قریب نہیں ہیں۔ نہ آپ میری مہک پائیں گے



میرا سراغ لگا سکیں گے۔"

"اتنی سی عقل مجھ میں ہے۔ میں بدن کی قدرتی مہک کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ بھئی جو تمہارے کھانے پینے اور آرام کرنے کا خیال رکھتا ہے' جس نے تمہیں گفتگو کرنے کے لیے اپنا موبائل فون دیا ہے وہ تمہاری فرمائش پر پرفیوم کی بڑی شیشی لا کر دے گا۔ تم اس سے پرفیوم لے کر مجھے خوشبو کا نام بتا دینا اور اسے وقفے وقفے سے روشن دان پر اسپرے کرتی رہنا۔ میں تلاش کے دوران ضرور اس جگہ سے گزروں گا اور اس مہک کے ساتھ تمہیں بھی پالوں گا۔"

"آپ ترکیب اچھی سوچتے ہیں لیکن دشمن نادان نہیں ہے۔ یہ موبائل فون اس نے صرف آپ سے سودے بازی اور سمجھوتے کے لیے دیا ہے۔ میں نے اس سے التجا کی تھی کہ وہ مجھے اس شہر میں ابا حضور کے قریب رہنے دے۔ میں نے قسم کھا کر یقین دلایا کہ آپ اپنی بیٹی کے ساتھ لندن چلے جائیں گے پھر کبھی واپس نہیں آئیں گے۔ میں آپ سے ملاقات کرنے کبھی کبھی لندن چلی جایا کروں گی لیکن اس نے بڑا سخت رویہ اختیار کیا ہے۔ وہ ایک ہی بات کہتا ہے کہ آپ کے جانے کے بعد مجھے بھی یہاں سے آپ کے پاس بھیج دے گا۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ میری کوئی فرمائش پوری نہیں کرتا ہے اور نہ ہی میری قسموں پر یقین کرتا ہے۔ ایسا شخص مجھے کبھی پرفیوم لا کر نہیں دے گا۔"

"چلو کوئی بات نہیں۔ آج صبح جب تم مجھ سے باتیں کر رہی تھیں تو مجھے فون کے ذریعے کلام پاک کی تلاوت سنائی دے رہی تھی۔"

"جی ہاں۔ اس نے مجھے عبادت کرنے اور کیسٹ کے ذریعے کلام پاک کی تلاوت سننے کی اجازت دی ہے۔"

"پھر تو کام بن گیا۔ تم تلاوت سنتی رہو۔ اس کی آواز ذرا بڑھا دو۔ مجھے بتا دو کہ کس سپارے کی کون کون سی آیتوں کی تلاوت کیسٹ میں ہے۔ ہو سکتا ہے کسی گلی یا سڑک سے گزرتے وقت اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی آواز میرے کانوں تک پہنچ جائے۔"

"اس میں شبہ نہیں کہ آپ مجھ تک پہنچنے کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں لیکن دشمن بھی چالاک ہے۔ میں نے ایک بار آواز ذرا تیز کی تھی تو اس کے ایک مسلح گارڈ نے

آ کر آواز دھیمی کر دی۔"

"کیسٹ ریکارڈر کی آواز ختم کی جاسکتی ہے لیکن خدا کی آواز کو کوئی دبا نہیں سکتا۔ جہاں تم ہو وہاں قریب یا ذرا دور کوئی مسجد ہو گی۔"

"جی ہاں۔ کسی مسجد سے اذان کی آواز سنائی دیتی ہے۔"

"گھڑی دیکھو۔ مغرب کا وقت ہو رہا ہے۔ اذان ہونے والی ہے۔ اس فون کو آن رکھو۔ مجھے وہاں کی پوری اذان سناؤ۔ میں مؤذن کی آواز اور لہجے کا سراغ لگا کر اس علاقے تک پہنچ جاؤں گا۔"

"واقعی آپ باکمال ہیں۔ میں ابھی فون بند کر رہی ہوں جیسے ہی اذان شروع ہو گی میں آپ سے رابطہ کرلوں گی۔"

اس نے فون بند کر دیا۔ صداقت علی نے بنگلے کے فون کا پلگ لگایا پھر ایک کیسٹ ریکارڈر لا کر سینٹر ٹیبل پر رکھا۔ اس کے بعد بنگلے کے فون کے ذریعے اپنے ذاتی جاسوس کو مخاطب کیا۔ "ہیلو سکندر! جہاں میری بیوی کو قید کیا گیا ہے وہاں سے ابھی اذان کی آواز سنائی دے گی۔ تم وہ مقدس آواز ابھی فون پر سنو گے اور مؤذن کی آواز اور لہجے کو یاد رکھنے کی کوشش کرو گے۔ میں اس آواز کو ایک کیسٹ میں بھی ریکارڈ کر رہا ہوں۔"

"یس سر! یہ ریسیور میرے کان سے لگا رہے گا اور میں پوری توجہ سے اذان کے ایک ایک لفظ کی ادائیگی کو ذہن نشین کروں گا۔"

وہ دونوں انتظار کرنے لگے۔ صداقت علی جس سرکاری بنگلے میں تھا وہاں کی قریبی مسجد سے اذان کی آواز آنے لگی۔ اس کے خاص ماتحت سکندر نے کہا۔ "سر! میں سن رہا ہوں۔"

"او نو سکندر! یہ آواز میرے بنگلے کے پاس والی مسجد سے آ رہی ہے۔"

ایک اور مسجد سے آواز آنے لگی۔ صداقت علی نے کہا۔ "یہ بھی کسی دوسری مسجد کی آواز ہے۔ میری بیوی نے ابھی تک رابطہ نہیں کیا ہے۔ میں اسے مخاطب کروں گا سمجھ لینا کہ اس وقت سنائی دینے والی آواز ہماری مطلوبہ آواز ہے۔"

"لیکن سر! اس طرح دو چار مسجدوں سے بیک وقت آوازیں سنائی دیں گی تو



مطلوبہ آواز کو بخوبی سمجھ نہیں پائیں گے۔"

انتظار کے دوران قریبی مسجدوں سے آنے والی اذانیں پوری ہو گئیں۔ چند لمحوں کے بعد ہاجرہ نے صداقت کو مخاطب کیا۔ وہ بولا۔ "ہیلو ہاجرہ! میں انتظار کر رہا ہوں۔"

ہاجرہ نے کہا۔ "میں نے ابھی مائیک کی کھڑکھڑاہٹ سنی ہے۔ یہ سنئے اذان شروع ہو چکی ہے۔"

صداقت نے ریکارڈنگ کے دو بٹن دبائے۔ اپنے فون کو سکندر سے منسلک رہنے والے فون کے ریسیور اور ریکارڈر کے مائیک کے قریب رکھا۔ یوں اس مطلوبہ اذان کی آواز ریکارڈ بھی ہونے لگی اور صداقت کے ساتھ دوسری طرف سکندر بھی سننے لگا پھر وہ اذان مکمل ہو گئی۔ خاموشی چھا گئی۔ ہاجرہ نے پوچھا۔ "کیا اذان پوری طرح سنائی دے رہی تھی؟"

"ہاں۔ میں نے سنی بھی ہے اور اسے ریکارڈ بھی کیا ہے۔ یہ بتاؤ جس کمرے میں تمہیں قید کیا گیا ہے اس کے سائز اور اس کے اندرونی سامان سے تم کیا اندازہ لگاتی ہو؟ کمرے میں صرف ضروریات زندگی کا سامان ہے یا وہ ویل فرنش ہے؟"

"کمرا ویل فرنش ہے۔ بہت ہی قیمتی آرائشی سامان ہے اچھے بڑے سائز کا کمرا ہے۔ اندازہ ہوتا ہے کہ ایسے کمرے ان کوٹھیوں میں ہوتے ہیں جو سوسائٹی اور ڈیفنس کے علاقوں میں ہوا کرتی ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں پہلے انہی دو علاقوں میں اس مؤذن کو تلاش کروں گا پھر اس مسجد کے آس پاس کی کوٹھیوں کو اپنے طریقہ کار کے مطابق مارک آؤٹ کروں گا۔"

"صداقت! آپ کو علی بابا اور چالیس چور کی کہانی یاد ہو گی۔ ایک ڈاکو نے اپنے سردار کے حکم پر علی بابا کا مکان تلاش کیا تھا اور اس کے دروازے پر چاک سے کراس کا نشان لگا دیا تھا۔ علی بابا کی ملازمہ مرجینا نے ڈاکو کی یہ حرکت دیکھ لی تھی اس نے اپنے آقا علی بابا کو محفوظ رکھنے کے لیے ٹھیک ایسا ہی کراس کا نشان چاک سے آس پاس کے مکانوں کے دروازے پر لگا دیا۔ جب وہ ڈاکو اپنے سردار اور گروہ کو لے کر آیا تو کئی مکانات کے دروازے پر ایک جیسے نشانات دیکھ کر الجھ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس نے کس

مکان کو اپنے چاک سے مارک آؤٹ کیا تھا۔ آپ بھی مارک آؤٹ کرنے سے پہلے مخالفین کی چالاکیوں کو مدنظر رکھیں۔"

"ہاجرہ! تم میری بہت ہی کارآمد بیوی ہو۔"

"آپ نے مجھے کارآمد کیوں کہا؟ ذہین کیوں نہ کہا؟"

"اس لیے کہ بعض بیویاں ذہین نہ ہونے کے باوجود کسی آزمائشی وقت پر کام آ جاتی ہیں۔ ابھی تم نے علی بابا اور چالیس چور کی کہانی سنا کر صرف اتنی سی عام ذہانت کا مظاہرہ کیا اور مجھے سمجھایا کہ مخالفین چالاک ہوتے ہیں۔ یہ کوئی ذہانت نہیں ہے۔ سب ہی کہتے ہیں کہ دشمنوں کو نادان نہ سمجھا کرو۔"

"آپ مجازی خدا ہیں۔ مان لیتی ہوں کہ ابھی کسی خاص ذہانت کا ثبوت نہیں دیا ہے۔ اس کے باوجود یہ کہانی سنا کر آپ کے لیے کارآمد کیسے ہو گئی؟"

"تم نے نادانستگی میں مجھے یہ نکتہ سمجھایا ہے کہ تمہارے اغوا کے کیس میں کسی مرجینا کے کردار کی گنجائش ہے۔"

"آں؟" وہ چپ ہو گئی۔ ذرا حیران ہوئی پھر بولی۔ "جب سے میں یہاں قید ہوں کسی عورت کو نہ اپنے پاس آتے دیکھا اور نہ ہی کسی عورت کی آواز سنی ہے پھر کسی مرجینا کے کردار کی گنجائش کیسے پیدا کر رہے ہیں؟"

"بھئی میں سراغرسانوں کا سربراہ ہوں۔ اس کیس میں ایک مرجینا کا اضافہ کرلوں گا تو کیا فرق پڑے گا۔ ہم جاسوس ایسے ہوتے ہیں کہ اپنے سائے پر بھی شبہ کرتے ہیں۔ اپنے باپ اور بھائیوں کو بھی دیکھتے ہیں تو وہ ہمیں مشکوک نظر آتے ہیں۔"

"آپ اپنے فرائض کو خوب سمجھتے ہیں۔ پلیز جلد سے جلد کچھ کریں۔ میں کب تک اس چاردیواری میں قید رہوں گی؟"

"صبح سے پہلے دو میں سے ایک کام ہوگا۔ تمہیں اس چاردیواری سے نکال لاؤں گا۔ ایسا نہ کرسکا تو کل شام تک بیٹی کے ساتھ لندن جاکر دشمن کی خواہش پوری کردوں گا۔"

اس نے موبائل فون کو بند کیا پھر سرکاری بنگلے کے فون کے ریسیور کو کان سے لگا



کر کہا۔ "ہیلو سکندر! تم نے ہماری گفتگو سنی؟"

"یس سر! لیکن آپ کی باتیں الجھی ہوئی تھیں۔"

"اسے ٹریننگ سمجھو اور سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں اذان والے کیسٹ کی دوسری کاپی تیار کر رہا ہوں۔ اپنے ماتحت سے کہو' وہ کیسٹ لے کر پہلے ڈیفنس کی تمام مسجدوں میں جائے اور وہاں کے تمام مؤذن اور پیش امام حضرات کو سنائے۔ ڈیفنس اور سوسائٹی کے علاقوں میں ہم منزل کے قریب پہنچ سکتے ہیں۔"

"یس سر! میں اپنی ٹیم کے ساتھ دوسری مہم پر جانے کے لیے آپ کے پاس ابھی آؤں گا تو وہ کیسٹ آپ سے لے کر اپنے اسسٹنٹ کو دے دوں گا۔ وہ اپنی مہم پر کام کرتا رہے گا۔"

صداقت علی نے ریسیور کو کریڈل پر رکھ دیا۔

★============★============★

ایک ہاتھ نے کریڈل سے ریسیور اٹھایا۔ دوسرے ہاتھ کی انگلی نمبر ڈائل کرنے لگی۔ وہ ایئرپورٹ کے کسٹم افسر کا کمرا تھا۔ افسر کے سامنے میز کے دوسری طرف ایک خوبرو جوان کان سے ریسیور لگائے کہہ رہا تھا۔ "وڈے سائیں کو فون دو۔ بولو کہ ان کا بیٹا بول رہا ہے۔"

دوسری طرف سے چند لمحوں کے بعد ہی سائیں رب راکھن کی مسرت بھری آواز سنائی دی۔ "بیٹے سچل نواز! یہ تم فون کر رہے ہو؟ ذرا اپنی آواز سناؤ۔ بیٹے کی آواز باپ کے بڑھاپے میں آکسیجن کی تمام کمی پوری کر دیتی ہے۔"

"بابا سائیں! اگر یہ آکسیجن آپ کی سانسوں کے بالکل قریب پہنچ جائے تو۔"

"تو باپ کی عید ہو جائے گی۔ پوری حویلی اور پورے گوٹھ میں جشن منایا جائے گا۔"

"تو پھر آپ کی عید کا چاند کراچی پہنچ گیا ہے۔ ایئرپورٹ کے کسٹم آفس سے بول رہا ہوں۔"

"ارے بیٹا! تم پاکستان آ گئے ہو۔ مجھے اطلاع بھی نہیں دی۔ ایسی خوش خبری سناؤ

گے تو باپ کا دل دھڑکنا بند ہو جائے گا۔"

"بابا سائیں! آپ کا سایہ ہمیشہ میرے سر پر رہے۔ ویسے آپ تو مجھے لینے دوڑے چلے آئیں گے؟"

"یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے۔ بس سمجھو کہ تمہیں گلے لگانے کے لیے یہاں سے چل پڑا ہوں۔ تم میرے آنے تک ڈیفنس والی کوٹھی میں رہو۔"

"سوری۔ آپ باپ ہو کر بیٹے کے جذبات کو بھول رہے ہیں۔ میں پہلے ڈیفنس والی کوٹھی میں نہیں' پہلے اپنی ماں جی کے قدموں میں جاؤں گا۔"

سائیں رب راکھن ذرا تلملایا پھر ناگواری سے بولا۔ "خوشی کے موقع پر دکھ دینے والی باتیں نہ کیا کرو۔ ٹھیک ہے اس کے پاس جاؤ لیکن کل صبح تک واپس آ جانا' میں کراچی پہنچ کر اپنی کوٹھی میں انتظار کروں گا۔"

"تھینک یو بابا سائیں! آپ نے فراخ دلی کا مظاہرہ کیا ہے۔"

"نہ بھی کرتا تو تم ضرور اس سے ملنے جاتے۔"

"میں کیا کروں؟ آپ اور ماں جی دو الگ جزیرے بن گئے ہیں۔ ان جزیروں کے درمیان میں ایک کشتی کی طرح ڈول رہا ہوں۔ کبھی اس جزیرے اور کبھی اس جزیرے پر لنگر انداز ہوتا رہتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے' ابھی ڈول رہے ہو مگر میرا دل کہتا ہے' دنیا کہتی ہے کہ بیٹا آخر باپ کا ہی ہوتا ہے۔ ابھی اُدھر جاؤ' کل صبح ملاقات ہو گی۔"

رابطہ ختم ہو گیا۔ اس نے ریسیور رکھ دیا۔ کسٹم افسر نے کہا۔ "میں تو آپ کے بابا سائیں کا پرانا خادم ہوں۔ ان کے گھریلو حالات جانتا ہوں۔ آپ ایک سچے سعادت مند بیٹے ہیں۔ ماں باپ کے ذاتی جھگڑوں میں نہیں پڑتے۔ ماں جی کا اتنا ہی احترام کرتے ہیں جتنا کہ بابا سائیں کا.........."

کسٹم کا ایک جونیئر افسر ایک ٹرالی میں سچل نواز کا سامان لے آیا۔ افسر نے کہا۔ "سائیں! ہمیں تو آپ کے سامان کو چیک کرنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ آپ کی ضد کے باعث چیکنگ ہو چکی ہے۔ اندر ایمان ہو تو ایمان ہی نکلے گا' کھوٹے سکے نہیں نکلیں گے۔"



سچل نواز نے کرسی سے اٹھ کر کہا۔ "میں لباس بدلنا چاہتا ہوں۔ میری ماں جی مجھے پینٹ شرٹ اور نکٹائی میں پسند نہیں کریں گی۔"

افسر نے کہا۔ "نو پرابلم۔ یہ پیچھے میرا ایک اور کمرہ ہے' وہاں جا کر لباس بدل لیں۔"

وہ ٹرالی پر رکھے ہوئے سامان کے پاس آیا۔ سب سے اوپر رکھی ہوئی اٹیچی کو کھولنے کے لیے جونیئر افسر سے اپنی چابیاں طلب کیں۔ جونیئر نے پریشان ہو کر اپنے سینئر کو دیکھا۔ سینئر افسر نے کہا۔ "بھئی ان کے سامان کی چابیاں ہیں۔ انہیں دے دو۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔"

جونیئر نے چابیاں دیں۔ سچل نے ایک چابی سے اٹیچی کھولی۔ اوپر رکھے ہوئے لباس کو اٹھایا تو ٹھٹک سا گیا۔ لباس کے نیچے اٹیچی کیس کے اندر سونے کے بسکٹ تھے۔ سچل نے جونیئر کو دیکھ کر غرا کر پوچھا۔ "یہ کیا حرکت ہے؟"

سینئر افسر نے کہا۔ "سچل صاحب! ناراض نہ ہوں۔ آپ کے بابا سائیں کو بسکٹ کھانے کا شوق ہے۔ انہوں نے انفارم کیا تھا کہ جو اسمگلر یہ مال لے کر مڈل ایسٹ سے آ رہے ہیں انہیں ایک اٹیچی مال کے ساتھ گرفتار کر کے ہم اپنی کارکردگی دکھائیں' باقی دو اٹیچیوں کا مال آپ کے سامان میں منتقل کر دیں۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ بابا سائیں کو معلوم تھا کہ میں امریکا سے سعودی عرب جاؤں گا پھر وہاں سے یہاں آؤں گا۔"

"سچل سائیں! آپ بیٹے ہو کر بھی نہیں جان سکتے کہ آپ کے بابا سائیں کتنے پہنچے ہوئے ہیں اور کہاں کہاں تک پہنچے ہوئے ہیں۔"

سچل نے چمکتے ہوئے سونے کے بسکٹوں کو دیکھا۔ افسر کے بیان کے مطابق اس کی دو اٹیچیاں ایسے خزانے سے بھری ہوئی تھیں۔ اس نے اوپر والی اٹیچی کو بند کر کے لاک کیا پھر لباس بدلنے کے لیے خاموشی سے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

وہ نیویارک سے جدہ گیا تھا۔ وہاں اس کے بچپن کا ایک بہت اچھا ہم مزاج دوست تھا۔ اس کے ساتھ ایک دن ایک رات گزارنے کے بعد کراچی کے لیے روانہ ہوا تھا اور

یہ سوچ کر مسکراتا رہا تھا کہ اچانک وہاں پہنچ کر ماں باپ کو سرپرائز دے گا لیکن باپ نے اسے سرپرائز دے کر ثابت کیا تھا کہ وہ بڑی دور تک نظر رکھتا ہے۔ کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ بیٹے کی آمد کا اسے علم تھا۔ لہٰذا اس نے اصل اسمگلر کو ایک پیٹی مال کے ساتھ گرفتار کرا کے کسٹم افسران کی ترقیوں کا سامان کر کے باقی دو پیٹی مال اپنے بیٹے کے سامان میں رکھوا دیا تھا۔

سچل نواز لباس بدل کر سینئر افسر کے کمرے میں آیا۔ اب اس کے سر پر سندھی ٹوپی اور بدن پر شلوار قمیض تھی۔ شانوں پر ایک اجرک پڑی ہوئی تھی۔ سینئر افسر نے اسے تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "بھئی واہ! آپ کتنے قد آور اور شاندار سندھی لگ رہے ہیں۔"

وہ ٹرالی کو چلاتا ہوا دفتر سے باہر آیا۔ جناح ٹرمینل کی عمارت بڑی شاندار بنائی گئی تھی۔ وہ دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ وہاں کے مختلف حصوں سے گزر رہا تھا۔ ارادہ تھا کہ کسی ٹیکسی میں بیٹھ کر اپنی ماں جی کے پاس جلد سے جلد پہنچے لیکن وہ خودکار زینوں کے پاس آ کر ایسے رک گیا جیسے تقدیر نے بریک لگا کر روک دیا ہو۔

ایک خودکار زینے سے شانی اور سنی اترتے آ رہے تھے۔ سچل پلکیں جھپکائے بغیر اسے یوں دیکھ رہا تھا جیسے زینے سے نہیں' بلکہ آسمان سے کوئی حور اتر کر آ رہی ہو۔ اس کا لباس' شانوں پر بکھری ہوئی زلفیں اور گورے گلابی مکھڑے پر سیاہ چشمہ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ چشمہ نہ ہو' اس گوری کو نظر بد سے بچائے رکھنے کے لیے کالا ٹیکا لگایا گیا ہو۔ اس کی چال اس کی شان بے نیازی بتا رہی تھی کہ وہ بہت ہی ماڈرن ہے اور ابھی شاید کسی یورپی ملک سے آئی ہے۔

حالانکہ سنی لاہور جا رہا تھا۔ وہ اسے رخصت کرنے آئی تھی۔ اس کے ساتھ جدھر جا رہی تھی ادھر سچل کی نظریں ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ سنی کو بورڈنگ کارڈ حاصل کرنا تھا۔ وہ دونوں ایک گیٹ پر آ کر رک گئے۔ گیٹ کے اندر صرف مسافر جا سکتے تھے۔ جانے سے پہلے وہ سنی سے اشاروں کی زبان میں کچھ کہنے لگی۔ سچل کے دل کو ٹھیس پہنچی۔ "آہ! اتنی حسین و جمیل دوشیزہ گونگی ہے۔ دل نہیں مانتا کہ یہ زبان سے بولتی نہیں



ہوگی..........."

سنی نے بھی اس کے جواب میں اشاروں کی زبان استعمال کی۔ تب سچل نے ایک ذرا اطمینان سے سوچا۔ "دراصل وہ نوجوان گونگا ہے اس لیے وہ حسینہ اس سے گونگے اشاروں میں بول رہی ہے۔"

ان دونوں نے اشاروں میں مختصر سی الوداعی گفتگو کی پھر سنی بورڈنگ کارڈ لینے اندر چلا گیا۔ وہ تنہا رہ گئی۔ شیشے کی بڑی دیوار کے پاس آ کر وہاں سے سنی کو دیکھنے لگی۔

سچل نے یورپ' امریکا اور مڈل ایسٹ میں کئی برس گزارے تھے۔ بے شمار حسیناؤں سے دور کی دوستی رکھتا رہا تھا۔ کبھی کسی کو اپنانے کے لیے دل نے منظوری نہیں دی تھی۔ اس وقت پہلی بار تیزی سے دھڑکتے ہوئے دل نے تین بار "قبول ہے" کہہ دیا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا آیا۔ ٹرالی کو ایک طرف روک دیا۔ پھر جھجکتا ہوا شیشے کی دیوار کے پاس آیا۔ وہ شیشے پر دونوں ہاتھ رکھے کھڑی تھی۔ سچل نے حوصلہ کرتے ہوئے آہستگی سے کہا۔ "سنئے.........."

وہ قوت سماعت کی حامل ہوتی تو سنتی۔ وہ تو دنیا والوں سے بے نیاز ہو کر سنی کو دیکھ رہی تھی۔ وہ بورڈنگ کارڈ حاصل کرنے کے بعد ویٹنگ ہال کی طرف جا رہا تھا۔ اسے بھی دیکھتا جا رہا تھا۔ جب وہ دوسرے گیٹ سے گزر کر نظروں سے اوجھل ہو گیا تو سچل نے کہا۔ "تمہارا ساتھی جا چکا ہے۔ کیا ہم ایک دوسرے سے متعارف ہو سکتے ہیں؟"

اسے جواب نہیں ملا۔ وہ اس گیٹ کی سمت دیکھ رہی تھی جہاں سے سنی گزر کر نگاہوں سے گم ہو گیا تھا۔ سچل نے کہا۔ "تمہارا انداز بتا رہا ہے کہ اسے بہت زیادہ چاہتی ہو اور میں نے یہاں پہنچنے میں دیر کی ہے۔"

شانی وہاں سے جانے کے لیے پلٹ گئی۔ ایسے وقت اس نے سچل کو اپنے قریب دیکھا۔ چند لمحوں تک دونوں کی نظریں ایک دوسرے میں جذب ہو گئیں۔ سچل کی نظروں میں بھرپور چاہت تھی۔ شانی کی نظروں میں سوال تھا۔ جب سوال کا جواب نہ ملا تو وہ گھوم کر جانے لگی۔ وہ اس کے پیچھے چلتے ہوئے بولا۔ "تمہیں دیکھ کر میں جیسے بے زبان

ہو گیا ہوں۔ بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ اگر تم حوصلہ دو گی تو تعارف حاصل کرنا چاہوں گا۔"

وہ رک گئی۔ وہ بھی رک گیا کیونکہ اس کے چاروں طرف مسلح باڈی گارڈز کھڑے ہوئے تھے۔ سیکیورٹی افسر نے سچل سے پوچھا۔ "کیوں مسٹر! کیا چاہتے ہو؟"

سچل نے کہا۔ "جب زندگی اچانک خوبصورت ہو جائے تو ہم جیسے بالغ بچے اس کے پیچھے چل پڑتے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہاں پھول کے ساتھ بندوقیں بھی ہوتی ہیں۔"

"اب معلوم ہو گیا؟ جاؤ اپنا راستہ لو۔"

"میں تو کب کا چلا جاتا مگر راستے سے بھٹک گیا ہوں۔ پھول اور بارود کے درمیان الجھ گیا ہوں۔"

شانی اس دوران کبھی سچل اور کبھی سیکیورٹی افسر کو سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے اپنے شانے سے لٹکے ہوئے بیگ میں سے کاغذ کا پیڈ اور قلم نکال کر لکھا۔ "یہ کون ہے' اور کیا چاہتا ہے؟"

اس نے کاغذ قلم سیکیورٹی افسر کو دیا۔ اس نے پڑھ کر لکھا۔ "پتہ نہیں کون موالی ہے۔ آپ کے پیچھے آ رہا تھا' ہم ابھی اسے بھگا دیں گے۔"

وہ لکھنے کے دوران تحریر کو پڑھتی جا رہی تھی پھر اس نے سیکیورٹی افسر کو ہاتھ کے اشارے سے خاموش رہنے کے لیے کہا' پھر لکھا۔ "مسٹر اجنبی! مجھے بتایا گیا ہے کہ ابھی تم میرے پیچھے آ رہے تھے۔ اگر ضرورت مند ہو تو بتاؤ ورنہ ایسی حرکتیں تہذیب کے خلاف ہوتی ہیں۔ میرے گارڈز تمہیں اسپتال پہنچا سکتے ہیں۔"

سچل سمجھ گیا کہ وہ گونگی ہے۔ اس نے سچل کو کاغذ قلم دیا' اس نے لکھا۔ "اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم بولنے اور سننے سے معذور ہو تو پیچھے کبھی نہ آتا بلکہ شانہ بشانہ ہو کر تمہیں مخاطب کرتا۔ میں ایک تعلیم یافتہ اور مہذب ماں کا مہذب بیٹا ہوں۔ میری آنکھوں میں نہ میل ہے اور نہ دل میں کوئی گھٹیا ارادہ ہے۔"

شانی نے کاغذ قلم لے کر لکھا۔ "میں نے تمہاری شخصیت سے اندازہ لگایا ہے کہ



تم جیسا کہہ رہے ہو' ویسے ہی ہو سکتے ہو۔ مختصر الفاظ میں کہو' مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

سچل نے جواباً لکھا۔ "تمہارے گھر کا پتہ چاہتا ہوں۔ شادی کی درخواست لے کر آؤں گا۔"

وہ تحریر پڑھتے ہی شانی کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس کی زندگی میں کوئی خوبرو نوجوان آئے گا اور کسی شناسائی کے بغیر اور کسی تمہید کے بغیر اس سے شادی کی آرزو سب کے سامنے کرے گا۔

سیکیورٹی گارڈ وہ تحریر پڑھ کر غصے میں کچھ کہنا چاہتا تھا۔ شانی نے اسے ہاتھ کے اشارے سے منع کیا پھر کاغذ پر لکھا۔ "یہ اجنبی اپنے حواس میں نہیں ہے۔ اسے اس کے حال پر چھوڑ دو اور چلو۔"

اپنی یہ تحریر پڑھانے کے بعد اس نے کاغذ اور قلم کو بیگ میں رکھا پھر سچل پر ایک نظر ڈال کر جانے لگی۔ اس کے آس پاس اور آگے پیچھے سیکیورٹی گارڈز چل رہے تھے۔ سچل اپنے سامان کی ٹرالی کے پاس کھڑا اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ عمارت کے باہر ایک پجیرو آ کر رک گئی۔ اس کے پیچھے بھی مسلح گارڈز کے لیے ایک گاڑی تھی۔ ایک گارڈ نے شانی کے لیے پجیرو کا دروازہ کھولا۔ اس نے پلٹ کر دور کھڑے ہوئے سچل کو دیکھا۔

آگے جانے والوں کو کسی طرح کا خطرہ نہ ہو تو وہ پیچھے پلٹ کر نہیں دیکھتے مگر اس خیال سے ضرور دیکھتے ہیں کہ پیچھے کوئی سامان رہ نہ گیا ہو؟ شاید اس بے صدا' بے زبان کو بھی کچھ ایسا ہی محسوس ہوا تھا اس لیے پلٹ کر دیکھا تھا پھر پلٹ کر پجیرو کے اندر جا کر بیٹھ گئی تھی۔

گلاب تو پھر گلاب ہوتا ہے' وہ کانٹوں کے درمیان چلا گیا۔ سچل کو فوراً ہی ٹیکسی نہیں ملی۔ جب ملی تو وہ گلاب بہت دور جا چکا تھا۔ اب یہ معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ کس گلشن سے آیا تھا اور کس گھر کے آنگن میں خوشبو لٹانے گیا ہے۔

وہ ٹیکسی میں بیٹھ کر جب رنچھوڑ لائن کے قریب پہنچا تو ٹیکسی ڈرائیور نے پوچھا۔ "بھائی کدھر جانا ہے؟"

وہ خیالات سے چونک گیا۔ جانا ماں کے پاس تھا اور سوچ رہا تھا محبوبہ کے بارے

میں۔ یہ دیوانگی تھی۔ دو رشتوں کے درمیان توازن قائم نہیں رہ سکا تھا۔ ماں کے پاس جانے والا ہوش سے بے گانہ ہو گیا تھا۔ شانی نے آخری تحریر درست لکھی تھی کہ یہ اجنبی اپنے حواس میں نہیں ہے۔

اس نے ڈرائیور کی رہنمائی کی۔ ٹیکسی اس کے چھوٹے سے مکان کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔ اس نے ڈرائیور کی مدد سے ڈکی سے سامان نکال کر بند دروازے کے ایک طرف رکھا۔ کچھ محلے والے اسے دیکھ رہے تھے۔ ایک بوڑھے نے قریب آ کر پوچھا۔ "تو سچل ہے نا؟"

"جی ہاں چاچا! میں سچل ہی ہوں۔"

"اوئے دس برس پہلے نکا سا تھا' اب تو گبھرو جوان ہو گیا ہے۔"

سچل نے ڈرائیور کو کرایہ دے کر بند دروازے پر دستک دی۔ اندر سے ماں کی آواز آئی۔ "کون ہے؟"

"ماں جی! میں ہوں' آپ کا بیٹا سچل نواز.........."

اندر خاموشی چھا گئی۔ جیسے ماں کو یقین نہ آیا ہو کہ لختِ جگر اچانک آ گیا ہے پھر دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سی آئی۔ وہ آواز بند دروازے کے پیچھے رک گئی۔ بیٹے نے صاف طور سے بوڑھی ماں کے ہانپنے کی آوازیں سنیں۔ ماں نے ہانپتے ہوئے پوچھا۔ "کس حال میں آیا ہے؟"

"جس حال میں ماں مجھے دیکھنا چاہتی ہے۔ میرے سر پر وہ ٹوپی ہے جو اب بلوچستان' پنجاب اور سرحد میں بھی پہنی جانے لگی ہے۔ گزرتی ہوئی صدیوں کے رنگ پھیکے پڑ گئے مگر ہماری اجرک کے رنگ تہذیب کی ابتداء سے آج تک گہرے' شوخ' زندہ اور پائندہ ہیں۔ یہ میرے شانوں پر ہیں اور میں اسے تیرے لیے لایا ہوں۔"

اندر سے سوال کیا گیا۔ "کیا اپنے باپ کی کوئی حرام چیز لائے ہو؟"

"میں اپنی ماں کا بیٹا ہوں۔ حلال کھاتا ہوں' حلال پہنتا ہوں' میرا سامان اس وقت تک دروازے سے باہر رہے گا' جب تک تو اسے اندر لانے کی اجازت نہیں دے گی۔"

یہ سن کر ماں نے دروازہ کھول دیا۔ بیٹا دونوں بازو پھیلائے آگے بڑھا پھر وہ ماں



بیٹے دہلیز پر ایک دوسرے کے گلے لگ گئے۔ محلے کی عورتیں' بچے اور بوڑھے اپنے گھروں سے نکل کر انہیں دیکھ رہے تھے اور مسکرا رہے تھے۔

ماں نے کہا۔ "اپنے باپ کا سامان باہر چھوڑ کر باقی اندر لے آ۔"

"ماں جی! حلال میں حرام مل جاتا ہے تو پھر حلال نام کی کوئی چیز نہیں رہتی۔ بابا سائیں نے مجھے اندھیرے میں رکھ کر کچھ ہیرا پھیری کی ہے۔ جب تک اسے ٹھکانے نہیں لگاؤں گا تب تک تیری دہلیز کے اندر قدم نہیں رکھوں گا۔"

"میرا بیٹا میرے دل کی بات کہتا ہے۔ ابھی تجھے اندر نہیں آنا چاہیے۔ چل یہاں دہلیز پر بیٹھ جا۔"

بیٹے نے بیٹھنے سے پہلے اپنے شانوں سے اجرک اتار کر ماں کے شانوں پر رکھتے ہوئے کہا۔ "میری اجرک سامان نیں ہے۔ میں نے تیری اجرک شانوں پر اس لیے رکھی تھی کہ میں تیرے ایمان اور شرافت کو اس سامان میں رکھ نہیں سکتا تھا جو تیری دہلیز کے اندر نہیں باہر پڑا ہوا ہے۔"

وہ دونوں دہلیز پر بیٹھ گئے۔ محلے کے مرد' عورتیں' بوڑھے' بچے انہیں اپنے گھروں اور دکانوں سے دیکھ رہے تھے۔ سامنے والے مکان کی کھڑکی سے ایک عورت نے کہا۔ "مائی سہاگی! یہ کیا' بیٹا اتنے عرصے کے بعد سات سمندر پار سے آیا ہے اور تو اسے دروازے پر بٹھا رہی ہے؟"

سچل نے کہا۔ "موسی جیراں! میری ماں جی کو ایک دنیا جانتی ہے۔ اس کے گلے میں سُروں کی سچائی ہے۔ جب یہ راگ الاپتی ہے تو اس کی آواز میں صحرائے تھر کی خشکی اور پیاس بھری ہوتی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے تان سین کی تانی بارش کے لیے میگھ ملہار گا رہی ہو لیکن بارش آسمان سے نہیں ہوتی' تھر کے باشندوں کی آنکھوں سے برستی ہے۔"

ایک نوجوان نے کہا۔ "سچل بھائی! ہماری مائی سہاگی نے خدا کے فضل سے بڑی عزت کمائی ہے لیکن بیٹے کی عزت ایسے نہیں ہوتی جیسے ہم دیکھ رہے ہیں۔"

وہ بولا۔ "عزت کا ایک وقت اور مقام ہوتا ہے۔ میری ماں جی نے مجھے اس دہلیز تک عزت دی ہے۔ جب تک یہ میرے ایمان' پاکیزگی اور سچائی کو نہیں آزمائے گی تب

تک مجھے ماں کے گھر میں قدم رکھنے کا شرف حاصل نہیں ہوگا۔"

مائی سہاگی نے کہا۔ "میں نے سُر سنگیت کے ذریعے صوفیائے کرام کے اشعار کو دل میں اتر جانے والی لَے دی ہے۔ ایسا تب ہوتا ہے جب دل میں ایمان پختہ ہو۔ من میں اور ارادوں میں چھل کپٹ نہ ہو۔ میں نے بیٹے کو یہی درس دیا ہے کہ زندگی جتنی سادگی سے گزاری جائے' ضرورت جتنی کم ہوگی' ایمان اتنا ہی پختہ ہوگا۔"

پھر وہ بیٹے سے بولی۔ "ویسے یہ معیوب سی بات ہے کہ میں تجھے دہلیز پر بٹھائے رکھوں۔ جلدی سے بتادے تو نے یہ سامان باہر کیوں رکھا ہے؟"

بیٹے نے جھک کر سرگوشی میں کہا۔ "جب میں نیویارک سے چلا تو میرے ساتھ صرف ضرورت کا سامان تھا۔ کراچی پہنچا تو مڈل ایسٹ سے سمگل ہونے والے سونے کے بسکٹ میری دو اٹیچیوں میں بھر دیے گئے۔ اصل اسمگلر کو تھوڑے سے مال کے ساتھ گرفتار کرادیا گیا ہے اور یہ سب بابا سائیں نے کرایا ہے۔ انہیں یقین ہے' میں یہ تمام سونا کل صبح ان کے پاس پہنچادوں گا۔"

"کیا تم اپنے باپ کی اس حرام امانت کو پہنچانے کے لیے میرے گھر کے سامنے لے آئے ہو؟"

"ماں جی! جب تک میں نیویارک میں رہا' بابا سائیں میرے نام بڑی بڑی رقمیں بھیجتے رہے۔ میں نے تجھے ہر خط میں لکھا تھا کہ میں ان رقموں کا کیا کرتا ہوں اور خود وہاں کیسی زندگی گزارتا رہا ہوں۔ ماں جی! یہ تیرا گھر نہیں' عدالت ہے اور میں نے بابا سائیں کا یہ سامان عدالت کے دروازے پر رکھا ہے۔ فیصلہ تجھے کرنا ہے کہ اس سامان کا کیا کیا جائے؟"

"دیانت داری سے فیصلہ کرنے کی نیت ہو تو ایک پل کی دیر نہیں لگتی۔ میں ابھی جارہی ہوں۔ جلد ہی لوٹ آؤں گی۔ میری واپسی تک دروازے پر بیٹھے رہنا۔"

وہ وہاں سے اٹھ کر جانے لگی۔ ایک محلے والے نے پوچھا۔ "مائی سہاگی! کہاں جا رہی ہے۔ اتنی دور سے آنے والے بیٹے کو ایک گلاس پانی بھی پلایا؟"

دوسرے نے کہا۔ "تھرکی رہنے والی ہے' بیٹے کو پیاسا رکھے گی۔"



ایک عورت نے کہا۔ "ماں ایسی ظالم نہیں ہوتی۔ شاید ہوٹل سے بیٹے کے لیے روٹی لانے جارہی ہے۔"

وہ چپ چاپ سوچتی ہوئی محلے کی ایک گلی سے دوسری گلی میں آئی۔ اس کا دل دُکھ رہا تھا۔ جوان بیٹا برسوں کے بعد آیا تھا۔ لالچ اور بے ایمانی سے دامن بچانے والا' ماں کے نقش قدم پر چلنے والا بیٹا سونے سے بھری دو اٹیچیاں لے کر باپ کی کوٹھی میں نہیں گیا تھا۔ ایمان کے تقاضے پورے کرنے کے لیے ماں کے پاس آیا تھا اور ماں کا دل اس لیے دکھ رہا تھا کہ وہ قانون کے تقاضے پورے کرنے جارہی تھی۔

اس نے مین روڈ پر ایک ٹیکسی روکی پھر اس کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ ملک گیر شہرت رکھنے والی مائی سہاگی کہلاتی تھی۔ اصل نام نورن سہاگی تھا۔ بڑے بڑے لوگ اسے جانتے تھے لیکن بڑے لوگوں کی سوسائٹی میں کوئی رسمی دوستی' محبت یا مروت سے اپنے گھر نہیں بلاتا تھا کیونکہ وہ سات سُروں کی دولت رکھنے کے باوجود دولت مند نہیں تھی۔ اسے جتنی شہرت ملتی تھی' گانے کا اتنا معاوضہ نہیں ملتا تھا۔ بس تین وقت روٹیاں کھانے' سادے اور سوتی کپڑے اور چپلیں پہننے اور ایک چھوٹے سے مکان میں گزارہ کرنے کی حد تک رقم مل جاتی تھی۔ پاپ میوزک اور اچھل کود کر گانے والوں کی یلغار نے لوک فنکاروں کو آثار قدیمہ کی چیز بنا رکھا تھا۔ اب تو وہ کبھی ایک یا دو وقت کے فاقے بھی کرنے لگی تھی۔

کبھی وہ بہت بڑی حویلی کی مالکہ تھی۔ جوانی میں سائیں رب راکھن کا دل اس پر آ گیا تھا اور وہ اسے دلہن بنا کر حویلی میں لے آیا تھا۔ نورن سہاگی کو وڈیرے سائیں کی زمین جائیداد سے دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے دل سے اسے چاہا تھا اور عزت آبرو سے زندگی گزارنے کے لیے دلہن بن کر آئی تھی۔ رفتہ رفتہ پتہ چلا کہ دونوں کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ وہ خیر تھی' خیروعافیت کے لیے حویلی میں آئی تھی۔ وہ شر تھا اور شرارت کے بغیر وڈیرا شاہی ممکن نہیں ہوتی۔

ایک روز اس نے چند گھڑسواروں کو دیکھا۔ وہ حویلی میں آئے تھے اور سائیں رب راکھن کے مہمان تھے۔ نورن سہاگی ان میں سے ایک کو دیکھ کر چونک گئی۔ پچھلے دن کے

اخبار میں یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ ڈاکٹر غنی بخش پولیس مقابلے میں مارا گیا ہے۔ اس کی ایک دھندلی سی تصویر بھی شائع ہوئی تھی لیکن سائیں رب راکھن اپنے خاص مہمان کو غنی بخش کہہ رہا تھا اور وہ اپنے لباس اور حلیے سے ڈاکو نظر آ رہا تھا۔

وہ جو اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی خبروں کے مطابق مارا گیا تھا، وہ زندہ مہمان بن کر حویلی میں آیا تھا اور سائیں رب راکھن نے ایسی گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا تھا جیسے وہ زندہ ہو کر آنے والا مُردہ اس کا سگا رشتے دار ہو۔

اگر اس کا شوہر اتنی اپنائیت سے میزبانی نہ کرتا تو وہ فون کر کے وہاں کے تھانے دار کو بلالیتی لیکن تھوڑی دیر بعد اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب تھانے دار خود ہی وہاں چلا آیا۔ اس نے بھی بڑی گرم جوشی کے ساتھ ڈاکو غنی بخش سے مصافحہ کیا۔ پھر اپنی وردی کے اندر ہاتھ ڈال کر ایک چھوٹا سا لپٹا ہوا اخبار کا بنڈل نکال کر دیا۔ غنی بخش نے اسے کھول کر دیکھا۔ اس میں نوٹوں کی گڈیاں تھیں۔

پھر تھانے دار نے سائیں رب راکھن سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "آپ نہ ہوتے تو دوسرا ڈاکو غنی بخش کے نام سے نہ مارا جاتا۔ آپ نے اسے مارنے کے لیے بڑی اچھی سچویشن بنائی تھی۔"

اس نے وردی کے اندر ہاتھ ڈال کر ایک اور اخبار کا چھوٹا سا بنڈل نکالا۔ اسے سائیں راب راکھن کو دیتے ہوئے کہا۔ "ہم تینوں کے چالیس چالیس ہزار ہیں۔ باقی اَسّی ہزار بڑے صاحب کے پاس پہنچ گئے ہیں۔"

نورن سہاگی دوسرے کمرے سے ان کی باتیں سن رہی تھی۔ یہ معاملہ سمجھ گئی تھی کہ ڈاکو غنی بخش کی گرفتاری یا ہلاکت کے لیے دو لاکھ روپے کا جو انعام رکھا گیا تھا وہ انعام خود ہلاک ہونے والے ڈاکو اور مُردہ بنانے والے پولیس انسپکٹر کے علاوہ سائیں رب راکھن اور کوئی بڑے صاحب حاصل کر رہے تھے۔

ایک گھنٹے بعد سائیں رب راکھن اوطاق سے نکل کر اپنی خواب گاہ میں آیا تو نورن سہاگی کپڑے کی ایک گٹھڑی باندھ رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔ "یہ کیا کر رہی ہو؟"

"میں یہاں سے جا رہی ہوں۔ میرے لیے اس گھر کا پانی بھی حرام ہے۔"



"کیا بکواس کر رہی ہو؟ اس حویلی کا پانی تم پر کیوں حرام ہو گیا؟"

"میں نے یہاں حرام کی کمائی دیکھی ہے۔ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ جسے ایک نیک اور شریف زمیندار سمجھتی ہوں، وہ ڈاکوؤں سے دوستی بھی کرتا ہے۔"

"تم نے صرف ڈاکوؤں سے نہیں، پولیس سے بھی دوستی کرتے دیکھا ہو گا۔ یہ جو میری میلوں دور تک پھیلی ہوئی زمینیں ہیں، ان کی حفاظت کرنے اور انہیں قائم رکھنے اور بااثر وڈیرا کہلانے کے لیے ہم آگ اور پانی دونوں سے کھیلتے ہیں۔"

"لیکن مجھے بااثر اور صاحب اختیار نہیں صرف باایمان رہنا ہے۔ میں پچھلے سات مہینوں سے یہاں آپ کے ساتھ ہوں۔ نماز پڑھتی ہوں۔ روزے رکھتی ہوں۔ کیا آپ کے دل میں خدا کا اتنا سا خوف بھی پیدا نہیں ہوا کہ آپ ایک پاکیزہ زندگی گزارنے والی شریک حیات کو حرام کھلا رہے ہیں۔"

"میرے سامنے حرام و حلال کا فلسفہ پیش نہ کرو۔ میں تم سے حرام کھانے کو نہیں کہوں گا، تم مجھے حلال کھانے کی نصیحت نہ کرو اور نہ ہی مجھے چھوڑ کر جانے کی دھمکی دو۔ یہ گٹھڑی کھول دو۔"

"میں اس چھت کے نیچے نہیں رہوں گی۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ میں جہنم کی آگ میں جانے والی ہوں تو آپ سے کبھی شادی نہ کرتی۔"

"وہ تو ہو چکی ہے اور تم میرے بچے کی ماں بننے والی ہو۔"

"یہ بچہ آپ سے مل رہا ہے تو یہ ایک قدرتی مجبوری ہے اور میرے اندر ایک قدرتی ممتا ہے۔"

"تو پھر بچے کو پالنے کے لیے یہاں رہنا ہو گا۔"

"میں یہاں نہیں رہوں گی، جہاں رہوں گی، وہیں بچہ پرورش پائے گا۔"

"اور وہیں بچے کے باپ کو بھی ہونا چاہیے لیکن میری مجبوری ہے کہ یہاں بیٹھ کر شکار کھیلتا ہوں۔ قانون توڑنے والوں اور قانون کے محافظوں کے درمیان کڑی بن کر رہتا ہوں۔ ہمارے ملک سب ہی کو زندہ رہنے کا حق ہے۔ اگر تمام ڈاکو مرجائیں تو پولیس کا محکمہ غیر ضروری ہو جائے گا اور اگر پولیس کا محکمہ نہیں رہے گا تو ہم وڈیرے ان دونوں

کے درمیان آنکھ مچولی کیسے کھلائیں گے۔ میں تمہیں بہت تفصیل سے نہیں سمجھا سکتا کہ ہم کبھی پولیس کے تعاون سے اور کبھی ڈاکوؤں کی دہشت سے کس طرح اپنی پسند کے سیاسی امیدواروں کے لیے ووٹ بینک بڑھاتے رہتے ہیں۔"

"میں ایسی باتیں نہ سمجھنا چاہتی ہوں نہ آپ سمجھائیں۔"

"ٹھیک ہے۔ تمہیں سمجھانے کی بات یہ ہے کہ تم سے پہلے بھی میں نے ایک شادی کی تھی۔ وہ مجھ سے فراڈ کرنا چاہتی تھی' میں نے اسے طلاق دے دی لیکن تمہیں بچے کی وجہ سے نہیں دوں گا۔ تم طلاق لینا چاہو گی تو میں اپنا بچہ لے لوں گا۔ میں نہیں چاہوں گا کہ تم دوسری شادی کرو اور میرے بچے کے لیے سوتیلے بھائی بہن پیدا کرو۔"

"مجھ سے ایسی بے حیائی کی باتیں نہ کریں' میں کبھی دوسری شادی نہیں کروں گی۔"

"دوسری شادی نہ کرنے کی ضمانت یہی ہے کہ مجھ سے طلاق نہ لو۔ ہمارا جو بچہ ہوگا' وہ تمہارے پاس رہے گا لیکن میری دولت سے شاہانہ زندگی گزارے گا۔"

"ہرگز نہیں۔ میں اسے حرام کی دولت سے پرورش پانے نہیں دوں گی۔"

"ضد کرو گی تو طلاق دوں گا اور بچے کو قانونی طور پر حاصل کرلوں گا۔"

نورن سہاگی نے چپ سادھ لی لیکن علیحدہ رہ کر زندگی گزارنے لگی۔ اس نے ایک بیٹے کو جنم دیا۔ اپنے سُر سنگیت کے ذریعے حلال کی روزی حاصل کرتی رہی لیکن بیٹے کے لیے باپ بھاری رقمیں بھیجتا تھا اور ہر ماہ ایک دو بار اسے اپنے پاس بلا کر یہ دیکھتا تھا کہ بیٹا اس کی بے حساب کمائی سے پرورش پا رہا ہے یا نہیں؟

بیٹا سچل نواز اسکول جانے کے قابل ہوا تو کتابوں میں اچھائی کے وہی اسباق پڑھنے لگا جو ماں اسے لوری کے ذریعے' صوفیانہ کلام کے ذریعے اور اپنی زبان کی سچائی اور اپنے حلال رزق کے ذریعے سمجھایا کرتی تھی۔

باپ نے اسے بہت مہنگے انگلش میڈیم اسکول میں داخل کرایا تھا لیکن ماں کے ذریعے اسلامی میڈیم کا درس حاصل ہوتا رہا پھر باپ نے فیصلہ کیا کہ اسے تعلیم کے لیے امریکا بھیجا جائے گا۔ وہ انٹر پاس کرچکا تھا۔ ماں اس کی جدائی کے خیال سے پریشان ہو رہی



تھی۔ سچل نے کہا۔ "ماں جی! تجھے اندیشہ ہے کہ میں بابا سائیں اور امریکیوں کے رنگ میں رنگ جاؤں گا؟"

"بیٹے! اندیشے تو بہت سے ہیں۔ پہلے ایک باپ تیرے سر پر ننگی تلوار کی طرح لٹکا ہوا تھا۔ اب وہاں مغرب کی رنگینیاں بھی ہوں گی جہاں خود کو نمایاں رکھنے کے لیے ناجائز دولت کے حصول کو جائز سمجھا جاتا ہے۔"

"ماں جی! بچہ جوان ہوتا ہے تو اسے دنیا کی بھیڑ میں تنہا چھوڑنا پڑتا ہے۔ اس بھیڑ میں وہ کیا پاتا ہے کیا کھو دیتا ہے' یہ تو آنے والا وقت ہی بتایا کرتا ہے۔"

اس نے اپنی اٹیچی کھول کر دکھائی۔ وہاں کپڑوں کے نیچے کئی آڈیو اور ویڈیو کیسٹ تھے۔ "ماں جی! یہ سب تیرے ہیں۔ ان میں تیری سات سُروں کی سچائیاں بھی ہیں اور تیری متحرک تصویریں بھی ہیں۔ یہاں میں تیری انگلی پکڑ کر چلتا تھا وہاں ان کیسٹوں کے سائے میں تیری ممتا مجھے ملتی رہے گی۔"

بیٹا ماں سے جدا ہو گیا۔ سائیں رب راکھن کو اسی دن کا انتظار تھا۔ اس کا اپنا تجربہ تھا کہ اولاد جوانی میں گمراہ ہوتی ہے اور زیادہ سے زیادہ دولت حاصل کرنے کے لیے وہی راستے اختیار کرتی ہے جو سائیں رب راکھن اپنے بیٹے سے چاہتا تھا۔

اس نے بیٹے کے لیے نیویارک میں رہائش کا انتظام کیا۔ اسے بتایا کہ لندن میں اس کا بینک اکاؤنٹ ہے اور وہ چاہتا ہے کہ نیویارک میں بیٹے کا بینک اکاؤنٹ رہے۔ اس نے سچل نواز کے نام سے اکاؤنٹ کھولا اور سمجھایا کہ پاکستان سے کمایا ہوا جتنا کالا دھن چور راستوں سے آئے گا' وہ سچل کے اکاؤنٹ میں جمع ہوگا۔ وہ بے شک جتنی رقم چاہے خرچ کرے لیکن ایسے چور دروازے بھی تلاش کرے جہاں سے دولت اتنی آتی ہے جتنی خرچ نہیں ہو پاتی۔ بینک اکاؤنٹ میں رقم بڑھتی ہی جاتی ہے۔

وہ نیویارک چلا گیا۔ ہر ہفتے ایک خط ماں کو اور ایک باپ کو لکھتا رہا۔ اس نے دوسرے خط میں لکھا۔ "ماں جی! میں نے یہاں پہنچتے ہی تعلیم تو جاری رکھی ہے لیکن بابا سائیں کی دولت سے نجات پانے کے طریقے بھی سوچتا رہا۔ میں نے کئی جگہ ملازمت حاصل کرنے کی کوششیں کیں۔ آخر مجھے ایک بہت بڑے ہوٹل میں پلیٹیں صاف کرنے

کی نوکری مل گئی ہے۔ یہ بابا سائیں کے لیے بڑی ذلت کی بات ہو گی لیکن آپ کے لیے یہ رزق حلال باعثِ فخر ہے۔ میں تعلیم ضرور حاصل کروں گا لیکن اپنی محنت کی کمائی سے۔ بابا سائیں کو اس خوش فہمی میں مبتلا رکھوں گا کہ میں ان کی ارسال کردہ رقموں سے عیش بھی کر رہا ہوں اور فارن کرنسی میں بھیجے ہوئے ان کے کالے دھن کو بڑھاتے رہنے کی راہوں پر بھی چل رہا ہوں۔"

اس نے ایک برس بعد لکھا کہ ہوٹل سروسنگ کے امتحان میں اول آیا ہے۔ اسے اس ہوٹل میں کچن کا انچارج بنا دیا گیا ہے۔ اگلے دو سال میں نے اس ہوٹل کے اسسٹنٹ منیجر کا عہدہ حاصل کر لیا تھا۔ وہ چوتھے برس دو ہفتے کی چھٹی لے کر پاکستان آیا۔ پہلے اپنی ماں جی سے ملاقات کی۔ ملاقات کے دوران وہ اپنے علاقائی لباس میں رہا اور ماں کو اپنی تین سالہ جدوجہد کی تفصیلات بتاتا رہا۔ دوسرے دن اس نے کوٹھی میں آ کر بابا سائیں سے ملاقات کی۔ باپ نے کہا۔ "بیٹے! میں نے تمہاری آمد پر آج رات شاندار پارٹی کا اہتمام کرایا ہے۔ حکومتی پارٹی کے کچھ بڑے لوگ بھی آئیں گے۔ ان سے باتیں کرتے وقت ایسی انگریزی جھاڑنا کہ تمہارے بابا سائیں کی عزت رہ جائے۔ تمہاری انگریزی سن کر لوگ بھول جائیں کہ تم آٹھ جماعتیں پڑھنے والے وڈیرے سائیں کے بیٹے ہو۔"

سچل نے مسکرا کر کہا۔ "آپ نہ بھی کہتے تو میں اسی زبان میں باتیں کرتا۔ ہمارے ملک کی اونچی سوسائٹی کی تقریبات میں اردو یا سندھی کون بولتا ہے۔ سب ہی انگریزی یوں بولتے رہتے ہیں جیسے یہ ان کی مادری زبان ہو۔"

"اچھا یہ بتاؤ' کہاں تک تعلیم حاصل کی۔ پارٹی میں آنے والے یہ ضرور پوچھیں گے۔"

وہ ذرا ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "بات یہ ہے بابا سائیں کہ تعلیم حاصل کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ وہاں تعلیم بڑی مہنگی ہے۔ فیس دینے کے لیے جیب میں رقم نہیں رہتی تھی۔ میں اپنے ضروری اخراجات پورے کرنے کے لیے ایک ہوٹل میں ملازمت کرتا ہوں۔"



سائیں رب راکھن نے ہنستے ہوئے کہا۔ "شریر کہیں کے' اپنے باپ سے مذاق کر رہے ہو۔ چلو بتاؤ کہ اب تک کتنا پڑھ لیا ہے؟"

"ہوٹل منیجمنٹ کا کورس کیا ہے۔ امتحانات پاس کرتے کرتے فائیو اسٹار ہوٹل کا اسسٹنٹ منیجر بن گیا ہوں۔"

"دیکھو بیٹے! مذاق بند کرو اور سچ بولو۔"

"ماں جی نے ہمیشہ سچ بولنے کی تاکید کی ہے۔ رزق حلال کھانے کی قسم دی ہے اس لیے وہاں ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں ملازمت کرتا ہوں۔ آپ ان تین برسوں میں کروڑوں میرے اکاؤنٹ میں بھیج چکے ہیں۔ میں نے ڈالر میں تبدیل ہونے والے ایک روپے کو بھی اپنے لیے استعمال نہیں کیا ہے۔"

بابا سائیں نے ڈانٹ کر پوچھا۔ "کیوں استعمال نہیں کیا؟ کیا میں یہ سمجھوں کہ اپنی ماں کی طرح تمہیں بھی حرام اور حلال کو سمجھنے کی بیماری ہو گئی ہے؟"

"اگر اولاد کو بیماری ملتی ہے تو وہ ماں کے دودھ سے نہیں' باپ کے خون سے ملتی ہے۔ آپ نے مجھے دولت میں اضافہ کرنے والی بیماری دی۔ آپ چاہتے تھے' میں ایسی راہ پر چلوں کہ دولت جتنی خرچ ہو' اس سے زیادہ بڑھتی چلی جائے اور میں نے آپ کی دولت کو بڑھانے کے طریقے پر ہی عمل کیا ہے۔"

باپ نے خوش ہو کر پوچھا۔ "واقعی؟ کیا سچ کہہ رہے ہو؟ ہاں ہاں جس ماں کے بیٹے ہو' وہ سچی اور بے وقوف ہے۔ تم سچے رہو مگر کبھی بے وقوفی نہ کرو۔"

"مگر بابا سائیں! ایک کے نقطہ نظر سے جو بے وقوفی ہوتی ہے وہ دوسرے کے خیال میں دانش مندی ہوتی ہے۔ اب یہی دیکھیے کہ آپ کی دولت وہاں کے بینک میں رہتی تو اس ملک کی معیشت کو فائدہ پہنچتا اس لیے میں نے حکومت پاکستان سے رابطہ رکھا تھا۔ آپ پچھلے تین برسوں میں چور دروازوں سے حاصل کی ہوئی دولت پاکستان سے امریکہ بھیجتے رہے۔ میں اسے اپنے وطن کے قومی خزانے میں واپس بھیجتا رہا۔"

سائیں رب راکھن نے غصے سے دھاڑتے ہوئے کہا۔ "کیا بکواس کر رہے ہو؟"

"یہ بکواس نہیں ہے۔ میں نے آپ کی نصیحت کے مطابق دولت بڑھائی ہے لیکن

غیر ملک میں نہیں' اپنے ملک میں۔ بااختیار لوگ کتنے ہی ہتھکنڈوں سے ہمارے قومی خزانے کو خالی کرتے رہتے ہیں۔ پتہ نہیں آپ نے کس قدر خالی کیا ہے۔ میرے پاس آپ کے صرف بیس کروڑ آئے' میں نے یہ رقم اس کی صحیح جگہ پہنچا دی ہے۔ یہ آپ کے نقطہ نظر سے بے وقوفی ہے۔ آپ اس بے وقوفی کی سزا مجھے دے سکتے ہیں۔"

سچل نے جیب سے چند تہہ کیے ہوئے کاغذات نکالے پھر انہیں کھول کر اپنے باپ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "نیویارک کے بینک سے جو بیس کروڑ روپے نیشنل بینک آف پاکستان ٹرانسفر کیے جا چکے ہیں' یہ اس سلسلے کے کاغذات کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں ہیں۔"

سائیں رب راکھن نے وہ کاغذات لیے پھر اپنے سیکریٹری کو بلایا۔ اس کے آنے پر وہ کاغذات اسے پڑھنے کے لیے دیے۔ سیکریٹری نے پڑھ کر سچل کے بیان کی تصدیق کی۔ سائیں نے وہ کاغذات لے کر سیکریٹری کو وہاں سے جانے کا حکم دیا پھر اس کے جانے کے بعد بیٹے کو وہ کاغذات دکھاتے ہوئے کہا۔ "تم نے باپ کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا۔ میں سمجھتا تھا کہ تم جوانی میں دولت کے انبار پر بیٹھ کر ایک دو کوڑی کی ماں کی بھوکی پیاسی نصیحتوں کی بھول جاؤ گے۔"

سچل نے سر جھکا کر دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "بابا سائیں! آپ سے التجا کرتا ہوں' میری ماں جی کی شان میں ایسے الفاظ استعمال نہ کریں۔"

"کیوں نہ کروں؟ اگر میں اسے گالیاں دوں گا تو کیا میری زبان کھینچ لو گے؟"

اس نے باپ کو دیکھا۔ باپ نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ چند لمحوں تک دونوں کی نظریں ٹکراتی رہیں پھر سچل نے غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔ "خدا کی قسم بابا سائیں! اگر کوئی آپ کے خلاف ایک لفظ بھی زبان سے نکالے گا تو میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا اور آپ تو جانتے ہی ہیں کہ میں صرف آپ کا ہی نہیں اپنی ماں کا بھی بیٹا ہوں۔"

اس نے باپ کی عزت اور احترام کو برقرار رکھتے ہوئے ماں کی حمایت میں بھرپور جواب دیا تھا۔ سائیں رب راکھن اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھتا رہ گیا پھر بولا۔ "میں



ایسے بیس کروڑ اور کما لوں گا مگر تم نے اعتماد کھو دیا۔ اب مجھ سے ایک روپیہ بھی تمہیں نہیں ملے گا کیونکہ تم بھی اپنی ماں کی طرح میری دولت کو حرام کی کمائی سمجھتے ہو۔"

"جب میں پیدا ہونے والا تھا' تب ہی ماں نے اسے جہنمی کمائی کہہ کر گھر چھوڑ دیا تھا۔ آپ نے بھی ماں جی سے علیحدگی اختیار کر لی۔ کیا آپ مجھے بھی چھوڑ سکتے ہیں؟ ایک بیوی کے بعد دوسری مل جاتی ہے لیکن بیٹا ایک ہی ہو تو دوسرا نہیں ملتا۔"

"درست کہتے ہو۔ اپنی ماں کے نقش قدم پر چلنے کے باوجود تم ہمارے دل کی دھڑکن ہو۔ تم سے ہماری نسل آگے بڑھے گی۔ ہمارے بعد بھی ہمارا نام لینے والے اپنے سگے اس دنیا میں رہیں گے۔ تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ ہم تمہیں دل کی کتنی گہرائیوں سے چاہتے ہیں۔"

"بابا سائیں! آپ میری اور آئندہ نسل کی باتیں کر رہے ہیں۔ اس دولت کی بھی بات کریں جو آپ کے بعد میرے پاس آئے گی اور میرے پاس آئے گی تو سیدھی قومی خزانے میں جائے گی۔"

"نہیں جائے گی۔ میں صرف ایک ٹھوکر سے سنبھل جاتا ہوں۔ ٹھوکر جان بوجھ کر کھائی نہیں جاتی۔ بس انجانے میں لگ جاتی ہے۔ تم نے جو کیا اسے میں نظرانداز کر رہا ہوں۔"

"یہ واقعی آپ کی محبت ہے۔ میں نے آپ کے نقطۂ نظر سے اتنا بڑا نقصان پہنچایا اور آپ نے فراخ دلی سے مجھے معاف کر دیا۔"

"اس لیے معاف کر دیا کہ بیٹا اگر نقصان پہنچاتا ہے تو کبھی فائدہ بھی پہنچا دیتا ہے۔ آئندہ تم فائدہ پہنچاؤ گے۔ بیس کروڑ سے بھی زیادہ کما کر مجھے دو گے۔"

"میں ایمانداری سے کبھی اتنی بڑی رقم کمانے کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتا۔"

"خواب دیکھنے والے لوگ خالی ہاتھ بستر سے اٹھتے ہیں۔ تم میرے بیٹے ہو۔ خالی ہاتھ نہیں رہو گے۔ میرا نقصان ضرور پورا کرو گے۔"

سچل نے اس سلسلے میں باپ سے بحث نہیں کی۔ اسے یقین تھا' ماں نے اسے جو جوتے پہنائے ہیں' انہیں وہ پہنے رہے گا تو پاؤں میں کانٹے نہیں چبھیں گے۔

وہ دو ہفتے گزار کر پھر نیویارک چلا گیا۔ وہاں اچھی خاصی آمدنی تھی۔ اس نے جتنی بچت کی تھی‘ اس سے توقع تھی کہ آئندہ پاکستان جا کر اس رقم سے مناسب کاروبار کر لے گا۔

دوسری بار وہ پھر تین برس کے بعد واپس آیا تو ایئرپورٹ پر وہی واقعہ پیش آیا۔ اس کی دو اٹیچیوں میں سونے کے بسکٹ بھر دیے گئے تھے۔ وہ سمجھ گیا کہ اس کے بابا سائیں اپنے بیٹے سے توقع کرتے ہیں کہ وہ کسٹم افسر وغیرہ کے سامنے اپنے باپ کے حکم کی تعمیل کرے گا اور اسمگل ہونے والا سونا باپ تک ضرور پہنچائے گا۔ لیکن بیٹے نے اسے ماں کے پاس پہنچا دیا تھا۔

ٹیکسی ڈی آئی جی کے دفتر کے سامنے رک گئی۔ نورن سہاگی نے ٹیکسی ڈرائیور کو کرایہ دیا پھر اس عمارت کے اندر پہنچ کر ایک ماتحت افسر سے کہا۔ "اپنے صاحب کو بولو‘ مائی سہاگی ملنے آئی ہے۔"

لوگ اسے ایک فنکارہ‘ گلوکارہ کی حیثیت سے جانتے تھے‘ اس کی دل سے عزت کرتے تھے۔ ماتحت افسر نے اپنی جگہ سے اٹھ کر اسے ایک کرسی پیش کی پھر کہا۔ "آپ آرام سے بیٹھیں۔ صاحب بہت ضروری کام سے باہر گئے ہیں۔ ابھی آ جائیں گے۔ سنا ہے جو لوگ گاتے ہیں‘ وہ ٹھنڈے مشروبات سے پرہیز کرتے ہیں میں آپ کے لیے چائے منگواتا ہوں۔"

اس نے کہا۔ "نہیں بیٹے! تکلف نہ کرو۔ میں بے وقت چائے نہیں پیتی ہوں۔"

وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ ایسے وقت یاد آیا کہ وہ اپنے پیارے بیٹے کو دہلیز پر بٹھا کر آئی ہے۔ اسے یاد کرتے ہی وہ کرسی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ماتحت افسر نے اسے دیکھ کر پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

"آں؟ کچھ نہیں‘ بس یونہی بیٹھنے کو جی نہیں چاہتا ہے۔"

"معلوم ہوتا ہے‘ کسی نے آپ کو پریشان کیا ہے۔ آپ مجھے بتائیں معاملہ کیا ہے۔ اگر کسی نے آپ سے گستاخی کی ہے تو میں........."

وہ بات کاٹ کر بولی۔ "نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ دراصل میرا بیٹا تین



برس کے بعد آیا ہے۔ میں اسے باہر........."

وہ بولتے بولتے رک گئی۔ باہر سے ڈی آئی جی آ رہا تھا۔ عمارت کے اس حصے میں داخل ہو رہا تھا جہاں وہ کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے بیٹے کو دیکھا۔ اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ وہ سپاہیوں کے درمیان چل رہا تھا۔ ماں کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ ڈی آئی جی نے اپنی ٹوپی اتارتے ہوئے نورن سہاگی کو سلام کیا پھر کہا۔ "مائی سہاگی! آپ یہاں ہیں‘ میں نے آپ کی تلاش میں اپنے آدمی بھیجے ہیں۔ آپ دیکھ رہی ہیں‘ میں نے قانون سے مجبور ہو کر آپ کے بیٹے کو گرفتار کیا ہے۔ یہ فرض ادا کرتے ہوئے آپ کے سامنے شرمندگی ہو رہی ہے۔"

ماں بیٹے حیران پریشان ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ پھر ماں نے ڈی آئی جی سے پوچھا۔ "میرے بیٹے کا جرم کیا ہے؟ میں تو لاکھوں روپے کا سونا آپ کے حوالے کرنے آئی ہوں۔ آپ کو بتانے آئی ہوں کہ یہ کہاں سے آیا ہے اور کہاں پہنچنے والا تھا اور اتنی بڑی اسمگلنگ کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے؟"

ڈی آئی جی نے کہا۔ "مائی سہاگی! آپ ہمارے لیے قابل احترام ہیں۔ پلیز میرے دفتر میں چل کر بیٹھیں۔ پریشانی کی بات نہیں ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

پھر اس نے سپاہیوں سے کہا۔ "مجرم کو حوالات میں لے جاؤ۔"

ماں نے فوراً ہی آگے بڑھ کر بیٹے کا بازو پکڑ لیا پھر ڈی آئی جی سے کہا۔ "آپ کہتے ہیں پریشانی کی بات نہیں ہے پھر میرے بیٹے کو ہتھکڑی کیوں لگائی ہے۔ اسے حوالات میں کیوں بند کر رہے ہیں؟"

"یہ قانونی کارروائی ہے۔ آپ کا بیٹا اسمگل کیے جانے والے سونے کے ساتھ گرفتار کیا گیا ہے۔"

"یہ جھوٹ ہے۔ میرا بیٹا اسمگلر نہیں ہے۔ یہ حرام کا مال اس کے باپ نے اس کی لاعلمی میں اس کے سامان کے اندر رکھوایا تھا۔"

"دیکھیے‘ آپ بہت بڑے وڈیرے سائیں پر الزام لگا رہی ہیں۔ پھر یہ کہ سائیں رب راکھن مجرم کے باپ ہیں۔ آپ بات نہ بڑھائیں۔ سائیں بڑے اثر و رسوخ والے

ہیں۔ وہ جلد ہی بیٹے کو حوالات سے نکال کر لے جائیں گے۔"

"وہ بے جا اثر ورسوخ سے رہائی دلائیں گے اور میں اپنی ممتا اور مٹی کی محبت میں قانون کے تقاضے پورے کرنے آئی ہوں۔ تو کیا ہم ماں بیٹے کی سچائی اور فرض شناسی کو تسلیم نہیں کیا جائے گا؟"

"قانون کے تقاضے ثبوت اور گواہیوں کے ذریعے پورے کیے جاتے ہیں۔ ہمیں کسی نے فون پر اطلاع دی تھی۔ ہم نے اس کے مطابق آپ کے گھر پر چھاپا مارا تو آپ کا بیٹا سونے کے بسکٹ سے بھری ہوئی دو اٹیچیوں کے ساتھ گھر کے دروازے پر بیٹھا ہوا تھا۔ محلے کے بے شمار لوگ چشم دید گواہ ہیں۔ انہوں نے سونے سے بھری ہوئی دو اٹیچیاں بھی دیکھی ہیں۔ مائی سائیں! آپ نے دنیا دیکھی ہے اور یہ بھی دیکھا ہے کہ چوری کے مال کے ساتھ پکڑا جانے والا چور ہوتا ہے۔"

"ہم نے زندگی میں کبھی حرام نہیں کھایا۔ تو کیا حلال کھانے والی زبان میں اتنی تاثیر نہیں ہے کہ وہ آپ کو متاثر کر سکے۔"

"میرے متاثر ہونے سے کچھ نہیں ہوگا۔ آپ میرے مشورے پر عمل کریں۔ قانونی باتیں نہ کریں۔ قانونی پیچیدگیوں میں پڑیں گی تو دنیا کا کوئی وکیل آپ کے بیٹے کو بے قصور ثابت نہیں کر سکے گا۔ صرف لامحدود اختیارات اور سفارش کے ذریعے بڑے بڑے قاتلوں اور اسمگلروں کو رہائی مل جاتی ہے۔ میں ابھی وڈے سائیں کو فون پر اطلاع دوں گا پھر ان کے آتے ہی آپ کے بیٹے کو رہائی مل جائے گی۔"

ڈی آئی جی اپنے دفتر کی طرف جانے لگا۔ وہ تھوڑی دیر تک گم صم کھڑی رہی پھر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے حوالات کی طرف آئی۔ سچل آہنی سلاخوں کے پیچھے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "ماں جی! دیکھ رہی ہو۔ سچائی اور فرض شناسی کتنی مہنگی پڑتی ہے۔"

"ہاں' اتنی مہنگی کہ بیٹے نے ماں کو اجرک پہنائی اور ماں نے بیٹے کو ہتھکڑی پہنا دی۔"

"سچائی کو کب زنجیریں نہیں پہنائی جاتیں مگر یہ زنجیریں آہستہ آہستہ پگھل جاتی ہیں۔"



وہ بڑے دکھ سے مسکراتے ہوئے بولی۔ "میں نے تجھے گھر کے اندر نہیں بلایا' حوالات کے اندر پہنچا دیا۔ کیا تُو ماں کی یہ بے بسی دیکھے گا کہ میں تیری رہائی کے لیے کچھ نہیں کر سکوں گی اور تیرا باپ یہاں آتے ہی تجھے چھڑا کر لے جائے گا۔"

"ہرگز نہیں۔ بابا سائیں کو یہاں آ کر یہ بیان دینا ہوگا کہ انہوں نے کسٹم والوں کی ملی بھگت سے وہ سونا میرے سامان میں رکھوایا تھا۔ جرم ان کا تھا اور توہین میری ماں کی ہو رہی ہے۔ مجرم ہونے کا داغ پر مجھ پر نہیں لگا ہے بلکہ آپ کے دروازے سے گرفتاری عمل میں لا کر آپ کے ایمان' سچائی اور فرض شناسی کو چیلنج کیا گیا ہے۔ میں بابا سائیں کی سفارش سے رہائی قبول نہیں کروں گا۔ پہلے یہاں پریس والے آئیں گے۔ اخبارات کے رپورٹرز کے سامنے یہ تسلیم کیا جائے گا کہ ہم ماں بیٹے کو ناکردہ جرم میں ملوث کیا گیا ہے' تب میں آپ کا ہاتھ تھام کر اس حوالات سے باہر جاؤں گا۔"

"واقعی تُو ایک سعادت مند بیٹے کا حق ادا کر رہا ہے۔ میں تجھ سے یہی کہنا چاہتی تھی کہ سازش کرنے والوں کی سفارش قبول کرے گا تو جرائم کی دلدل میں دھنستا چلا جائے گا۔ ہمیں انصاف ملے یا نہ ملے تُو حوالات یا تھانے سے اُس وقت تک باہر نہیں آئے گا جب تک مجرم اندر نہیں پہنچائے جائیں گے۔"

"ماں جی! تُو مطمئن ہو کر جا۔ میں تیرا سر بابا سائیں کے سامنے جھکنے نہیں دوں گا۔"

اس نے آہنی سلاخوں کے پیچھے سر جھکایا۔ ماں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ وہ ہاتھ فولادی سلاخوں کے آرپار گیا تھا اور فولاد کے آرپار صرف شعلے جاتے ہیں۔

★===========★===========★

ایک نہایت قیمتی کار ایک شاندار کوٹھی کے احاطے میں داخل ہوئی پھر وہاں سے گزرتی ہوئی پورچ میں آ کر رک گئی۔ رئیس ہمدانی نے کار سے باہر آ کر ڈرائیور سے کہا۔ "گاڑی یہیں رکھو' ہم ایئرپورٹ جائیں گے۔"

یہ کہہ کر وہ کوٹھی کے اندر جانے لگا۔ ملازم نے اس کے پیچھے چلتے ہوئے پوچھا۔ "جناب عالی! آپ آج آئے ہیں اور آج ہی جا رہے ہیں۔ آپ ہمیں خدمت کا موقع

نہیں دے رہے ہیں۔"

ہمدانی نے ڈرائنگ روم میں پہنچ کر مسکراتے ہوئے بوڑھے ملازم کو دیکھا۔

"بابے! تم نے ہمارے خاندان کی خدمت کرتے ہوئے ساری عمر گزار دی۔ یہ کوٹھی خالی پڑی رہتی ہے۔ آخری عمر میں یہاں عیش و آرام سے رہا کرو۔ ہم سیاست دانوں کی جنت تو اسلام آباد ہے۔ یہاں سر سے قرضے کا پہاڑ اتارنے آیا تھا' وہ اتر چکا ہے اب ہلکا پھلکا ہو کر جا رہا ہوں۔ میرا سامان گاڑی میں رکھوا دو۔"

ملازم جانے لگا پھر سینٹر ٹیبل کی طرف دیکھ کر رک گیا۔ وہاں ایک بڑا سا پیکٹ رکھا ہوا تھا۔ اس نے پیکٹ اٹھا کر کہا۔ "سرکار! ایک صاحب آپ سے ملاقات کرنے آئے تھے۔ آپ کے لیے یہ پیکٹ دے گئے ہیں۔"

"کیا ہے اس پیکٹ میں؟"

"میں نے آپ کی اجازت بغیر اسے کھول کر اس لیے دیکھا ہے کہ آج کل اس شہر کے حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ اس میں ایک فائل اور ایک لفافہ ہے۔"

ہمدانی نے اس سے پیکٹ لے کر اسے کھولا۔ اس میں رکھی ہوئی فائل ایسی تھی جسے دیکھتے ہی وہ چونک گیا۔ حیرانی اور بے یقینی سے اسے دیکھنے لگا۔ اس وقت اس کے ہاتھوں میں قرضے کے لین دین کی وہی فائل تھی' جسے وہ ہاکس بے میں پیر عظمت اللہ شاہ کے سامنے جلا کر راکھ کر چکا تھا۔

وہ جلدی سے فائل کو کھول کر اس کے ایک ایک ورق کو غور سے پڑھنے لگا۔ اس نے قرضہ حاصل کرنے کے لیے جو درخواست لکھی تھی' وہ فائل میں موجود تھی۔ قرضہ منظور کرنے والے اعلیٰ عہدے داران اور رقم بطور قرضہ دینے والوں کے کاغذات بھی تھے اور ادائیگی کی رسیدوں پر رئیس ہمدانی کے وصولی کے دستخط بھی موجود تھے۔

وہ حیرانی سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا اور سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اصل فائل کون سی ہے؟ جو جلا دی گئی یا جو ابھی ہاتھوں ہے؟

اس نے ملازم سے پوچھا۔ "بابے! یہاں کون آیا تھا؟ یہ کس نے دیا ہے' تم نے نام پوچھا تھا؟"



"جی سرکار! اس نے اپنا نام صداقت علی بتایا تھا۔"

رئیس ہمدانی کے ہاتھوں سے وہ فائل چھوٹ کر گر پڑی۔ وہ نام اتنا بھاری تھا کہ اس کے ہاتھ فائل کا وزن نہ سنبھال سکے۔ اس فائل کے ساتھ ایک لفافہ قالین پر پڑا ہوا تھا۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھ سے اس لفافے کو اٹھایا۔ اسے کھول کر اندر سے ایک کاغذ نکلا۔ وہ ایک کاغذ کا پُرزہ تھا۔ اس پر موبائل فون کے نمبر درج تھے۔ ملازم نے پوچھا۔

"سرکار! خیریت تو ہے؟ آپ پریشان ہو گئے ہیں۔"

"آں؟" اس نے چونک کر بابے کو دیکھا پھر کہا۔ "وہ.......... وہ فون لاؤ اور تم یہاں سے جاؤ۔"

اس نے فون اٹھا کر اس کے سامنے رکھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا سامان گاڑی میں رکھوں؟"

ہمدانی نے سوچتی ہوئی نظروں سے بابے کو دیکھا۔ ابھی تو قرضے کا پہاڑ نہیں اترا تھا۔ ابھی وہ اسلام آباد کیسے جا سکتا تھا؟

اس نے کہا۔ "نہیں۔ ابھی نہیں۔ تم جاؤ۔"

وہ جانے لگا۔ ہمدانی نے کہا۔ "سنو! وہ جو صداقت علی آیا تھا' وہ دیکھنے سننے میں کیسا تھا؟"

"سرکار! بالکل دبلا پتلا مچھر کی طرح تھا۔ اس کے بدن پر شلوار قمیص ایسی لگ رہی تھیں جیسے بانس پر لٹکائی گئی ہوں۔"

وہ زیر لب بڑبڑایا۔ "پھر تو وہ صداقت علی نہیں تھا۔ اتنا بڑا ڈائریکٹر جنرل خود یہاں نہیں آئے گا۔ اس نے کسی کارندے کو بھیجا ہوگا۔ اچھا تم جاؤ۔"

ملازم چلا گیا۔ وہ لفافے کی پرچی پر لکھے ہوئے موبائل فون کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔ فوراً ہی رابطہ قائم ہو گیا' آواز آئی۔ "ہیلو' میں صداقت علی بول رہا ہوں۔"

ہمدانی نے کہا۔ "جناب عالی! السلام علیکم۔ میں آپ کا خادم ہمدانی بول رہا ہوں۔ آپ کے نیاز حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ خدارا مجھے تھوڑا سا وقت دیں۔"

"اچھا تو تم نے وہ فائل پڑھ لی ہے۔ پڑھ کر افسوس ہوا ہوگا کہ جو چیز مفت میں گھر

تک پہنچ گئی اس کے لیے خواہ مخواہ ہاکس بے تک جانا پڑا۔"

"جناب! ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ فائل تو وہ بھی اصلی تھی جو آپ کے سسر صاحب نے مجھے دی تھی اور یہ بھی اصلی ہے۔"

"تم نے ہاکس بے والی فائل کا کیا کیا؟"

"اسے جلا ڈالا ہے۔"

"پھر جو تمہارے سامنے ہے' اسے بھی جلا ڈالو۔ اسلام آباد اپنی کوٹھی میں پہنچو گے وہاں بھی ایسی ہی تیسری فائل ملے گی' وہ بھی اصلی ہو گی۔ سوال پیدا ہوتا ہے' تم لوگ کتنی فائلیں جلاؤ گے؟ ہر فائل پر یہی گمان ہو گا کہ وہ اصلی ہے۔ تم نے قرضے کے طور پر کروڑوں روپے لے کر جتنی رسیدوں پر دستخط کیے ہیں انہیں محدب عدسے سے دیکھو۔ وہ سب تمہارے اپنے ہی دستخط معلوم ہوں گے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ یہ میرے دستخط نہیں ہیں؟"

"یہ تو ماہرین تحریر و دستخط ہی بتا سکتے ہیں۔ کیا یہ نہیں جانتے کہ انٹیلی جنس کے شعبوں میں تحریرودستخط کے بال برابر فرق کو سمجھنے والے ماہرین ہوتے ہیں اور بھانت بھانت کی تحریروں کے باکمال نقال بھی ہوا کرتے ہیں۔ میں نے تمام قرض نادہندگان کی فائلوں کے ایک ایک کاغذ کی ہوبہو نقل کرائی ہے۔ میرے ماتحت ایسے مشاق ماہرین ہیں کہ انہوں نے ہر قرض نادہندہ کی فائل کی تین تین نقلیں تیار کی ہیں۔ ابھی تمہارے ہاتھوں میں فائل کی دوسری نقل ہے۔"

رئیس ہمدانی پھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اپنے دستخطوں کو دیکھنے لگا۔ ہر شخص اپنے دستخط کی وہ باریک خامیاں نہیں پہچان سکتا جسے ایک ماہر پہچان لیتا ہے۔

صداقت نے کہا۔ "لوٹ کھسوٹ کرتے وقت تم لوگ بھول گئے کہ یہ کمپیوٹر کا دور ہے۔ موٹی موٹی فائلوں کی ڈسک تیار ہو جاتی ہے۔ مائیکرو فلم کے ذریعے اصل دستاویزات کی خامیوں سے پاک تصاویر اتر جاتی ہیں۔"

"سر! مجھ سے غلطی ہوئی۔ مجھے آپ کے سسر صاحب پر بھروسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔"



"جب مجھ سے دفتری معاملات پر گفتگو کرو تو ان سے میرا کوئی رشتہ نہ جوڑو۔ وہ لی پیر شاہ صاحب یا گاڈ فادر ہیں۔ اب سچ سچ بتا دو کہ اس گاڈ فادر کو کتنی رقم ادا کی ہے؟"

"آپ سے کوئی بات چھپی نہیں رہتی اس لیے نہیں چھپاؤں گا' میں نے پورے دو ڑ روپے ادا کیے ہیں۔"

"یہ کیسی ذلالت ہے کہ تم قرضے کی پہلی قسط کے طور پر وہ دو کروڑ روپے قومی انے میں بھی جمع کراؤ سکتے تھے لیکن تم نے وہ رقم اپنے ملک کو نہیں' ایک گاڈ فادر کو ے دی۔"

"مجھ سے بڑی بھول ہوئی ہے۔ میں پیر شاہ صاحب سے اپنی وہ رقم ضرور وصول ں گا۔"

"وہ ننگے بھوکے نہیں ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ناکامی کی صورت میں وہ تمہاری رقم پس کر دیں گے۔ اب تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ ان سے دو کروڑ روپے وصول کر ایک ہفتے کے اندر پہلی قسط کے طور پر وہ رقم قومی خزانے میں جمع کراؤ۔ دوسری قسط لیے تمہیں چھ ماہ کی مہلت مل جائے گی۔"

"سر! یہ دو کروڑ ضرور جمع کرا دوں گا مگر چھ ماہ کا عرصہ کم ہوتا ہے۔ میں بڑی بڑی یں ادا نہیں کر سکوں گا۔"

"اسلام آباد' لاہور' کراچی اور گلگت میں تمہاری زمینوں اور دوسری جائیداد کے بیرونی ممالک میں تمہارے بینکوں کے اکاؤنٹس کی تفصیلی رپورٹ میرے پاس تیار ۔ میں جانتا ہوں' ہر چھ ماہ بعد تم سے قسطیں کس طرح وصول کی جائیں گی۔ فی الحال ک ہفتے کے اندر دو کروڑ کی پہلی قسط ادا کر دو۔ دیٹس آل۔"

اس نے رابطہ ختم کر دیا۔ رئیس ہمدانی ہاتھ میں ریسیور لیے بیٹھا رہ گیا۔ پھر اس ریسیور رکھ کر سوچا کہ پہلے پیر عظمت اللہ شاہ سلطانی سے اپنی رقم وصول کرنا چاہیے۔ ان سے رابطہ کرنا چاہتا تھا کہ اسی وقت فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے ریسیور اٹھا کر سے لگا کر کہا۔ "ہیلو! ہمدانی سپیکنگ۔"

اسے دوسرے قرض نادہندہ کی آواز سنائی دی۔ "ہمدانی صاحب! میں طور خان بـ
رہا ہوں۔ کیا آپ کو اپنی ایسی فائل دوبارہ ملی ہے جسے آپ جلا چکے تھے۔"

"ہاں میں نے زبردست دھوکا کھایا ہے۔ تمہاری باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمہیں
بھی جلی ہوئی فائل دوبارہ صحیح حالت میں ملی ہے۔"

"جی ہاں۔ مجھے بھی ملی ہے اور انوار صاحب کو بھی ملی ہے۔ ان فائلوں کے ساتھ
پرچی میں لکھا ہے کہ ہم آپ سے رابطہ کریں اور جو رقم پیر شاہ صاحب کو دی گئی ہے
اسے ایک ہفتے کے اندر پہلی قسط کے طور پر قومی خزانے میں جمع کرا دیں۔"

"وہ دونوں سسر داماد سیر پر سوا سیر ہیں۔ ہم ان کے درمیان پس کر رہ جائیں گے۔
فی الحال بہتری اسی میں ہے کہ ہم پیر شاہ صاحب سے اپنی رقمیں لے کر اپنے قرضوں کی
پہلی قسط ادا کر دیں۔ بعد میں دوسری قسطوں کی ادائیگی سے بچنے کا کوئی راستہ نکالیں گے۔
آپ اور انوار صاحب میرے فون کا انتظار کریں۔ میں ابھی پیر شاہ صاحب سے رابطہ کر
رہا ہوں۔"

اس نے رابطہ کیا۔ دوسری طرف سے آواز آئی۔ "ہیلو! ہم بول رہے ہیں۔"
ہمدانی نے کہا۔ "آپ صرف بولتے رہتے ہیں اور ہمارے جیسے قدر دانوں کو فریب
میں مبتلا کرتے رہتے ہیں۔"

انہوں نے غرا کر کہا۔ "مسٹر ہمدانی! آپ ہمیں فریبی کہہ رہے ہیں۔ اسے واپس
کریں ورنہ اسلام آباد چار کاندھوں پر جائیں گے۔"

"ہم تینوں نے جو فائلیں آپ کے سامنے جلائیں تھیں وہ دوبارہ صحیح حالت میں
ہمارے پاس پہنچا دی گئی ہیں۔ آپ کے داماد جس شعبے میں ہیں وہاں کے باکمال نقالوں نے
بالکل اصلی فائلوں کی طرح ہر نادہندہ کی تین تین فائلیں تیار کی ہیں' ایک ہم نے جلائی
دوسری ابھی ہم تینوں کے پاس ہے اور تیسری اسلام آباد میں ہے۔ اصلی فائلوں کا کسی کو
علم نہیں ہے کہ وہ کہاں ہیں۔ پھر یہ کہ اصلی فائلوں کی کمپیوٹر ڈسک اور مائیکرو فلم
بھی موجود ہیں۔"

انہوں نے کہا۔ "ہم اپنا ایک خاص بندہ بھیج رہے ہیں۔ وہ تینوں فائلیں اس کے حوالے



کریں' ہم انہیں ابھی پڑھیں گے۔"

"فائلیں بھیج دی جائیں گی۔ ہمیں اپنی اپنی رقم چاہیے۔ آپ کے داماد نے ایک
ہفتے کی مہلت دی ہے۔ ہمیں ان تمام رقومات کو پہلی قسط کے طور پر جمع کرنا ہوگا ورنہ وہ
ہمارا کیریئر تباہ کر دیں گے۔"

انہوں نے کہا۔ "ایک ہفتہ بہت ہوتا ہے۔ اگر ہم اینٹ کا جواب پتھر سے نہ دے
سکے تو پرسوں آپ سب کی رقمیں واپس مل جائیں گی۔"

انہوں نے رابطہ ختم کر دیا۔ دوسرے فون کے ذریعے اپنے خاص ماتحت سے کہا کہ
ہمدانی وغیرہ کے پاس جا کر تین فائلیں لے آئے۔ اسے حکم دینے کے بعد وہ سوچ میں پڑ
گئے۔ صداقت علی نے ان کی توقع کی خلاف ایسی چال چلی تھی کہ تینوں کو رقمیں واپس
کرنے سے انہیں ساڑھے تین کروڑ کا نقصان پہنچنے والا تھا۔

انہوں نے تمام نادہندگان کی فائلیں نکلوا لینے کے بعد دہشت گردی کے بہانے
ریکارڈ روم میں آگ لگوا دی تھی۔ انہیں یقین تھا کہ آئندہ باقی نادہندگان کے ذریعے بھی
انہیں کروڑوں روپے حاصل ہوں گے۔ اب یہ نئی بات سامنے آئی تھی کہ انہوں نے
ریکارڈ روم میں آگ لگوانے سے پہلے جتنی فائلیں غائب کی تھیں وہ سب نقلی تھیں۔
انہیں صرف ردی کی ٹوکری میں ڈالا جا سکتا تھا۔

ان کا داماد صرف ساڑھے تین کروڑ ہی نہیں' نہ جانے اور کتنے کروڑ روپے کا
نقصان پہنچانے والا تھا۔ کوئی مجبوری سی مجبوری تھی۔ وہ اپنی ہاجرہ بیٹی کو دل و جان سے
چاہتے تھے۔ اسے بیوہ نہیں بنا سکتے تھے۔ اپنے داماد پر قاتلانہ حملے نہیں کرا سکتے تھے۔ پھر
وہ ایسا حاضر دماغ اور چالاک تھا کہ شاید قاتلانہ حملوں سے بھی بچ نکلتا اور جواباً انہیں بھی
بڑا نقصان پہنچا سکتا تھا۔

ابھی تک داماد اور سسر کے درمیان ایک محدود سی جنگ تھی۔ وہ رشتوں کا لحاظ
کرتے ہوئے ایک دوسرے کے خلاف اقدامات کرتے تھے۔ انہوں نے فون کے ذریعے
صداقت سے رابطہ کیا پھر کہا۔ "ہیلو! ہم بول رہے ہیں۔"

"مجھے یقین تھا' آپ جلد ہی بولنے والے ہیں۔ آخر بول پڑے۔"

"کیا تمہیں ہماری بیٹی سے ذرا بھی محبت نہیں ہے؟ تمہاری شریک حیات کو اغوا کیا گیا ہے مگر اس شہر میں رہ کر اسے تلاش نہیں کر رہے ہو صرف اپنے دفتری فرائض میں الجھے ہوئے ہو۔ کیا ہم نے تمہیں اسی لیے اسلام آباد سے یہاں بلایا تھا؟"

"آپ نے اس لیے بلایا تھا کہ میں یہاں آؤں گا تو آپ میرے بنگلے سے ہدائی کی فائل غائب کرا دیں گے اور آپ نے غائب کرا دی۔ میں آپ کا فرمانبردار داماد ہوں۔ آپ کو مایوس نہیں کر سکتا تھا اس لیے آپ کے آدمی کو بڑی آسانی سے فائل لے جانے کا موقع دے دیا۔"

"ہم نے فضول باتیں کرنے کے لیے تمہیں مخاطب نہیں کیا ہے۔ ہاجرہ نے فون کے ذریعے ہمیں بتایا تھا کہ اسے اغوا کرنے والا تمہیں اس ملک میں دیکھنا نہیں چاہتا۔ اس نے دھمکی دی ہے کہ تم یہاں رہو گے تو ہاجرہ ہمیں زندہ نہیں ملے گی۔"

"آپ اس سلسلے میں کیا چاہتے ہیں؟"

"اب تو ہم بھی یہی چاہتے ہیں کہ تم دفع ہو جاؤ۔ ہماری بیٹی سے تمہیں محبت نہ سہی لیکن اسے اپنی بیٹی کی ماں سمجھ کر زندہ رہنے دو۔"

"میں نے ہاجرہ سے وعدہ کیا ہے کہ اسے کل صبح تک تلاش نہ کر سکا تو شام تک اپنی بیٹی کو لے کر لندن چلا جاؤں گا۔ میں آپ کی ہر مخالفانہ چال کا جواب دے رہا ہوں۔ ایک وہی دشمن ہے' جو میرے قابو میں نہیں آ رہا ہے۔ وہ دوسرا گاڈ فادر ایسے خاموش ہے جیسے مر گیا ہو۔ یہ اس کی چالاکی ہے کہ ہاجرہ کے ذریعے اپنے ارادے مجھ پر ظاہر کر رہا ہے اور مجھے اس ملک سے بھگانے کی ہر ممکن کوشش کر رہا ہے۔"

"ابھی تم نے کہا ہے کہ ہاجرہ صبح تک نہ ملی تو ملک چھوڑ کر چلے جاؤ گے۔ ہم اپنی بیٹی سے ملنا چاہتے ہیں اس لیے ہم بھی لندن جائیں گے وہ دشمن ہاجرہ کو وہاں پہنچانے والا ہے۔ ہم نہیں جانتے تم اور کیسی چالیں چلنا چاہتے ہو۔ اگر ایک باپ کے دل اور بیٹی کے لیے اس کی محبت کو سمجھنا چاہتے ہو تو دشمن کو دھوکا دینے کے لیے ہی چند روز کے لیے لندن چلو۔ ہم سب ایک خاندان کے افراد ہیں۔ وہاں دو چار روز ایک گھریلو محبت بھری زندگی گزار لیں گے۔ کیا تم سمجھ سکتے ہو کہ ہم ایسی خواہش کیوں کر رہے ہیں؟"



صداقت علی نے ایک لمبی سانس لے کر کہا۔ "ہاں۔ میں تھوڑی دیر کے لیے بھول گیا تھا کہ آج آپ کے اپنے بیٹوں نے اور پوتی پوتے نے آپ کا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ میں اپنی بیٹی شہناز کے حوالے سے یہ تسلیم کرتا ہوں کہ ایسے وقت ہاجرہ کو آپ کے پاس ہونا چاہیے اور یہ بات دل کو لگ رہی ہے کہ دشمن کو خوش فہمی میں مبتلا کرنے کے لیے ہم سب کو کچھ روز کے لیے لندن جانا چاہیے۔"

"او خدایا! تم زندگی میں پہلی بار ایک باپ کی حیثیت سے دوسرے باپ کے درد کو سمجھ رہے ہو۔ کل صبح تک ہاجرہ کو ڈھونڈ نکالنے کے لیے ہم بھی اپنے تمام ذرائع استعمال کریں گے۔"

"اور میں بھی یہی کر رہا ہوں۔ کل صبح آپ سے رابطہ کروں گا۔"

اس نے موبائل فون بند کر دیا۔ اس وقت وہ اپنے خاص ماتحت سکندر اور چار عدد نقلی سپاہیوں کے ساتھ ایک لینڈ کروزر میں بیٹھا اپنے سسر کی کوٹھی کی طرف جا رہا تھا۔ وہاں پہنچنے سے پہلے یہ اطمینان کر چکا تھا کہ شہناز' سنی کو رخصت کرنے کے لیے ایئرپورٹ گئی ہے اور سیکیورٹی افسر ایک ڈرائیور کی حیثیت سے ان کے ساتھ گیا ہوا ہے۔

ان کی لینڈ کروزر کوٹھی کے آہنی گیٹ کے سامنے رک گئی۔ گیٹ کے کیبن میں سیکیورٹی افسر کا اسسٹنٹ تھا۔ دوسرے گارڈ بھی موجود تھے۔ وہ سب صداقت علی کو اس گھر کے داماد کی حیثیت سے جانتے تھے۔ انہوں نے اسے سلام کیا۔ اس نے اسسٹنٹ سیکیورٹی افسر کو بلا کر کہا۔ "ابھی میں رشتے دار کی حیثیت سے نہیں بلکہ سرکاری ڈیوٹی ادا کرنے آیا ہوں۔ اوپر سے احکامات آئے ہیں کہ اس کوٹھی کی تلاشی لی جائے۔"

اسسٹنٹ سیکیورٹی افسر نے کہا۔ "سر! آپ یوں اچانک تلاشی لینا چاہیں گے تو ہمارے لیے مسئلہ پیدا ہو جائے گا۔"

"کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہو گا۔ میں تلاش کے سلسلے میں سرچ وارنٹ لے کر آیا ہوں۔ یہ دیکھو۔"

اس نے سرچ وارنٹ اسے دیتے ہوئے کہا۔ "یہ عدالتی حکم ہے اور میں ڈائریکٹر جنرل ہوں۔ مجھے قانونی کارروائی سے کوئی نہیں روک سکے گا۔"

بات قانونی تھی اور تمام سیکیورٹی گارڈز پرسنل ڈیوٹی پر رہنے کے باوجود قوانین کے پابند ہوتے ہیں۔ اس کوٹھی میں چھ گارڈز تھے۔ انہوں نے مجبوراً صداقت وغیرہ کو کوٹھی کے اندر جاکر تلاشی لینے کی اجازت دے دی۔ ان کے ساتھ دو گارڈز بھی گئے۔

صداقت نے کہا۔ "میری تلاشی کے دوران مداخلت نہ کی جائے۔ میں اوپری منزل پر جارہا ہوں۔ کوئی میرے پیچھے نہ آئے۔"

ایک تو وہ داماد تھا۔ دوسرے ڈائریکٹر جنرل تھا۔ سیکیورٹی گارڈز اس کے تمام احکامات کی تعمیل پر مجبور تھے۔ وہ تنہا اوپری منزل پر گیا۔ شہناز نے پگھلے ہوئے موم پر لاک کا سانچہ بنا کر پہلے ہی باپ کو دے دیا تھا۔ اس سانچے سے صداقت نے چابی بنوالی تھی جس کے ذریعے پیر عظمت اللہ شاہ سلطانی کی خواب گاہ کا دروازہ کھل گیا۔

اس نے اندر آکر چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ خواب گاہ میں ایک طرف آئرن سیف رکھا ہوا تھا۔ نمبروں کے ذریعے کھلنے والا وہ آئرن سیف ایک دھوکا تھا۔ اس کے مخصوص نمبر معلوم ہوتے تب بھی کوئی اسے کھول نہیں سکتا تھا۔

اس سیف کے قریب جاتے وقت صداقت علی کے کانوں میں پیانو کی آواز سنائی دینے لگی۔ Musical Message Signal کے طریقہ کار کے مطابق تصور میں شہناز پیانو بجارہی تھی۔ پیانو کی ایک ایک ریڈ اور اس ریڈ سے نکلنے والے سُر کا ایک اشارتی حرف ہوتا تھا۔ ان تمام حروف سے لفظ بنتے تھے پھر لفظوں سے فقرے مکمل ہوتے تھے۔

صداقت کی سماعت میں پیانو کے سُروں کی ترتیب نے کہا۔ "دی فرنٹ لاک آف دی سیف از اے شو پیس۔ دی رئیل ون از اٹیچڈ وِدھ دی وال۔" (آئرن سیف کا سامنے والا لاک محض نمائشی ہے اصل لاک دیوار کی طرف والے حصے میں ہے۔")

صداقت نے اس آہنی سیف کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر پوری قوت سے سرکایا۔ وہ دیوار سے لگا ہوا تھا۔ جب وہ دیوار سے ہٹ گیا تو دیوار کی طرف والے حصے میں اصل لاک دکھائی دیا۔ اس لاک کو مخصوص نمبروں سے کھولا جاتا تو آہنی سیف کا پٹ کھل جاتا۔

صداقت کی سماعت میں چینی کی پلیٹ اور ایک چمچ کی موسیقی سنائی دینے لگی۔



شہناز نے چمچ سے تین بار پلیٹ کو بجایا پھر ایک ذرا سے وقفے کے بعد پانچ بار بجایا۔ اس کے بعد وہ پلیٹ پر چمچ کو گھسنے لگی۔ گھسنے کا مطلب تھا صفر.........

اس اشارتی میوزیکل پیغام کے مطابق صداقت نے پہلے لاک کے تین نمبر کو گھمایا پھر پانچ' زیرو' ٹو اور آخر میں ڈبل نائن کو۔ مخصوص نمبروں کو گھمانے کے بعد اس نے سیف کے ہینڈل کو پکڑ کر دبایا تو اس آہنی تجوری کا پٹ کھل گیا۔

انسان جتنا کم سنتا ہے' اتنا ہی کم بولتا ہے اور جتنا کم بولتا ہے' اتنا ہی بولنے والوں کے اندرونی رازوں تک پہنچتا ہے۔ بیٹی بہری اور گونگی نہ ہوتی تو باپ کبھی اس آئرن سیف کو کھول نہ پاتا۔ اسے یقین تھا کہ اس سیف کے اندر پیر عظمت اللہ شاہ سلطانی کے خلاف ایسے ایسے دستاویزی ثبوت ہوں گے جن کے ذریعے ثابت ہو جائے گا کہ وہ ایک زیرزمین ایجنسی کا گاڈ فادر ہے۔

کوئی ضروری نہیں ہے کہ آدمی جو چاہے وہی اسے مل جائے۔ صداقت نے سیف کے پٹ کو کھولا تو چند لمحوں کے لیے حیران اور ساکت رہ گیا۔ تجوری کے اندر دستاویزات نہیں تھیں۔ وہاں ایک رحل پر کلام پاک رکھا ہوا تھا۔

رحل سونے کی تھی۔ اس پر اتنے قیمتی ہیرے موتی جڑے ہوئے تھے جن کی قیمت کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ کلام پاک کی اوپری جلد پر سونے کے تاروں سے قرآن مجید لکھا ہوا تھا۔ اب یہ علمائے دین فتویٰ دینے کے اہل ہیں کہ کلام پاک کے ایک حرف کو بھی سونے اور چاندی کی تاروں سے لکھا جا سکتا ہے یا نہیں؟ لیکن جو بے انتہا دولت مند ہوتے ہیں' وہ دینی معاملات میں بھی دولت کی نمائش ضرور کرتے ہیں۔ رحل کے سامنے جو تسبیح رکھی ہوئی تھی اس میں عدن کے قیمتی موتی پروئے ہوئے تھے۔ وہ ایک تسبیح تقریباً ایک لاکھ روپے کی ہوگی۔

رحل کے قریب ایک چھوٹا سا کیسٹ ریکارڈر رکھا ہوا تھا۔ اس ریکارڈر پر ایک چھوٹی سی پرچی چسپاں تھی۔ اس پرچی پر لکھا تھا۔ "مجھے سن لو۔"

صداقت علی نے اسے پلے کرنے کا بٹن دبایا۔ وہ آن ہو گیا۔ چند لمحوں کے بعد اس میں سے پیر عظمت اللہ شاہ سلطانی کی آواز ابھری۔ "ہیلو! ہم بول رہے ہیں۔ یقین تو

نہیں ہے کہ کوئی یہاں تک پہنچ سکے گا لیکن یقین کے باوجود مقدر کسی کو یہاں تک لا سکتا ہے اور جو یہاں آ جائے اس سے التجا ہے کہ وہ کسی چیز کو ہاتھ نہ لگائے۔ یہ ہماری جان سے زیادہ عزیز بیٹی کی امانت ہے۔

"لالچ سے بھری ہوئی اس دنیا میں بیٹے دولت کی خاطر باپ کو قتل کر دیتے ہیں۔ ہم نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے اور یہ اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ دونوں بیٹوں کی چند کمزوریاں اگر ہمارے قبضے میں نہ ہوں تو وہ ہمیں خاموشی سے زہر دے کر مار سکتے ہیں لیکن ہماری ہاجرہ بیٹی ہماری خدمت کرنے کو اپنا ایمان سمجھتی ہے۔ ہم اس کے نام زمین جائیداد کا کچھ حصہ لکھنا چاہتے تھے لیکن اس نے انکار کر دیا ہم نے ضد کی کہ وہ ہم سے کچھ لے۔

اس نے پوچھا۔ "ابا حضور! میں جتنا مانگوں گی' اتنا ہی دیں گے؟"

ہم نے وعدہ کیا۔ اس نے کہا۔ "مجھے صرف ایک قرآن مجید چاہیے۔"

"بیٹی! خدا تمہیں ہمیشہ خوش حال رکھے لیکن قرآن مجید سے علم حاصل ہوتا ہے روزی حاصل نہیں ہوتی۔ تمہیں زندگی گزارنے کے لیے ہم سے اتنی جائیداد اور نقدی لینا چاہیے کہ ہمارے بعد کسی کی محتاج نہ رہو۔"

"ابا حضور! آخری سانس تک زندگی کو بحال رکھنے کی ذمہ داری میرے سرتاج صداقت علی پر ہے اور وہ واقعی محبت کرنے والے ایک ذمہ دار شوہر ہیں۔ میں میکے اور سسرال جہاں رہتی ہوں' کسی کی محتاج نہیں رہتی۔ جب ہر پہلو سے اطمینان حاصل ہو تو پھر ہمیں زیادہ سے زیادہ ایمان کی دولت حاصل کرنا چاہیے۔"

"ہم نے یہ کلام پاک اپنی بیٹی ہاجرہ کے لیے رکھا ہے۔ وہ کہتی ہے کہ اسے تجوری میں رکھا جائے' تب بھی کوئی اس دولت کو نہیں چرا سکتا۔ اسی لیے ہم نے اسے یہاں رکھا ہے اور بیٹی کے اس ایمان کو سمجھا ہے کہ چور آئے گا تو ہیرے موتیوں سے جڑی ہوئی رحل اور تسبیح لے جائے گا لیکن کلام پاک یہیں چھوڑ دے گا۔

"شاید دنیا میں کبھی ایسا ہوا ہو۔ ہم نے اپنی طویل زندگی میں آج تک نہ دیکھا نہ سنا کہ کسی نے کلام پاک کو چرایا ہو۔ ہماری ہاجرہ کی خواہش ہے کہ اس قرآن مجید کو کوئی چرا



کر لے جائے۔ جب کوئی چوری کی نیت سے آیا ہو تو اسے ضرور چرائے۔ اس کا ایک ایک لفظ' ایک ایک معنی و مفہوم چرائے۔ جب صحیح معنوں میں اسے کوئی چرائے گا تو ہیرے موتیوں سے جڑی ہوئی رحل کو چرانا بھول جائے گا۔

"اس کیسٹ کے ذریعے ہماری آواز سننے والے اجنبی چور! تم کون ہو؟ تم جو کوئی بھی ہو ہماری بیٹی کا دل نہ توڑنا۔ ایمان کو کمزور نہ بنانا۔ اس کلام پاک کو ضرور اپنے ساتھ لے جانا۔ چوری کی ایک نئی طرح ضرور ڈالنا۔ جب محبت سے دل چراتے ہیں تو کیا علم و آگہی کے لیے کلام پاک نہیں چرا سکتے؟ چوری صرف منفی نہیں ہوتی' مثبت بھی ہوتی ہے۔ کسی کو نقصان پہنچائے بغیر راہ حق کی سمت کا تعین بھی کرتی ہے.........."

کیسٹ سے پیر عظمت اللہ شاہ سلطانی کی آواز ابھر رہی تھی۔ وہ جو کچھ کہہ رہے تھے' اس سے باپ بیٹی کی بھرپور محبت کا اظہار ہو رہا تھا اور یہ منافقت بھی ظاہر ہو رہی تھی کہ وہ سیف میں رکھے ہوئے کلام پاک کے حوالے سے اپنے اندر بھرپور ایمان رکھتے ہیں اور اس سیف کے باہر زیر زمین ایجنسی کے گاڈ فادر بھی ہیں۔

ایسے ہی وقت موبائل فون نے صداقت کو متوجہ کیا۔ اس نے کیسٹ ریکارڈر کو بند کر دیا پھر اپنے فون کا بٹن دبا کر آن کرتے ہوئے پوچھا۔ "ہیلو! کون؟"

فون کرنے والی ہاجرہ تھی۔ وہ ایک بہت ہی شاندار ڈرائنگ روم میں موبائل فون کو کان سے لگائے کھڑی ہوئی تھی۔ ڈرائنگ روم میں فینسی لائٹس کی دھیمی دھیمی روشنی تھی۔ اس کا آدھا چہرہ روشن تھا اور آدھا نیم تاریکی میں تھا۔ اس نے کہا۔ "صداقت! میں بول رہی ہوں۔ خدا کے لیے جلدی کوئی فیصلہ کریں۔ میں حبس بے جا میں نہیں رہوں گی۔"

"ہاجرہ! حوصلہ کرو۔ میں صبح ہونے تک تمہیں ضرور ڈھونڈ نکالوں گا۔"

"یہ طفل تسلیاں ہیں۔ میری بات مان لیں۔ کل ہر حال میں کسی بھی فلائٹ سے لندن چلے جائیں۔"

"کیا میرے لندن جانے سے تمہیں کوئی فائدہ پہنچے گا؟"

"آپ کیسی بچگانہ باتیں کر رہے ہیں؟ دشمن کہہ چکا ہے کہ آپ کے جاتے ہی وہ

کسی دوسری فلائٹ سے مجھے آپ کے پاس بھیج دے گا۔"

"کسی بے وفا کی محبت اور عداوت رکھنے والے دشمن کی باتوں پر کبھی بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔ میرا اپنا ایک طریقہ کار ہے۔ مجھے ایک جگہ سے سگنل ملنے والا ہے۔ سگنل ملتے ہی میں اس خفیہ اڈے تک پہنچ جاؤں گا جہاں سے تم ابھی بول رہی ہو۔"

وہ فون کو کان سے لگائے ایک طرف چلتی ہوئی بولی۔ "آپ دشمن کو بہت نادان سمجھ رہے ہیں۔ میں نے اتنے دنوں میں اچھی طرح اندازہ کرلیا ہے کہ وہ آپ کی گرفت میں کبھی نہیں آئے گا اور نہ ہی آپ کبھی جان سکیں گے کہ مجھے کس نے اغوا کیا ہے؟"

ایسا کہتے ہوئے ہاجرہ نے ایک طرف کسی کو دیکھا پھر اثبات میں سرہلا کر دوسرے ہاتھ سے ایک پلگ کو اٹھایا اور اسے سوئچ سے لگا دیا پھر اس کے ساتھ والے بٹن کو دبا دیا۔

بٹن دباتے ہی حقے کا ہیٹر آن ہوگیا۔ ہاجرہ نے قریب آکر چاندی کے ڈبے سے زعفرانی تمباکو نکال کر ہیٹر کی اوپری سطح پر ڈالا۔ ڈرائنگ روم کی فضا میں زعفران کی خوشبو پھیلنے لگی۔

ابھی سائنس نے اتنی ترقی نہیں کی ہے کہ خوشبو ایک فون سے گزر کر دوسرے فون ریسیو کرنے والے کے نتھنوں تک پہنچ سکے۔ بیٹی نے حقے کی نَے باپ کو پیش کرتے ہوئے فون پر کہا۔ "صداقت! وعدہ کریں۔ صبح تک آپ نہ پاسکیں تو یہ ملک چھوڑ دیں گے۔"

اسے پالینا مشکل نہ ہوتا اگر وہ اغوا کی جاتی۔ وہ تو میکے اور سسرال کے درمیان آنکھ مچولی کھیل رہی تھی اور باپ یہ کھیل کھلا رہا تھا۔

اس نے فون بند کر دیا۔ انہوں نے ایک کش لگایا پھر اطمینان سے ٹھہر ٹھہر کر کش لگاتے رہے۔ وہ حقہ ایک باپ کے ذہنی سکون کے باعث گڑگڑا رہا تھا۔ ایک شوہر کی ناکام جستجو پر گڑگڑا رہا تھا اور ان سب کے منافقانہ اعمال پر گڑبڑاتا جا رہا تھا۔

نورن سہاگی بڑے فخر سے اپنے جوان بیٹے کو دروازے پر بٹھا کر قانون کے دروازے پر گئی تھی۔ محلے سے جاتے وقت اس کا سر فخر سے اٹھا ہوا تھا کیونکہ وہ قانون کی بالادستی کے لیے جا رہی تھی لیکن اس کے جانے کے بعد قانون کے محافظ اپنے ڈی آئی جی



کے ساتھ دو گاڑیوں میں بیٹھ کر نورن سہاگی کے دروازے پر پہنچ گئے تھے۔

پولیس کی گاڑیاں دیکھ کر محلے والے اِدھر اُدھر ہونے لگے۔ ڈی آئی جی کے ماتحت نے گاڑی سے اتر کر گرجتے ہوئے کہا۔ "یہاں سے کوئی نہیں جائے گا۔ جو جہاں ہے' وہیں کھڑا رہے اور ہمارے منشی کو اپنا نام اور پتہ لکھوائے۔"

ڈی آئی جی نے گاڑی سے اتر کر سچل کو دیکھا۔ سچل اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ ڈی آئی جی نے پوچھا۔ "کیا یہ مائی سہاگی کا مکان ہے؟"

سچل نے اثبات میں سرہلایا۔ دوسرا سوال کیا گیا۔ "کیا تم اس کے بیٹے ہو اور ابھی مڈل ایسٹ سے آئے ہو؟"

"جی ہاں' میرا نام سچل نواز ہے۔ میں ایک گھنٹا پہلے یہاں آیا ہوں۔"

"یہ جو سامان باہر پڑا ہے۔ اس میں کیا ہے؟"

"میری ماں جی قانون کے محافظوں کو یہی بتانے گئی ہیں کہ میری اٹیچیوں میں پہلے صرف میرا سامان تھا مگر ایئرپورٹ پر میرے سامان کو تبدیل کر دیا گیا اور مجھے معلوم نہ ہو سکا۔ یہاں دو اٹیچیوں میں سونے کے بسکٹ ہیں۔"

ڈی آئی جی نے سامان کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے ماتحت افسر نے سامان کی تلاشی لی۔ دو اٹیچیوں میں بھرے ہوئے سونے کے بسکٹ دیکھ کر محلے والوں کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ انہوں نے کبھی اتنا ڈھیر سارا سونا ایک ساتھ نہیں دیکھا تھا۔

ماتحت افسر نے سچل سے کہا۔ "اچھا تو تم سونا اسمگل کرتے ہو؟"

سچل نے کہا۔ "اگر میں اسمگلر ہوتا تو سونا یہاں باہر پڑا نہ رہتا۔ جو مجرم ہوتے ہیں وہ اپنا جرم سب سے پہلے چھپاتے ہیں مگر میں اسے حکومت کی تحویل میں دینے کے لیے یہاں ماں جی کے انتظار میں بیٹھا ہوا ہوں۔"

ڈی آئی جی نے محلے والوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم سب اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو۔ یہ مائی سہاگی کا بیٹا ابھی بیرون ملک سے آیا ہے اور اپنے سامان میں لاکھوں روپے کا سونا چھپا کر لایا ہے۔"

ماتحت افسر نے کہا۔ "منشی جی گواہ نامہ لکھ رہے ہیں۔ تم سب چشم دید گواہوں کی

حیثیت سے گواہ نامے پر دستخط کرو گے۔"

کس کی مجال تھی کہ پولیس افسر کے حکم سے انکار کرتا۔ وہ سب بے بسی سے سچل کو دیکھنے لگے۔ سچل نے کہا۔ "آفیسر! آپ مجھے غلط سمجھ رہے ہیں۔ میں ابھی کہہ چکا ہوں کہ ماں جی آپ جیسے قانون کے محافظوں کو بلانے گئی ہیں۔ وہ تمام محلے والوں کے سامنے یہ سارا سونا ان کے حوالے کرنا چاہتی ہیں۔ پلیز آپ ان کا انتظار کرلیں۔"

"ہم پولیس والے اتنے نادان نہیں ہیں کہ تمہارے فرار ہونے کا انتظار کریں۔ سپاہی دین محمد' اسے ہتھکڑی لگا دے۔"

وہ جرم سے انکار کرتا رہا۔ ہتھکڑیاں لگانے پر احتجاج کرتا رہا مگر وہ تمام سپاہی' منشی اور ماتحت افسر تیزی سے قانونی کارروائی کی تکمیل کر رہے تھے۔ تمام محلے والوں سے چشم دید گواہوں کی حیثیت سے کاغذات پر دستخط کرا رہے تھے پھر وہ اسمگل کیے ہوئے سونے کے ساتھ سچل کو ایک گاڑی میں بٹھا کر لے گئے۔

وہ دہلیز خالی ہو گئی جہاں ماں اپنے بیٹے کو بٹھا کر گئی تھی۔ وہاں جو کچھ ہوا اس پر محلے والے تبصرے کرنے لگے۔ بعض کہہ رہے تھے کہ وہ اسمگلنگ کے مال کے ساتھ پکڑا گیا ہے۔ ڈھیر سارا سونا اس کے سامان سے برآمد ہوا ہے۔ لہٰذا وہ ٹھوس ثبوت اور بے شمار چشم دید گواہوں کے بیانات کے مطابق مجرم ہی قرار پائے گا۔ بعض کہہ رہے تھے کہ انہوں نے مائی سہاگی کو برسوں سے فقروفاقے کی زندگی گزارتے دیکھا ہے۔ اس نے آس پاس کی کتنی ہی گلیوں کے جوانوں کو نشے کی لعنت سے نجات دلائی ہے۔ محلے کے جوان اور بوڑھے دل بہلانے کے لیے تاش کھیلتے ہیں مگر جوا نہیں کھیلتے۔ ایسا کرنے سے مائی سہاگی انہیں باتیں سناتی ہے اور محبت سے سمجھاتی بھی رہتی ہے۔ وہ محض اپنے گیتوں سے جادو نہیں جگاتی ہے بلکہ سیدھی سادی' صاف ستھری نیتوں کے ساتھ زندگی گزارنے کا درس دیتی رہتی ہے۔ ایسی ماں کا بیٹا اسمگلر نہیں ہو سکتا۔

تقریباً تین گھنٹے کے بعد وہ واپس آئی۔ جاتے وقت قانون کی بالادستی کے لیے اس کا سر اٹھا ہوا تھا۔ واپسی پر وہی سر جھکا ہوا تھا۔ وہ صدمے سے نڈھال ہو رہی تھی۔ محلے والے اس کے آگے پیچھے چلتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔ "کیا ہوا مائی! اپنا سچل کہاں ہے؟"



"مائی سہاگی! تُو بہت بڑی فنکارہ ہے۔ کیا پولیس والوں نے تیری زبان پر بھروسہ نہیں کیا ہے؟؟"

"انہوں نے کچھ تو کہا ہوگا' اسے چھوڑیں گے یا نہیں؟؟"

اس سے کچھ بولا نہیں جا رہا تھا۔ وہ ڈگمگاتے قدموں سے اپنے مکان کے سامنے آئی اور جہاں بیٹے کو بٹھا کر گئی تھی' اس دہلیز پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی۔ پڑوسن فوراً ہی اپنے گھر سے ایک گلاس میں پانی لے کر آئی۔ گلاس کو اس کے ہونٹوں سے لگا کر پانی پلایا۔ پانی پینے کے بعد وہ گہری گہری سانسیں لینے لگی۔

سب اسے خاموشی سے اور سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ تھکے ہوئے انداز میں بولی۔ "تم لوگ کتنے سوالات کرو گے؟ کیا ایک ہی جواب کافی نہیں ہے کہ میرے دونوں ہاتھ خالی ہیں اور میری دہلیز سے جوان بیٹے کو قانون کے محافظوں نے اغوا کیا ہے۔"

ایک جوان نے آگے بڑھ کر کہا۔ "مائی! اگر وہ سچل بھائی کو چھوڑنے کے لیے کچھ مانگتے ہیں تو ہم محلے والے چندہ کریں گے۔"

کتنے ہی لوگوں نے تائید کرتے ہوئے کہا کہ وہ گھر گھر جا کر رقم جمع کریں گے اور سچل کو جھوٹے الزام سے بری کرا کے لے آئیں گے۔

وہ بولی۔ "تم سب اچھی طرح جانتے ہو' میں نہ حرام کھاتی ہوں اور نہ کھلاتی ہوں۔ پولیس کو رقم دینا رشوت دینا ہے اور رشوت دینا جرم ہے۔ میرے بیٹے نے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ وہ حوالات یا جیل کی بجائے گھر میں آ کر رہے گا تو کیا فرق پڑے گا۔ کیا گھروں میں رہنے والے مجرم نہیں ہوتے اور کیا جیلوں میں رہنے والے سب ہی مجرم ہوتے ہیں۔ اس ملک کی کسی بھی جیل میں جا کر دیکھ لو۔ تمہیں بے قصور قیدی زیادہ نظر آئیں گے۔ ان میں میرے ایک بیٹے کا اضافہ ہو جانے دو۔"

ایک عورت نے کہا۔ "مائی سہاگی! یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ تُو کیسی ماں ہے۔ بیٹا سات سمندر پار سے آیا مگر تُو نے اسے اپنے گھر میں گھسنے نہیں دیا۔ دروازے پر بٹھائے رکھا۔ اب وہ حوالات میں ہے تو کہتی ہے کہ اسے وہیں رہنا چاہیے۔"

دوسری عورت نے کہا۔ "ٹھیک ہے کہ تُو سچائی پر قائم رہ کر انصاف چاہتی ہے مگر اس کے لیے تو بڑی مقدمے بازی ہو گی۔ برسوں گزر جائیں گے اور عدالت سے تاریخیں ملتی جائیں گی مگر انصاف نہیں ملے گا۔"

ایک بوڑھے نے کہا۔ "ہماری بات مان لے۔ بیٹے کی خاطر سچائی اور انصاف کو بھول جا۔ تھانے میں مک مکا کر لے۔ یہ زبردستی گلے پڑنے والی مصیبت صبح ہونے تک دور ہو جائے گی اور بیٹا گھر آ جائے گا۔"

"ہم سب کتنے مجبور ہیں' اپنے بے قصور بیٹوں اور بھائیوں کو عدالتوں' وکیلوں کے بھاری اخراجات سے بچانے کے لیے شارٹ کٹ اختیار کرتے ہیں۔ تھانے میں ہی پچیس پچاس ہزار دے کر پولیس والوں کو اپنا مائی باپ بنا لیتے ہیں۔"

"کیا کریں مائی؟ تھانے میں لاتوں جوتوں اور ماں بہن کی گالیوں سے بچنے کا یہی طریقہ ہے۔ غریب کی جتنی عزت رہ گئی ہے' اتنی ہی عزت بچائے رکھنے کے لیے اپنی حیثیت کے مطابق اتنا لٹنا پڑتا ہے جتنا دولت مند ڈاکوؤں سے بھی نہیں لٹتے ہوں گے۔"

ایک نوے سال کے بوڑھے نے لاٹھی ٹیک ٹیک کر آگے بڑھتے ہوئے اور تھرتھراتے ہوئے کہا۔ "دیکھ سہاگی! مجھے دیکھ' میں کبھی پولیس انسپکٹر تھا۔ میں نے قسم کھائی تھی کہ کبھی حرام نہیں کھاؤں گا اور میں نے نہیں کھایا۔ آج میرے سر پر چھت نہیں ہے۔ مسجد کے پیش امام صاحب کو روٹیاں پہنچائی جاتی ہیں ان میں سے وہ مجھے بھی کھلاتے ہیں۔ ہم آدھا آدھا پیٹ کھاتے ہیں۔ ملازمت کے دوران میں نے جن لوگوں کے ساتھ بڑی نیکیاں کیں اور انصاف دلایا آج وہ مجھے پوچھتے بھی نہیں۔ میں کسی نہ کسی گھر کے برآمدے میں رات گزار لیتا ہوں۔ میں مانتا ہوں کہ عاقبت سنوارنے کے لیے ایمانداری آخری سانس تک ہمیں آزماتی ہے مگر خدا کے لیے ایسی ایمانداری سے جوان بیٹے کی زندگی برباد نہ کر۔ میری زندگی تو مسجد اور کسی نہ کسی گھر کے دروازے پر گزر رہی ہے مگر تیرے بیٹے کی جوانی کو جیل کی چاردیواری میں زنگ لگ جائے گا۔ میں تو بڑھاپے میں مروں گا تُو اسے جوانی میں بے موت کیوں مارنا چاہتی ہے؟"

ایک جوان نے کہا۔ "ہم نے چشم دید گواہی کے کاغذات پر دستخط کیے ہیں لیکن



اس وضاحت کے ساتھ نہیں کہ مائی سہاگی نے حرام کے مال کو گھر میں لانے نہیں دیا تھا اور اسے پولیس والوں کے حوالے کرنے کے لیے انہیں بلانے گئی تھی۔ ہم اپنے بیان میں تبدیلی کر سکتے ہیں۔"

"کیسے تبدیلی کر سکتے ہیں؟ پولیس والے ہم سے زیادہ داؤ پیچ جانتے ہیں۔"

نوے برس کے بوڑھے نے کہا۔ "میں بھی پولیس والا تھا۔ میں بھی بچاؤ کے کچھ راستے جانتا ہوں۔ ہم صحافیوں کی مدد حاصل کریں گے۔ اپنے صحیح اور مکمل بیانات انہیں دیں گے تو سچل بیٹے کی حمایت میں اٹھنے والی آواز مستحکم ہو جائے گی۔"

ایک نے پوچھا۔ "کیا اخبار والے ہمارا ساتھ دیں گے؟"

"کیوں نہیں۔ جب بڑے لوگ اور نامور فنکار پریس کانفرنس کرتے ہیں تو اس کی تفصیلی رپورٹس شائع ہوتی ہیں۔ مائی سہاگی ہمارے ملک کی نامور فنکارہ ہے۔ اخبار والے اس کا بیان ضرور شائع کریں گے۔"

نورن سہاگی نے کہا۔ "مجھے خوشی ہے کہ تم سب میرے بیٹے کے لیے آج رات کی نیندیں حرام کرو گے۔ اگر بڑے بڑے اخبارات کے دفتروں میں چلنا چاہو تو ابھی تمام دفاتر کھلے ہوں گے لیکن ایک شرط پر چلوں گی۔"

"واہ مائی! ہم تیرے بیٹے کے لیے بھاگ دوڑ کریں گے اور تُو کوئی شرط ایسے لگا رہی ہے جیسے وہ تیرا بیٹا نہیں ہے۔"

"پہلے میری بات سن لو اگر پولیس والوں نے اخبار والوں کے دباؤ پر یا اور کسی کی سفارش پر سچل کو رہا کرنا چاہا تو وہ اس وقت تک رہائی قبول نہیں کرے گا جب تک اصلی مجرم کو گرفتار نہیں کیا جائے گا۔"

"سچل کی رہائی کے بعد اصلی مجرم کو ضرور تلاش کیا جائے گا۔"

"مجرم کو تلاش نہیں کرنا پڑے گا۔ میرے بیٹے کے سامان میں وہ سونا اس کے باپ نے رکھوایا ہے۔"

"کیا؟" سب نے چونک کر حیرانی سے اسے دیکھا پھر بوڑھے نے پوچھا۔

"مائی! کیا تُو یہ کہنا چاہتی ہے کہ تیرے شوہر نے اپنے ہی بیٹے کو گرفتار کرایا ہے۔"

کیا تھانے والے' اخبار والے اور دنیا والے یہ تسلیم کریں گے کہ ایک باپ نے اپنے بیٹے سے دشمنی کی ہے۔"

"جب ایسے سوالات کیے جائیں گے تو دشمنی کے ثبوت میں پیش کروں گی۔"

"تیرے ثبوت سچے ہوں گے۔ تُو زیادہ سے زیادہ یہی کہے گی کہ تُو نے رزق حلال حاصل کرنے کے لیے اپنے شوہر سے علیحدگی اختیار کرلی۔ تُو اپنے بیٹے کو بھی ایسی دیانت داری کی تعلیم دیتی رہی لیکن باپ اپنے بیٹے کو اپنے نقش قدم پر چلانے کے لیے اسے سمگلنگ کی راہ پر لگا رہا ہے۔"

ایک شخص نے کہا۔ "تیرے ایسا کہنے سے کوئی یہ تسلیم نہیں کرے گا کہ اتنا عزت دار سائیں رب راکھن اپنی عزت پر دھبا لگانے کے لیے اپنے بیٹے کو مجرم بنائے گا۔"

نورن سہاگی نے کہا۔ "اتنے عزت دار سائیں کو پھولوں کے ہار پہنانے والے اس پر الزام دینے سے میرا مذاق اڑائیں گے مگر الزام خود ہی ثابت ہو جائے گا۔"

سب لوگ اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے' وہ بولی۔ "ابھی مجھ سے کوئی سوال نہ کرنا۔ ہم یہاں وقت ضائع نہ کریں تو بہتر ہے۔ ہمیں ابھی کئی اخبارات کے دفتر جانا ہے۔"

وہ دہلیز پر سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ عام طور پر محلے والوں میں اتحاد نہیں رہتا۔ لوگ آپس میں چھوٹے بڑے معاملات پر لڑتے رہتے ہیں۔ خصوصاً عورتیں کسی معاملے میں ایک دوسرے کی برتری پر کڑھتی رہتی ہیں اور لڑائی کا کوئی بہانہ ڈھونڈ نکالتی ہیں۔ مائی سہاگی فنکارہ ہونے کے ناتے ان سے بہت برتر تھی۔ تمام ملک میں شہرت رکھتی تھی۔ اس سے تو ساری عورتوں کو حسد کرنا چاہیے تھا لیکن وہ عزت' شہرت اور گانے کا اچھا خاصہ معاوضہ حاصل کرنے کے باوجود محلے کی عورتوں کی طرح سادگی سے رہتی تھی۔ وہاں کے کتنے ہی جوان ایسے تھے جنہیں ہیروئن کے نشے کی لعنت سے نجات دلانے کے لیے وہ رقم خرچ کرتی تھی جو اسے گانوں کی رائلٹی کے طور پر ملتی تھی۔ کوئی سپاہی اس محلے میں کمائی کرنے کے لیے دھونس جمانے آتا تو وہ اس سپاہی کے بڑے افسروں تک پہنچ جاتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس رات سچل کی رہائی کے لیے محلے کی عورتیں اور مرد متحد ہو گئے تھے۔



تقریباً سو افراد محلے سے ایک جلوس کی شکل میں اخبارات کے دفتروں کی طرف روانہ ہو گئے تھے۔

اس رات ڈی آئی جی اپنی کوٹھی میں جاگ رہا تھا۔ سائیں رب راکھن کے بیٹے کی گرفتاری اور سونے کی اسمگلنگ کا معاملہ تھا۔ سائیں اپنے گوٹھ سے چل پڑا تھا۔ وہ رات کے ایک بجے ڈی آئی جی کی کوٹھی میں پہنچا۔ معاملات پہلے طے ہو چکے تھے۔ پولیس اسٹیشن میں انسپکٹر اور سپاہیوں سے کہہ دیا گیا تھا کہ وہ تمام ڈیوٹی پر رہیں گے۔ سائیں کے پہنچنے کے بعد اسمگلنگ کا کیس ختم کرنے کے بعد چھٹی کریں گے۔

ڈی آئی جی' سائیں رب راکھن کی لینڈ کروزر میں بیٹھ کر تھانے کی طرف روانہ ہوا۔ اس نے کہا۔ "سائیں! ہم سونا غائب کر کے آپ کے بیٹے کو رہا کر دیتے پھر آپ نے میرے غریب خانے تک آنے کی کیسے زحمت کی؟"

رب راکھن نے کہا۔ "یہ صرف سونے کی اسمگلنگ کا معاملہ نہیں ہے۔ ہمارے گھریلو جھگڑے ہیں۔ میری بیوی نے تقریباً اٹھائیس برس سے علیحدگی اختیار کی ہوئی ہے اور میرے بیٹے کو گمراہ کر دیا ہے۔ اسے غریبی اور محتاجی والی زندگی گزارنے کی تربیت دی ہے۔ میں یہاں اس لیے آیا ہوں کہ پہلے بیٹے کے تیور دیکھوں گا۔ اگر اسے عقل آ جائے گی کہ وہ جرائم سے بھرپور دنیا میں جی رہا ہے اور یہاں اس کی ماں کے جذباتی ایمانی طور طریقے اسے صرف ذلیل اور رسوا کرتے رہیں گے تو یہ میرے لیے خوش آئند بات ہو گی۔ دراصل میں اس کی ماں کو زیادہ سے زیادہ کمزور' بے اختیار اور بے بس بنانے آیا ہوں۔"

وہ پولیس اسٹیشن کے احاطے میں پہنچ گئے۔ گاڑی سے اترتے ہی انسپکٹر اور سپاہی وغیرہ انہیں سیلوٹ کرنے لگے۔ رب راکھن نے کہا۔ "آپ دفتر میں تشریف رکھیں۔ میں تنہائی میں بیٹے سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔"

ڈی آئی جی نے اپنے دفتر کی طرف جاتے ہوئے انسپکٹر سے کہا۔ "وڈے سائیں کو ان کے بیٹے کے پاس پہنچا دو۔"

رب راکھن انسپکٹر کی رہنمائی میں چلتا ہوا ایک حوالاتی کمرے کے سامنے آیا۔

آہنی سلاخوں کے پیچھے سچل زمین پر سو رہا تھا۔ انسپکٹر نے آواز دی۔ "سچل صاحب! اٹھ جائیں' آپ کے بابا سائیں ملنے آئے ہیں۔"

وہ خاموشی سے آنکھیں بند کیے پڑا رہا۔ انسپکٹر نے دوسری بار ذرا بلند آواز سے مخاطب کیا۔ سچل جیسے نیند میں کسمسایا پھر اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ باپ نے کہا۔ "میں آگیا ہوں' چلو اٹھو۔"

"آپ کیوں میری نیند خراب کرنے آئے ہیں۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ میں ماں جی کے پاس زمین پر بچپن سے گہری نیند سوتا آیا ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے دوسری طرف کروٹ بدل لی۔ باپ کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ سائیں نے انسپکٹر سے کہا۔ "تم جاؤ۔"

اس کے جانے کے بعد سائیں نے کہا۔ "منہ پھیرنے کا مطلب سمجھا دو۔ مجھ سے نفرت ہے یا محض ناراض ہو؟"

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا' پھر بولا۔ "کیا آپ میری ناراضی دور کریں گے؟"

"میں اسی لیے آیا ہوں۔"

"تو پھر آپ میری جگہ آ جائیں اور مجھے باہر جانے دیں کیونکہ اصلی مجرم آپ ہیں۔"

سائیں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "جرم کی بات نہ کرو۔ نہ کوئی اسمگلنگ ہوئی ہے نہ ہم میں سے کسی نے کوئی جرم کیا ہے۔ میں صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ اس طاقتور دنیا میں تمہاری ماں تمہیں کمزور بنا رہی ہے۔ اس نے تمہیں مجرموں کے اس کمرے میں پہنچا دیا۔ وہ لاکھ سر مارے مگر تمہیں یہاں سے نکال کر نہیں لے جا سکے گی۔ میں صرف ایک اشارہ کروں گا اور حوالات کا تالا کھل جائے گا۔"

"بابا سائیں! اگر ایمانداری کمزور ہوتی تو وہ اس دنیا سے کب کی فنا ہو چکی ہوتی۔ ایمان اس لیے دشوار لگتا ہے کہ بہتر عمل کا بہتر نتیجہ ذرا دیر سے ظاہر ہوتا ہے۔ آپ حوالات کا تالا کھلوانے کی زحمت نہ کریں۔ ماں جی کا حکم ہے کہ میں آپ کے ذرائع سے ملنے والی رہائی قبول نہ کروں۔"



"ہوں۔ میں یہی دیکھنے آیا تھا کہ تمہارے مزاج' خیالات اور نظریات میں تبدیلی آئی ہے یا نہیں مگر تم حوالات کے اندر بھی ماں کے گن گا رہے ہو۔"

"ابھی میں یہاں نظر آ رہا ہوں۔ بعد میں آپ نظر آئیں گے۔ میں تو خدا کے بعد ماں کے گن گاتا ہوں۔ آپ کی تو نہ ماں ہے' نہ خدا اور اگر خدا دیر سے یاد آئے گا تو آپ کی دعا بھی قبول نہیں ہو گی۔"

"فضول باتوں میں وقت ضائع کرنے سے بہتر ہے کہ میرے ارادوں کو سمجھ لو۔ تین برس پہلے جب تم نے ماں کے حکم کے مطابق مجھے بیس کروڑ کا نقصان پہنچایا اور اتنی بڑی رقم یہاں کے قومی خزانے میں واپس پہنچا دی تب ہی میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ تمہیں ماں کے سحر سے نکالوں گا۔"

"اور ماں کی ممتا سے نکالنے کے لیے آپ نے بیٹے کو اسمگلر بنا دیا۔"

"ابھی ایف آئی آر درج نہیں ہوئی ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ اس سے پہلے تم آزادی اور دولت مندوں کی معیاری زندگی گزارنے کے لیے میرے پاس چلے آؤ گے تو میں بیس کروڑ کے نقصان کو بھول جاؤں گا اور اگر ماں کی دی ہوئی بیمار زندگی کو قبول کرو گے تو پھر ایف آئی آر لکھی جائے گی اور تم سونے کے اسمگلر کی حیثیت سے ایک لمبی سزا پاؤ گے۔"

"کیا اس طرح آپ کو بیس کروڑ مل جائیں گے؟"

"صرف بیس کروڑ ہی نہیں' بیٹا بھی مل جائے گا۔ تم میرے ایک ہی بیٹے ہو۔ مگر بے شمار دولت اور جائیداد کے مالک بننے سے پہلے تم میری طرح بنو گے۔ نہیں بنو گے تو میری زندگی بھر کی کمائی جو ڈیڑھ ارب روپے تک پہنچنے والی ہے' اسے بھی تم قومی خزانے میں دے دو گے۔"

"یہ آپ نے کیسے سمجھ لیا کہ میں آپ کے نقشِ قدم پر چلنے لگوں گا؟"

"بچوں کو جیسی تعلیم دی جائے' اسی کے مطابق وہ اپنی زندگی بناتے ہیں۔ مجھ سے غلطی ہوئی کہ میں نے تمہیں ماں کے قریب زیادہ رہنے دیا۔ خیال تھا کہ میرا خون میرا ہی رنگ اختیار کرے گا لیکن بنیادی چیز ہے تربیت۔ یہ تربیت تم نے ماں کی گود میں' اسکول

اور کالج میں حاصل کر لی لیکن دنیا کی سب سے بڑی تربیت گاہ جیل ہے۔ یہ ایسی یونیورسٹی ہے جہاں ایک شریف آدمی داخل ہونے کے بعد پکا بدمعاش اور مجرم بن کر نکلتا ہے۔"

اس نے بیٹے کو گھور کر دیکھا پھر کہا۔ "میں ابھی یہ تالا کھلوا رہا ہوں۔ اگر تم پانچ منٹ کے اندر باہر نہیں آؤ گے تو یہاں سے جیل منتقل کر دیے جاؤ گے۔ میں جیل کی چاردیواری میں دنیا کے چھٹے ہوئے مجرموں کے ساتھ تمہیں رکھنے کے انتظامات کروں گا۔ وہاں تمہاری ایسی تربیت ہو گی کہ تم میری دولت اور جائیداد کے جائز وارث بن کر باہر آؤ گے۔"

سائیں نے پلٹ کر جاتے ہوئے کہا۔ "تالا کھلنے سے پہلے اچھی طرح سوچ لو۔ تالا بند ہونے کے بعد سوچنے کا وقت گزر چکا ہو گا۔"

وہ تیزی سے چلتا ہوا ڈی آئی جی کے دفتر میں آیا پھر بولا۔ "آپ انسپکٹر کو حکم دیں کے پانچ منٹ کے لیے لاک اپ کا تالا کھول دے۔ اگر وہ باہر نہیں آئے گا تو دوبارہ تالا لگا دے اور اس کے خلاف ایف آئی آر درج کرے۔"

بڑے افسر نے انسپکٹر کو بلا کر حکم دیا۔ انسپکٹر حکم کی تعمیل کے لیے چلا گیا۔ افسر نے کہا۔ "وڈے سائیں! ایف آئی آر درج کرنے سے یہ ظاہر کرنا ہو گا کہ سونا ہماری تحویل میں ہے۔ اگرچہ وہ تحویل میں ہے لیکن نیچے سے لے کر اوپر تک اس مال کی حصے داری ہو چکی ہے۔ اگر اوپر بڑوں تک ان کے حصے نہیں پہنچیں گے تو مجھے ڈانٹ پڑے گی کہ میں نے ایف آئی کیوں درج کرائی ہے۔"

سائیں نے کہا۔ "آپ فکر نہ کریں۔ وہ اَسّی لاکھ روپے کا سونا ہے۔ کل دن کے بارہ بجے تک آپ کے پاس نقد اسی لاکھ پہنچ جائیں گے آپ اپنے اوپر والوں کو خوش کر سکیں گے لیکن میں بیٹے کو اپنے رنگ میں ضرور رنگوں گا۔ وہ جیل جائے گا اور میری مرضی کے جیل خانے میں رہے گا۔"

بڑے افسر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں نے اپنی زندگی میں بے شمار وڈیرے دیکھے ہیں۔ تمام وڈیروں میں ایک بات مشترک ہے اور وہ یہ کہ آپ حضرات ضد کے بڑے پکے ہوتے ہیں۔ کوئی ناممکن فیصلہ کر کے بھی اس پر عمل کراتے ہیں۔"



"حتیٰ کہ ہم نیک نام ہو کر بدنامی کی بھی پرواہ نہیں کرتے۔ میرا بیٹا اسمگلنگ کے کیس میں جیل جائے گا تو میری بڑی بدنامی ہو گی لیکن عارضی بدنامی۔ جب وہ جیل سے میرے بنائے ہوئے سانچے میں ڈھل کر باہر آئے گا تو اس وقت تک حکومت بدل چکی ہو گی۔ میں اپنے بیٹے کی قید کو سیاسی رنگ دوں گا۔ تمام اخبارات میں یہی لکھا ہو گا کہ پچھلی حکومت نے سائیں رب راکھن سے سیاسی انتقام لینے کے لیے اس کے بیٹے کو اسمگلنگ کے جھوٹے مقدمے میں پھانس کر جیل بھیج دیا تھا۔"

افسر نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ہمارے ملک میں چہرے بدلنے اور سیاہ کو سفید بنانے کے لیے طرح طرح کی گنجائش نکل آتی ہے۔"

انسپکٹر نے آ کر کہا۔ "سر! میں نے تالا کھول کر حوالات کا دروازہ بھی کھول دیا تھا لیکن وڈے سائیں کے صاحب زادے حوالات سے باہر نہیں آئے' وہیں زمین پر لیٹے رہے میں نے مجبوراً پانچ منٹ کے بعد دروازہ لگا کر اسے لاک کر دیا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ اَسّی لاکھ روپے کی مالیت کے سونے کی اسمگلنگ کے سلسلے میں سچل نواز کے خلاف ایف آئی آر درج کرو۔"

"آل رائٹ سر! ابھی ایک اخبار کے دفتر سے فون آیا تھا۔ ایڈیٹر کہہ رہا تھا کہ مائی سہاگی بہت بڑا جلوس لے کر وہاں گئی تھی۔ وہ اپنے بیٹے کی گرفتاری کے خلاف بیان شائع کرانا چاہتی ہے۔"

"میرے پاس محلے والوں کی چشم دید گواہی کے دستخط موجود ہیں۔ وہ مال کے ساتھ پکڑا گیا ہے۔ تم فکر نہ کرو۔ اسے کل تک جیل بھجوانے کے انتظامات کرو تاکہ یہاں اخبارات کے رپورٹروں کی بھیڑ نہ لگے۔ انہیں سچل کا کوئی بیان لینا ہو گا تو وہ جیل یا عدالت میں اس کا بیان لیں گے۔ یہ مصیبت ہمارے سروں سے ٹال دو۔"

انسپکٹر چلا گیا۔ افسر نے سائیں رب راکھن سے پوچھا۔ "کیا مائی سہاگی کے پاس کوئی ایسا مضبوط ذریعہ ہے یا کوئی ایسی معروف اور مضبوط سیاسی شخصیت ہے جو سچل کو ضمانت پر رہا کرا سکے؟"

"بے چاری گانے والی کے پاس کھوکھلی شہرت کے سوا اور کیا ہے؟ ہو سکتا ہے وہ

کسی اثر ورسوخ والے کے ذریعے بیٹے کو ضمانت پر رہا کرانا چاہا ہے مگر یہ ہمارے منصوبے کے خلاف ہوگا۔ سچل کے جیل میں جانے کے بعد میں اس وقت تک اسے باہر نہیں آنے دوں گا جب تک وہ جیل یونیورسٹی میں اے گریڈ حاصل نہیں کرے گا۔"

اس نے اٹھ کر بڑے افسر سے الوداعی مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "کل دن کو بارہ بجے کے بعد میں نقد رقم لے کر آؤں گا۔ خدا حافظ۔"

وہ دفتر سے باہر آیا پھر اس کاریڈور کی طرف دیکھا جس کے آخری سرے پر حوالات کے چھوٹے بڑے کمرے بنے ہوئے تھے۔ وہ کاریڈور سے گزرتا ہوا اس کمرے کے سامنے پہنچا جس کی آہنی سلاخوں کے پیچھے سچل زمین پر سو رہا تھا۔ اس نے آواز دی لیکن سچل نے آنکھیں نہیں کھولیں' وہ بولا۔ "اتنا تو جانتا ہوں کہ تم کچی نیند سوتے ہو' ہلکی سی آہٹ پر بیدار ہو جاتے ہو۔ ابھی تم آنکھیں کھول کر باپ کی صورت نہیں دیکھنا چاہتے۔"

وہ آنکھیں بند کیے پڑا رہا۔ اس نے کہا۔ "یہ تم نے اچھا کیا کہ پانچ منٹ کی مہلت ملنے کے باوجود باہر نہیں آئے۔ اب تمہارے خلاف ایف آئی آر لکھی جا رہی ہے۔ ایسے وقت تمہیں یہ باپ بہت ہی ظالم اور مخبوط الحواس لگ رہا ہوگا۔

"تم مجھے مخبوط الحواس تو کہہ سکتے ہو مگر ظالم نہیں کہہ سکتے کیونکہ میں اپنا بیٹا' اپنا حق چاہتا ہوں اور اپنا حق مانگنے والا مظلوم ہوتا ہے' ظالم نہیں۔ جب سے یہ دنیا آباد ہوئی ہے تب سے اولاد اپنے باپ کے نام سے پہچانی جاتی رہی ہے۔ انسانی نسلیں تاقیامت باپ کے حوالے سے اپنا شجرہ پیش کرتی رہیں گی۔

"ایک بیٹے کے لیے اس کی ماں کی حیا اور شرافت کا ضامن اس کا باپ ہوتا ہے۔ وہ باپ کی ایک تصدیقی مہر ہوتا ہے کہ ایک عورت نے اس کی ہی زوجیت میں رہ کر اس کی اولاد پیدا کی ہے۔ اگر باپ کا مستند نام نہ ہو تو اولاد صرف چور دروازوں سے آتی ہے۔

"مجھ جیسے لوگ ساری زندگی چور دروازوں سے دولت اور حکمرانی حاصل کریں گے لیکن چور دروازے کی اولاد قبول نہیں کریں گے۔ تم چوری سے نہیں آئے ہو۔ تم میرا فخر ہو' میرا غرور ہو۔ ساری عمر کمانے کے بعد بھی جو دولت نہیں ملتی' وہ دولت اولاد



ہے۔ اگر تم میرے نقش قدم پر نہیں چلو گے تو میری بے حساب دولت تمہاری نالائقی کے باعث قومی خزانے میں چلی جائے گی۔

"ہر باپ چاہتا ہے کہ اس کا اکلوتا بیٹا نالائق نہ رہے۔ دنیاوی حالات کے مطابق اپنے باپ کی طرح دولت اور اثر ورسوخ بڑھاتا رہے۔ اس کے لیے لازمی ہے کہ میں تمہیں زیادہ سے زیادہ اعلیٰ تعلیم دلاؤں اور زیادہ سے زیادہ اعلیٰ تعلیم صرف جیل کی درسگاہ میں ہی حاصل ہوتی ہے۔"

وہ بیٹے کی طرف سے منہ پھیر کر بولا۔ "میں جا رہا ہوں۔ میرے جانے کے بعد آنکھیں کھول کر میری باتوں پر غور کرو گے تو یہ تسلیم کرو گے کہ باپ ظالم نہیں ہوتا۔ وہ اپنے بچوں کا باوقار خوش حال مستقبل بنانے کے لیے الٹے سیدھے طریقے اختیار کرتا رہتا ہے تو مخبوط الحواس کہلاتا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ تیزی سے چلتا ہوا کاریڈور سے گزرتا ہوا پولیس اسٹیشن کے باہر آ کر اپنی لینڈ کروزر میں بیٹھ گیا۔ اسکولوں اور کالجوں میں طلبہ و طالبات کو بڑی مشکلوں سے داخلے ملتے ہیں۔ سائیں مطمئن تھا۔ اس نے بیٹے کو سب سے بدنام مگر زیر زمین دنیا کی جدید ترین درس گاہ میں داخل کرا دیا تھا۔

★============★============★

باپ مخبوط الحواس ہوتے ہیں۔ ایک رکشا یا ٹیکسی چلانے والا اپنے بچوں کا مستقبل خوشحال بنانے کے بارے میں سوچتا رہتا ہے اور ڈرائیو کرتا رہتا ہے ایسے وقت وہ اپنے حواس میں نہیں رہتا اس لیے کسی حادثے کا شکار ہو جاتا ہے۔

ایک ٹھیلے والا تمام دن گلا پھاڑ پھاڑ کر چیختا ہے۔ گاہکوں کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے تاکہ مال زیادہ فروخت ہو۔ رقم کچھ زیادہ آئے تو بچت کرتے ہوئے جلد سے جلد جوان بیٹی کی شادی کرے لیکن تجاوزات ہٹانے والا پولیس کا عملہ اس کا پورا ٹھیلا سامان سمیت ٹرک میں ڈال کر لے جاتا ہے۔ اگر وہ ایسی کسی کارروائی سے بچ نکلے تو پولیس والے بھتے کی صورت میں وہ رقم لے جاتے ہیں جو بیٹی کے جہیز کے لیے بچائی جا سکتی تھی۔

آج کا غریب اور متوسط طبقہ اپنی حیثیت اور آمدنی سے زیادہ حاصل کرنے کی

سوچ اور ایمانداری سے حاصل کرنے کی سوچ تو پھر سمجھ لیا جائے کہ وہ اپنے حواس میں نہیں ہے۔ امیر طبقے میں خدا سے ڈرنے والوں اور رزق حلال کمانے والوں کی تعداد خاصی ہے لیکن یہ طبقہ اس لیے بدنام ہے کہ اس میں سائیں رب راکھن اور پیر عظمت اللہ شاہ سلطانی جیسے مخبوط الحواس باپ ہوا کرتے ہیں۔

انہوں نے حقے کا کش لگایا۔ حقہ گُڑگُڑایا یا گڑگڑایا کہ جو شاخ نازک پر آشیانہ بنے گا' ناپائیدار ہو گا لیکن اچھی باتیں سننے کے لیے ہوتی ہیں' عمل کرنے کے لیے نہیں ہوتیں۔ ان کے سامنے صوفے پر ہاجرہ بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے کہا۔ "ابا حضور! میں صداقت کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ ایک بیوی کی حیثیت سے ان پر فخر بھی کرتی ہوں۔ وہ نرم شاخ کی طرح نہ باد مخالف کے زور سے جھکنا جانتے ہیں اور نہ خشک ٹہنی کی طرح ٹوٹ کر گرتے ہیں۔ وہ قانون کے تناور درخت ہیں۔ نہ جھکیں گے' نہ گریں گے۔"

"تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ وہ تمہیں اغوا کرنے والے سے واپس حاصل کرنے کے لیے ڈائریکٹر جنرل کا عہدہ چھوڑ کر لندن نہیں جائے گا؟"

"وہ میرے لیے بڑی بڑی قربانیاں دے سکتے ہیں لیکن وہ بڑی بڑی چالیں بھی چلتے ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ صبح تک میرا سراغ لگا لیں گے اور یہاں پہنچ جائیں گے۔"

"بیٹی! وہ کوئی جادوگر نہیں ہے اور نہ کوئی ایسا غیر معمولی علم جانتا ہے۔ اگر وہ جانتا بھی ہوتا تو یہ بات عقل سوچ بھی نہیں سکتی کہ باپ نے بیٹی کے اغوا کا ڈراما رچایا ہے۔ تم اغوا نہیں کی گئی ہو بلکہ اپنے ہی باپ کی ایک دوسری کوٹھی میں آرام سے ہو۔"

"ابا حضور! آپ کے سامنے مثالیں موجود ہیں۔ جہاں تک آپ سوچتے ہیں وہاں سے آگے صداقت پہنچ جاتے ہیں۔ کیا آپ نے سوچا تھا کہ ہوبہو اصل نظر آنے والی فائلیں اس شعبے کے ماہر نقال تیار کریں گے۔ کیا آپ کبھی سوچ سکتے تھے کہ صداقت آپ کو فریب دینے کے لیے ہمدانی کی فائل اسلام آباد والے بنگلے میں لا کر رکھیں گے۔"

"اس میں شبہ نہیں کہ ہمارا داماد بے مثال ہے۔ ہماری حکمت عملی کا پہلے سے تجزیہ کر لیتا ہے۔ ہم تمہاری خاطر اسے بہت بڑا نقصان نہیں پہنچا سکتے اس لیے چاہتے ہیں کہ وہ ہمارے راستے کا پتھر بننے کے لیے اس ملک میں نہ رہے۔ لندن واپس چلا جائے۔"



"آپ نے برسوں پہلے بھی صداقت کو دور کرنے کے لیے لندن کے سفارت خانے میں ان کا ٹرانسفر کرایا تھا۔ کیا آپ یہ سوچ سکتے تھے کہ وہ اسکاٹ لینڈ یارڈ پہنچ جائیں گے۔ پہلے محض پتھر تھے وہ پہاڑ بن کر آ جائیں گے۔"

"اس بار ایسا نہیں ہو گا۔ پہلے وہ چار ماہ کی بیٹی کو لے کر گیا تھا۔ اس بار بیٹی جوان ہے اور دونوں باپ بیٹی کے جاتے ہی میں تمہیں بھی لندن بھیج دوں گا۔ وہ جب بیوی اور بیٹی کے ساتھ وہاں ایک اچھی گھریلو زندگی گزارے گا تو پھر ادھر کا رخ نہیں کرے گا۔"

"ابا حضور! میں کبھی آپ سے زیادہ عرصے تک دور نہیں رہتی لیکن آپ کے راستے سے صداقت کو ہٹانے کے لیے مجھے یہ جدائی برداشت کرنی پڑے گی۔"

"ہاجرہ! تم میری بیٹی نہیں بیٹا ہو۔ میرے دونوں بیٹے بھی اتنا بڑا پہاڑ نہیں ہٹا سکتے جیسے تم ہٹا رہی ہو۔ میں وعدہ کرتا ہوں' مہینے میں ایک بار تم سے ملنے آیا کروں گا۔"

"میں جانتی ہوں' آپ میرے بغیر نہیں رہ سکیں گے مگر ایک بات پوچھتی ہوں' کیا آپ میرے بھائیوں کو معاف نہیں کر سکتے؟ کیا انہیں کسی طرح اپنے دو مضبوط بازو نہیں بنا سکتے؟"

"بیٹے' اپنے باپ کا سرمایہ ہوتے ہیں۔ میں کبھی اپنا سرمایہ ڈوبنے نہیں دیتا۔ وہ اپنی دانست میں مجھے چھوڑ کر گئے ہیں جبکہ میں نے انہیں ٹھوکریں کھانے کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ کیا تم جانتی ہو کہ عقل کس سے سیکھی جاتی ہے؟"

"دانش مندوں سے۔"

"نہیں' دشمنوں سے۔ میری بڑی بہو سمجھتی ہے کہ اس نے بڑی رازداری سے دوسری ایجنسی کے گاڈ فادر کو اپنا فادر بنا لیا ہے۔ اس فادر نے اسے بیٹی بنا کر میری کمر توڑنے کے لیے دونوں بیٹوں اور جوان پوتے کو بھی مجھ سے متنفر کر دیا ہے۔ یہ نفرت' یہ دوری عارضی ہے۔ وہ دشمن کا گاڈ فادر جو چالیں چلے گا اور ان کے جو نتائج میرے بیٹوں کے سامنے آئیں گے تو پھر عقل بھی آئے گی۔ سر پر آسمان گرے تو خدا یاد آتا ہے اور اپنی بنائی ہوئی چھت گرے تو بیٹوں کو باپ کے قدموں میں ہی جگہ ملتی ہے۔"

انہوں نے ریسیور اٹھا کر اپنے ایک خاص ماتحت کے نمبر ڈائل کیے پھر رابطہ قائم

ہونے پر کہا۔ "ہیلو! ہم بول رہے ہیں۔"

"جی جناب عالی! آپ کے بڑے صاحب زادے کی کیمیکل فیکٹری پر چھاپہ پڑ گیا ہے۔ میں نے سوچا' آپ کے خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوگا تو آپ کو تفصیلی رپورٹ دوں گا۔"

"کیا صاحب زادے کو پولیس ریڈ کی اطلاع مل گئی ہے؟"

"جی ہاں۔ اب صاحب زادے آئیں گے اور اپنے بچاؤ کی تدبیر کریں گے۔ جو آپ چاہتے ہیں وہی ہوگا۔ وہ گاڈ فادر صاحب زادے کو بچانے کی بھرپور کوشش کرے گا۔"

"ٹھیک ہے۔ اب میں اپنی کوٹھی جا رہا ہوں۔ کوشش کرو کہ اس کی ضمانت نہ ہو سکے۔ اگر تم اس گاڈ فادر کی کسی چال کا توڑ نہ کر سکو تو مجھے فوراً اطلاع دینا۔"

انہوں نے فون بند کر دیا پھر حقہ بردار ملازموں کو بلا کر کہا۔ "سامان لے چلو' ہم جا رہے ہیں۔"

دونوں ملازم حقہ اور چاندی کے تھال وغیرہ اٹھا کر لے جانے لگے۔ ان کے جانے کے بعد وہ بیٹی کے ساتھ چلتے ہوئے کوٹھی کے دروازے تک آئے پھر پوچھا۔ "کیا یہاں ایک ملازمہ سے تمہارا کام چل جاتا ہے؟"

"جی ہاں۔ وہ ہماری پرانی رازدار ہے۔ میں اس کے سوا اور کسی کو خدمت کے لیے رکھنا نہیں چاہتی۔ صداقت سے ایسا اندیشہ ہے کہ میں دن کو یہاں دروازے تک بھی نہیں آتی نہ کسی کھڑکی سے جھانکتی ہوں۔"

"شاباش! اسی طرح محتاط رہو۔ صرف کل شام تک کی بات ہے۔ صداقت تمہاری تلاش میں ناکام ہو کر یہ ملک چھوڑ دے گا۔"

انہوں نے بیٹی کی پیشانی کو بوسہ دیا پھر وہاں سے چلے گئے۔ انہوں نے بیٹی کی حفاظت کے لیے کسی مسلح گارڈ کو نہیں رکھا تھا۔ اگر رکھتے تو صداقت کو شبہ ہوتا اور وہ سوچتا کہ ان کی دوسری کوٹھی میں ایسی کون سی ہستی ہے جس کی حفاظت کے لیے محافظ کی ڈیوٹی لگائی گئی ہے۔ اس دانش مندی کے باعث صداقت ہاجرہ کو تلاش کرنے میں ناکام



رہا تھا۔ وہ تو کیا' دنیا کا کوئی جاسوس یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اغوا کی جانے والی بیٹی اپنے باپ کی ہی کسی دوسری کوٹھی میں ہوگی۔

لیکن اُس روز صداقت علی نے اتنی ٹھوس منصوبہ بندی سے اپنے سسر کا تعاقب کیا تھا کہ ہر موڑ پر تعاقب کرنے والی گاڑیاں تبدیل ہوتی رہی تھیں۔ یوں پتہ چلا کہ وہ ہاکس بے کے کاٹیج میں گئے ہیں۔ اس کاٹیج کے سامنے اور تین کاریں موجود تھیں جن سے اندازہ ہوا کہ پیر شاہ سلطانی صاحب قرض نادہندگان سے معاملات طے کر رہے ہیں۔

صداقت علی کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ اس کی شریک حیات ہاجرہ اپنے باپ کی کسی دوسری کوٹھی میں ہوگی۔ اس نے ہاجرہ کو تلاش کرنے کے لیے سراغرسانوں کو شہر کے مختلف حصوں میں پھیلا دیا تھا اور اپنے سسر کی نگرانی کے لیے ہاکس بے میں بھی ایک جاسوس کی ڈیوٹی لگا دی۔

پھر فون کے ذریعے ہاجرہ سے کہا تھا کہ وہ آس پاس کی کسی مسجد سے ہونے والی اذان سنائے اور اس نے اذان سنائی تھی۔ صداقت کے خاص آدمیوں نے ڈیفنس اور سوسائٹی کے علاقوں میں جا کر کئی مساجد کے مؤذنوں کو وہ ٹیپ کی ہوئی اذان کی آواز سنائی۔ سب نے یہ کہہ کر مایوس کیا کہ یہ ان کی آواز نہیں ہے۔ ایک مؤذن نے وہ اذان سنی پھر کہا۔ "آپ اسے ریوائنڈ کر کے دوبارہ سنائیں۔"

جاسوس نے کیسٹ کو ریوائنڈ کر کے دوبارہ سنایا۔ مؤذن نے کہا۔ "جناب! یہ کسی مسجد کے مؤذن کی آواز نہیں ہے۔ یہ وہ آواز ہے جو مغرب کے وقت ریڈیو سے نشر کی جاتی ہے۔"

یہ ایک چونکا دینے والی بات تھی۔ جاسوس نے ریڈیو اسٹیشن پہنچ کر تصدیق کرائی پھر صداقت کو فون پر بتایا۔ "سر! آپ کی وائف نے کسی مسجد کے مؤذن کی آواز نہیں بلکہ ریڈیو سے نشر ہونے والی آواز سنائی ہے۔ میں ریڈیو اسٹیشن سے تصدیق کر چکا ہوں۔"

تب پہلی بار صداقت کو شبہ ہوا۔ اس نے سوچا' وفادار بیوی صرف اپنے باپ کے معاملات میں جھوٹ بولتی ہے۔ اس نے اذان کے سلسلے میں بھٹکانے کی کوشش کی ہے۔

اس کا مطلب ہے' وہ جہاں بھی ہے وہاں صداقت کو پہنچانا نہیں چاہتی اور اگر پہنچانا نہیں چاہتی ہے تو پھر یہ چاہتی ہے کہ باپ اپنی گونگی بیٹی کے ساتھ لندن چلا جائے۔

ہاجرہ نے آخری بار فون پر کہا تھا کہ صداقت لاکھ کوششیں کرے وہ صبح تک وہاں نہیں پہنچ سکے گا جہاں اسے قید کر کے رکھا گیا ہے لہٰذا وہ اپنی شریک حیات کی رہائی کے لیے ملک چھوڑ دے۔

اب بات سمجھ میں آرہی تھی کہ ملک چھوڑ کر چلے جانے سے اس کے ابا حضور کو فائدہ حاصل ہوگا۔ وہ قرض نادہندگان سے لی ہوئی بھاری رقم قومی خزانے میں جمع نہیں کرے گا۔ صداقت کے ملک چھوڑتے ہی پھر اپنے وسیع ذرائع سے اصلی فائلوں کو حاصل کر لے گا۔

جو جاسوس ہاکس بے میں ڈیوٹی پر تھا اس نے پیر شاہ سلطانی اور تین افراد کو اس کاٹیج سے واپس جاتے دیکھا پھر ان کا تعاقب کرتا رہا۔ واپسی میں پیر شاہ سلطانی اپنی سوسائٹی والی ایک کوٹھی میں گئے تھے۔ جاسوس نے صداقت کو یہ رپورٹ دی۔

صداقت نے کہا۔ ”معلوم کرو کہ اس کوٹھی میں اور کتنے افراد ہیں۔“

”سر! ویسے تو کوٹھی خالی لگتی ہے لیکن اندر کے کمروں میں روشنی تھی۔ مجھے ایک بند کھڑکی کے شیشوں پر ایک عورت کا سایہ اس وقت نظر آیا جب وہ کھڑکی کے پردے درست کر رہی تھی۔“

”ٹھیک ہے۔ تمہاری ڈیوٹی ختم ہو چکی ہے۔ آرام کرو۔“

آدھی رات تک ہاجرہ کو نیند نہیں آئی۔ وہ پریشان تھی۔ باپ کی محبت میں بہت کچھ کرنے کے باوجود شرمندہ سی رہتی تھی کہ شوہر کو دھوکا دے رہی ہے پھر یہ سوچ کر خود کو تسلیاں دیتی تھی کہ وہ اپنے شوہر کو اپنے باپ کی انتقامی کارروائیوں سے محفوظ رکھتی ہے۔ اگر کوئی دوسرا ڈائریکٹر جنرل ہوتا تو ابا حضور کا کوئی بھی قاتل اسے گولی مار دیتا یا ملک چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور کر دیتا۔

وہ ایک سعادت مند بیٹی بھی تھی اور وفادار بیوی بھی تھی۔ ضمیر کی عدالت میں باپ اور شوہر دونوں کی بہتری کے لیے فیصلے کرتی تھی۔ وہ بڑی دیر کروٹیں بدلتے رہنے



کے بعد سو گئی۔

سونے کے بعد وقت گزرنے کا پتہ نہیں چلتا۔ وہ صبح اذان کے وقت بیدار ہوتی تھی۔ اس رات بھی اذان کی آواز پر آنکھ کھل گئی۔ نیند پوری نہیں ہوئی تھی۔ اس نے بیڈ لیمپ روشن کر کے گھڑی دیکھی پھر حیران رہ گئی۔ رات کے تین بجے تھے۔ تین بجے کوئی اذان نہیں ہوتی مگر وہ صاف طور سے سن رہی تھی۔ اس نے بستر سے اٹھتے ہوئے ملازمہ کو آواز دی۔ ”صدیقہ.........“

ملازمہ جس کمرے میں سوتی تھی اس کا دروازہ پیٹنے کی آواز آرہی تھی۔ ہاجرہ تیزی سے چلتی ہوئی وہاں پہنچی۔ ملازمہ دروازہ پیٹ کر پوچھ رہی تھی۔ ”یہ کس نے باہر سے بند کیا؟ دروازہ کھولو۔“

دروازہ نہیں کھل سکتا تھا۔ ہاجرہ نے دیکھا۔ باہر سے تالا لگا ہوا تھا۔ وہ تالے کو جھٹکے دیتے ہوئے بولی۔ ”یہ تالا کس نے لگایا ہے؟“

وہ اندر سے بولی۔ ”میں کیا جانوں بی بی جی! میں تو سو رہی تھی۔ اذان کی آواز سن کر آنکھ کھلی۔ باہر گھڑی دیکھنے کے لیے نکلنا چاہا تو یہ دروازہ باہر سے بند تھا۔“

اذان کے ذکر پر ہاجرہ چونک گئی کیونکہ تھوڑی دیر پہلے وہ آواز بند ہو گئی تھی۔ اب پھر سے وہی اذان شروع ہو گئی تھی۔ ہاجرہ کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ آواز ڈرائنگ روم سے آرہی تھی۔ وہ آواز اسی اذان کی تھی جو ریڈیو سے نشر ہوئی تھی اور اس نے اپنے شوہر کو صحیح جگہ سے بھٹکانے کے لیے فون کے ذریعے سنائی تھی۔

اس نے تیزی سے دھڑکتے ہوئے دل پر ہاتھ رکھ لیا۔ بہت آہستہ سہم سہم کر چلتی ہوئی ڈرائنگ روم کے دروازے پر آئی۔ جس صوفے کی پشت دروازے کی طرف تھی اس پر وہ بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی صورت نظر نہیں آرہی تھی۔ صرف دونوں پاؤں سینٹر ٹیبل پر پھیلے ہوئے تھے۔ اس نے کالے رنگ کے جوتے پہنے ہوئے تھے۔

وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ ”آ.......... آپ.......... آپ ہیں...“

اس نے کہا۔ ”واقعی تم میری شریک حیات ہو۔ بیوی وہی ہوتی ہے جو جوتوں سے اپنے مرد کو پہچان لیتی ہے۔ اس سے سامنا ضروری نہیں ہوتا۔“

وہ دونوں ہاتھوں سے چہرے کو ڈھانپ کر رونے لگی۔ رات کے سناٹے میں اس کی سسکیاں ابھر رہی تھیں۔ صداقت علی نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا۔ "میں نے وعدہ کیا تھا، صبح سے پہلے تمہیں ڈھونڈ نکالوں گا۔ میری کامیابی اس لیے رلا رہی ہے کہ ابا حضور کے سارے منصوبے خاک میں مل چکے ہیں۔"

وہ انکار میں سر ہلا کر بولی۔ "نہیں، مجھے ناکامی سے، آپ کی کامیابی سے کچھ نہیں لینا ہے۔ میں کیسے یقین دلاؤں کہ یہاں آپ کی جان کو خطرہ ہے۔ اگر آپ ان کے داماد نہ ہوتے تو.........."

صداقت نے کہا۔ "بس کرو۔ تم یہ ڈائیلاگ پہلے بھی بول چکی ہو اور میں جواب میں کہہ چکا ہوں کہ جو فرض شناس ہوتے ہیں وہ موت سے بے نیاز ہو کر پولیس اور انٹیلی جنس کے شعبے میں داخل ہوتے ہیں۔"

"آپ موت سے نہیں ڈرتے مگر میں ڈرتی ہوں۔ کیا بیوہ ہو جاؤں، کیا جوان بیٹی کو یتیم بنا دوں؟"

"ایسے سوالات اپنے باپ سے کرو۔ فی الحال باہر گاڑی کھڑی ہے۔ اپنا ضروری سامان لو اور چلو۔"

"ضرور چلوں گی لیکن ابا حضور کو فون پر بتا دوں کہ ان کا یہ کھیل ختم ہو چکا ہے اور میں آپ کے ساتھ جا رہی ہوں۔"

"میں نے فون کا پلگ نکال دیا ہے اور تمہارے موبائل فون کی بیٹری بھی نکال دی ہے۔"

"آپ نے ایسا کیوں کیا؟ ابا حضور کو یہ بتانے میں کیا حرج ہے کہ میں بخیریت ہوں اور آپ کے ساتھ جا رہی ہوں۔"

"کیا تم مجھے اپنی خیریت بتایا کرتی تھیں، کیا مجھ سے پوچھ کر یہاں روپوش ہوئی تھیں؟ اگر باپ اپنی بیٹی کو اغوا کر سکتا ہے تو کیا شوہر اپنی بیوی کو اغوا نہیں کر سکتا؟"

"اس میں اغوا کی کیا بات ہے۔ میں اپنی مرضی سے باپ کے ساتھ آئی تھی اب اپنی مرضی سے آپ کے ساتھ جا رہی ہوں۔"



"تم اپنی مرضی سے نہ جاؤ۔ میں زبردستی اٹھا کر لے جاؤں گا کیونکہ میں تمہیں اغوا رنے آیا ہوں اور تمہارے باپ کو یہ نہیں معلوم ہو گا کہ میں نے تمہیں اغوا کیا ہے۔ ں طرح اس نے مجھے دھوکا دیا ہے اسی طرح اب میں اسے دھوکے میں رکھوں گا۔"

"آپ ایسا نہ کریں۔ ابا حضور پریشان ہو جائیں گے کہ پتہ نہیں مجھے یہاں سے ں دشمن نے اغوا کیا ہے؟"

"میں بھی کئی دنوں سے پریشان رہا کہ پتہ نہیں تم کس کے چنگل میں پھنس گئی ہو گر تم نے میری پریشانی دور نہیں کی۔ تم باپ کی مرضی کے مطابق مجھے یہ ملک چھوڑنے پر بور کر رہی تھیں۔ جواب دو ایسا کیوں کر رہی تھیں؟"

"میں ابا حضور کو بے یار و مددگار اور ناکام و نامراد نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ جوان ٹوں اور پوتے نے اس بڑھاپے میں انہیں تنہا چھوڑ دیا ہے۔ آپ کی کارروائی اتنی ہت ہوتی ہے کہ وہ جواباً آپ کے خلاف تنہا کچھ نہیں کر سکتے۔ وہ جو چال چلتے ہیں پ اس کا توڑ پہلے سے کر لیتے ہیں۔"

"اس لیے تم باپ سے مل کر مجھے جلا وطنی کی سزا دے رہی تھیں۔ باپ کی طرح بھی یہی چاہتی تھیں کہ میں پاکستان میں رہ کر اپنے فرائض کے مطابق قانونی تقاضے رے نہ کروں۔"

"آپ صرف ابا حضور کے پیچھے کیوں پڑے رہتے ہیں۔ پاکستان میں سینکڑوں طرناک مجرم ہیں۔ آپ انہیں گرفتار کریں۔ انہیں سزا دلائیں۔"

"اور تمہارے ابا حضور کو جرائم کی گند پھیلانے کے لیے چھوڑ دوں؟"

میرا مطلب ہے، آپ کے شعبے کا کوئی دوسرا افسر ابا حضور کا محاسبہ کرے گا تو اس ح سسر اور داماد کے درمیان کشیدگی ختم ہو جائے گی۔ میں آپ دونوں کے درمیان ا رہی ہوں۔ آپ لوگ مجھے خدا کے لیے زندہ رہنے دیں۔"

"ہم انسانی رشتوں کے درمیان پستے رہتے ہیں۔ تمہارے دونوں بھائی اپنی بیویوں اپنے باپ کے درمیان ڈولتے رہے۔ آخر بیویوں کے حق میں فیصلہ کر لیا۔ تم آج تک ہر اور اپنے باپ کے درمیان ڈول رہی ہو۔ جو لڑکیاں شادی کے بعد میکے اور سسرال

کے درمیان اپنائیت اور محبت کا توازن برقرار نہیں رکھ سکتیں وہ ہمیشہ تھالی کے بینگن کی طرح اِدھر اُدھر لڑھکتی رہتی ہیں۔"

"کیا میں ابا حضور کو ایک بیٹی کی اور آپ کو ایک بیوی کی بھرپور محبت نہیں دیتی ہوں۔ کیا انصاف سے دونوں کو محبتیں دینے کا نتیجہ یہی نکلتا رہے گا کہ میں ہمیشہ کرب میں مبتلا رہوں گی۔"

"اصل مسئلہ یہ ہے کہ تم انصاف کو سمجھنا نہیں چاہتی ہو' انصاف منفی ہو گا تو تم جرائم کے گاڈ فادر کو بیٹی کی محبت دیتی رہو گی۔ میرے لیے صرف ایک محبت کرنے والی بیوی رہو گی لیکن اپنے ملک کے لیے ایک فرض شناس پاکستانی کبھی نہیں بن سکو گی۔ جس دن اپنے شوہر کی طرح فرض شناس بن جاؤ گی' اس روز سے اپنے باپ کو صراط مستقیم پر لانے کی کوشش کرو گی اور پچھلے تمام جرائم کے حساب میں خود اپنے باپ کو ہتھکڑی پہناؤ گی۔"

"میں اول اور آخر اپنے باپ کی بیٹی ہوں۔ لہو کے رشتے کا تقاضا ہے کہ میں آپ کو کبھی ہتھکڑی پہنانے کا موقع نہ دوں اور میں تہذیب اور گہری محبت کے رشتے سے آپ کی شریک حیات ہوں۔ ابا حضور کو کبھی موقع نہیں دوں گی کہ وہ آپ کو کسی بھی بہانے سے نقصان پہنچائیں۔"

"یہ تمہارے اپنے سوچنے اور عمل کرنے کا انداز ہے لیکن بیٹی جس طرح باپ کا حکم مانتی ہے اسی طرح شوہر کا بھی حکم ماننا چاہیے۔"

"میں نے آپ کا کوئی حکم ماننے سے کبھی انکار نہیں کیا۔"

"تو پھر جس طرح تم نے باپ کے حکم سے اب تک اپنی روپوشی مجھ سے چھپائی اسی طرح میرے حکم سے آئندہ باپ کے لیے اغوا شدہ رہو گی اور کسی بہانے یہ نہیں بتاؤ گی کہ میرے سائے میں بخیریت ہو۔"

وہ سر جھکا کر وہاں سے اپنی خواب گاہ میں گئی پھر ایک چھوٹی سی اٹیچی میں اپنا ضروری سامان لے آئی۔ اغوا یوں بھی ہوا جاتا ہے۔ پہلے اس نے باپ کے حق میں شوہر کو تاریکی میں رکھا۔ اب شوہر کی خاطر باپ کے لیے کانٹوں کا بستر بچھا کر جا رہی تھی۔ بڑی



مجبور تھی۔ انکار کرتی تو شوہر اٹھا کر لے جاتا اور شوہر پیار سے لے جائے یا جبراً کاندھے پر لاد کر لے جائے تو اس پر کبھی اغوا کا الزام نہیں آتا۔

★===========★===========★

بیگم ریحانہ برکت ایک آرام دہ کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے آس پاس کی کرسیوں پر بیگم سلمیٰ رحمت اور رحمت شاہ سلطان بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے سامنے میز پر کھانا سجا ہوا تھا۔ ان کے سامنے ایک دیوار پر بہت بڑا مستطیل شیشہ لگا ہوا تھا۔ اس دھندلے شیشے کے پار ایک دھندلا سا شخص کرسی پر بیٹھا ہوا نظر آ رہا تھا۔ نظر آنے کے باوجود پہچانا نہیں جا سکتا تھا۔ وہ ایک مٹا مٹا سا انسانی خاکہ تھا۔ ہو سکتا تھا کہ وہ انسانی خاکہ زندہ نہ ہو' وہاں ایک مجسمہ رکھ دیا گیا ہو۔

مجسمہ زندہ ہو یا مُردہ' مگر وہ بول رہا تھا۔ کھوکھلے مجسمے کے اندر اسپیکر لگا دیا جائے تو وہ بھی بولتا ہوا سا لگتا ہے۔

وہ بول رہا تھا۔ "ریحانہ! ہم نے تمہیں بیٹی بنایا ہے۔ تم پہلے بڑی رازداری سے یہاں ملاقات کرنے آئی تھیں۔ آج رشتے داروں کے ساتھ آئی ہو۔ اس کا مطلب ہے کہ تم نے اپنے سسر سے کھلی جنگ شروع کر دی ہے۔"

وہ بولی۔ "میں بہو کی حیثیت سے اپنے سسر کی دشمنی میں چھپ کر آتی تھی لیکن وہ سسر تو اپنے بیٹے سے کھلی دشمنی کر رہا ہے۔ اس نے اپنے ہی بیٹے کی دوا ساز کمپنی میں پولیس ریڈ کرایا ہے۔ میں نے ایسا باپ نہیں دیکھا جسے خود اپنی عزت کا خیال نہ ہو۔ اس بڈھے کی عقل میں اتنی سی بات نہیں آئی کہ بیٹا تھانے میں' حوالات میں جائے گا تو پیر عظمت اللہ شاہ سلطانی کہلانے والے عزت دار کی عزت خاک میں مل جائے گی۔"

دھندلے شیشے کے پیچھے سے آواز آئی۔ "وہ بوڑھا سٹھیا گیا ہے۔ اسے پتہ نہیں ہے کہ میں اس کی ایک ایک حرکت سے باخبر رہنے والا گاڈ فادر ہوں۔ میری خاموشی سے وہ یہی اندازہ لگاتا ہے کہ میں اس سے کمتر ہوں اور اس کی طرح بڑے ذرائع اور اختیارات کا مالک نہیں ہوں۔"

"پلیز' آپ اپنی طاقت اور وسیع ذرائع استعمال کریں۔ یہ ہمارے لیے بڑے شرم

کی بات ہے کہ آج میرے شوہر کو ہتھکڑی پہنائی گئی اور انہیں ایک مجرم کی طرح حوالات میں لے جا کر بند کیا گیا ہے۔"

گاڈ فادر نے کہا۔ "میرا نام حمزہ بیگ ہے۔ میں اسے منہ توڑ جواب دوں گا لیکن فی الوقت قباحت یہ ہے کہ ملک کی جن بااختیار شخصیات پر دباؤ ڈال کر پیر شاہ سلطانی اپنی من مانی کرتا ہے' میں بھی ان شخصیات پر مختلف حوالوں سے دباؤ ڈال کر اپنا کام نکالتا ہوں۔ وہ شخصیات ایک گھنٹے پہلے ایک اہم کانفرنس میں شریک ہونے کے لیے بیرون ملک گئی ہیں۔ اس ملک میں میرے ایجنٹ ان سے ملاقات کریں گے اور وہیں سے تمہارے شوہر برکت شاہ سلطانی کی رہائی کا حکم جاری کرائیں گے۔ اس کے لیے صبح تک انتظار کرنا ہوگا۔"

بیگم ریحانہ برکت نے کہا۔ "صبح تک بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ تھانے میں اخبار والے پہنچ جائیں گے اور برکت کی گرفتاری کی خبریں شائع کریں گے تو میں اور میرے جوان بچے کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔"

"تم ناحق پریشان ہو رہی ہو۔ میں کسی بھی اخبار میں یہ خبر شائع نہیں ہونے دوں گا۔ تم میں سے کوئی اس سے ملاقات کرنے حوالات نہ جائے ورنہ تمہارے جیسے باوقار خاندانی افراد کو وہاں دیکھ کر بات پھیل سکتی ہے۔"

رحمت شاہ سلطانی نے گاڈ فادر سے کہا۔ "انکل! پولیس والے تو آپ کے زیر اثر رہتے ہیں۔ کیا انہیں کچھ دے دلا کر بھائی جان کو وہاں سے نہیں لایا جا سکتا۔"

"تمہارے باپ نے برکت کی فیکٹری میں پولیس اور مجسٹریٹ کو بھیجنے سے پہلے انہیں بھاری رقم دی ہے۔ اصول یہ ہے کہ ایک سے معاملات طے پانے اور رقم ادا ہونے کے بعد وہ میری آفر کو قبول نہیں کریں گے۔ میں تمہیں اطمینان دلا رہا ہوں۔ صرف صبح تک کی بات ہے۔ صبر کرو۔ گھر جا کر آرام سے سو جاؤ۔ صبح تم سب کی آنکھیں کھلنے سے پہلے برکت گھر پہنچ جائے گا۔"

بیگم ریحانہ برکت نے کہا۔ "صبر تو کرنا ہی ہوگا مگر ہمیں نیند نہیں آئے گی۔"

گاڈ فادر حمزہ بیگ نے کہا۔ "اور بھوک بھی اُڑ گئی ہے اسی لیے تم میں سے کسی نے سامنے رکھے ہوئے کھانے کو ہاتھ نہیں لگایا ہے۔"



"آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ باپ نے بیٹے کو ہتھکڑی پہنا کر ہماری ایسی توہین کی ہے کہ ایک لقمہ بھی حلق سے نہیں اترے گا۔"

"تم سب میرے بچے ہو۔ میں تم لوگوں کو بھوکا نہیں رہنے دوں گا۔ اگر میں ایک آدھ گھنٹے میں اس توہین کا بدلہ لے لوں تو کیا پیٹ بھر کر کھاؤ گے!؟"

بیگم ریحانہ برکت نے خوش ہو کر پوچھا۔ "کیا آپ ایک آدھ گھنٹے میں برکت کو حوالات سے نکال لائیں گے؟"

"میں کہہ چکا ہوں' وہ صبح تک آ جائے گا۔ اسے رہائی دلانا تمہاری جیت ہو گی لیکن انتقامی کارروائی ایک الگ معاملہ ہے۔ اس نے تمہارے شوہر کو حوالات میں پہنچایا۔ کیا تم چاہو گی کہ اس کی گونگی بہری نوجوان نواسی کو اغوا کر لیا جائے۔"

وہ خوشی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی پھر بولی۔ "آپ اس بڈھے کو ایسا منہ توڑ جواب دیں گے تو میں حضرت عبداللہ شاہ غازیؒ کے مزار پر جاؤں گی اور پانچ دیگیں پکواؤں گی۔"

رحمت شاہ سلطانی نے کہا۔ "وہ گونگی غائب کر دی جائے تو ابا حضور پانی سے نکلی ہوئی مچھلی کی طرح تڑپیں گے۔ وہ بیٹی اور نواسی کو ہم بیٹوں سے زیادہ چاہتے ہیں۔"

بیگم رحمت شاہ نے کہا۔ "بڑے میاں کی مت ماری گئی ہے۔ ساری دنیا کے لوگ بیٹا پیدا ہونے کی دعائیں مانگتے ہیں اور وہ خبطی ہیں کہ انہوں نے ایک نہیں دو بیٹوں کو چھوڑ کر ایک بیٹی اور ایک نواسی کو کلیجے سے لگائے رکھا ہے۔"

بیگم ریحانہ برکت نے کہا۔ "اب وہ بیٹی بھی کہاں رہی۔ نہ جانے کس کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ وہ تو انکل آپ کو الزام دیتے ہیں کہ ہاجرہ کو دوسرے گاڈ فادر نے اغوا کرایا ہے۔"

"وہ صرف الزام دے سکتا ہے ثابت نہیں کر سکتا کیونکہ میں نے ہاجرہ کو اغوا نہیں کیا ہے۔ بہرحال اگر تم سب چاہتے ہو کہ وہ گونگی اغوا کر لی جائے تو ابھی میرے سامنے پیٹ بھر کر کھانا کھاؤ۔"

وہ سب خوش ہو گئے تھے۔ اپنی اپنی کرسیاں ڈائننگ ٹیبل کے قریب کھسکا کر

کھانے لگے۔ رحمت شاہ سلطانی نے کھانے کے دوران کہا۔ "انکل! آپ ہمیں اپنی اولاد سمجھتے ہیں پھر ہمارے سامنے کیوں نہیں آتے؟"

"میں کسی کے سامنے نہیں آتا۔ حتیٰ کہ میری اپنی اولاد بھی مجھے صرف ایک باپ کی حیثیت سے جانتی ہے مگر یہ نہیں جانتی کہ میں زیرزمین دنیا کا گاڈ فادر ہوں۔ تمہارے باپ پیر شاہ سلطانی کی پہنچ بہت دور تک ہے۔ وہ بڑی دور کی کوڑی لاتا ہے لیکن آج تک اس نے بھی میرا اصلی چہرہ نہیں دیکھا ہے اور نہ ہی میری خفیہ رہائش گاہ سے واقف ہے۔ میری پُراسراریت نے اسے بری طرح الجھا رکھا ہے۔ مگر وہ بڑا چالاک ہے اپنی الجھن ظاہر نہیں کرتا ہے۔ بہرحال اطمینان سے پیٹ بھر کر کھانا کھاؤ۔ میں یہ معلوم کرنے جا رہا ہوں کہ وہ گونگی اپنے نانا کی کوٹھی میں تنہا ہے یا کہیں باہر تفریح کے لیے نکلی ہے۔ پیر شاہ سلطانی نے بیٹوں کو گھر سے نکال کر چوبیس گھنٹے بھی گزرنے نہیں دیے اور انتقامی کارروائی کے طور پر اپنے ہی بڑے صاحب زادے کو لاک اپ میں بند کرا دیا ہے۔ اب وہ نواسی کی محبت کے پنجرے میں پھڑپھڑائے گا۔ پیٹ بھر کر کھاؤ اور مطمئن ہو کر جاؤ۔ خدا حافظ۔"

بات ختم ہوتے ہی سامنے والی دیوار کا مستطیل شیشہ تاریک ہو گیا۔ اس شیشے کے پیچھے جو دھندلا سا انسانی خاکہ نظر آ رہا تھا وہ بھی تاریکی میں گم ہو چکا تھا۔

★==========★==========★



شہناز عرف شانی نے زندگی میں پہلی بار اپنے اندر تبدیلی محسوس کی۔ وہ سچل کے ے میں سوچنا نہیں چاہتی تھی مگر اپنی مرضی کے خلاف بے اختیار سوچ رہی تھی۔ جب بورڈنگ کارڈ لے کر اندر چلا گیا تھا اور نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا تب وہ واپس جانے لیے شیشے کی دیوار کے پاس سے پلٹ گئی تھی۔

یہ پلٹنا ایسے تھا جیسے پانسا پلٹ گیا ہو۔ اس کے عین مقابل ایک خوبرو، قد آور اور تمند نوجوان کھڑا ہوا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ کب سے اس کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ ے تو ایسے ہی لگا جیسے تقدیر نے اس کے نام ایک پارسل بھیج دیا ہے جسے دیکھ کر وہ سوچتی جائے اور دل دھڑکتا رہ جائے۔

وہ کسی کو توجہ سے اس وقت دیکھتی تھی جب اپنے باپ کے لیے جاسوسی کرنا اور ں خاص شخص کو تاڑنا لازمی ہوتا تھا ورنہ وہ عام طور پر دوسروں کو نظرانداز کر کے گزر تی تھی لیکن ائیرپورٹ میں وہ بے اختیار چند لمحوں تک سچل کو دیکھتی رہ گئی تھی۔

اور جب نظریں پھیر کر جانے لگی تو وہ اجنبی جوان اس کے پیچھے چلا آ رہا تھا۔ گویا س کے پیچھے بین بجا رہا تھا پھر اس کے مسلح گارڈز نے اجنبی جوان کو روکا۔ ایسے وقت نی نے کاغذ قلم کے ذریعے گفتگو کی۔ اجنبی نے اس کی تحریر کے جواب میں لکھا۔ "اگر ے معلوم ہوتا کہ تم بولنے اور سننے سے معذور ہو تو تمہارے پیچھے نہ آتا بلکہ شانہ بہ نہ ہو کر تمہیں مخاطب کرتا۔ میں ایک تعلیم یافتہ اور مہذب ماں کا بیٹا ہوں۔ میری نکھوں میں نہ میل ہے اور نہ دل میں کوئی گھٹیا ارادہ ہے۔"

شانی کو اس کی تحریر نے بھی متاثر کیا۔ اس نے لکھا۔ "میں نے تمہاری شخصیت

سے اندازہ لگایا ہے کہ تم جیسا کہہ رہے ہو' ویسے ہی ہو سکتے ہو۔ مختصر الفاظ میں کہو' مجھ سے کیا چاہتے ہو۔"

اس نے جواباً لکھا۔ "تمہارے گھر کا پتہ چاہتا ہوں۔ شادی کی درخواست لے کر آؤں گا۔"

وہ تحریر پڑھتے ہی شانی کا منہ حیرت سے کھل گیا تھا۔ دل کی دھڑکنیں یکبارگی تیز ہو گئی تھیں۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ کسی شناسائی کے بغیر کوئی پہلی ملاقات میں نہایت سادگی' سچائی اور بے باکی سے اس سے شادی کی آرزو کرے گا۔

پورے چاند کی رات تھی۔ سمندر کی لہریں جذبوں کی طرح بپھرتی' شور مچاتی آ رہی تھیں اور کلفٹن کی ساحلی دیوار سے ٹکرا رہی تھیں۔ وہ دیوار پر بیٹھی سنی کی زندہ دلی کے بارے میں' اپنے باپ اور نانا کے بارے میں اور اپنی گم شدہ ماں کے بارے میں سوچنا چاہتی تھی مگر ہر رشتے کی سوچ پر سچل حاوی ہوتا جاتا تھا۔ وہ سمندر کی لہر لہر میں اس کے پاس آ کر ساحلی دیوار سے یوں ٹکرا رہا تھا جیسے دل کی دیوار سے اپنا سر ٹکرا رہا ہو۔

وہ لہروں کا شور نہیں سن سکتی تھی مگر لہروں پر لکھی ہوئی وہ تحریر پڑھ رہی تھی کہ تمہارے گھر کا پتہ چاہتا ہوں۔ شادی کی درخواست لے کر آؤں گا۔

کیسی سیدھی دل میں اتر جانے والی بات تھی۔ نہ کوئی تعارف' نہ کوئی رومانس۔ اگر بزرگوں کی یہ کہاوت درست ہے کہ رشتے آسمانوں میں بنتے ہیں تو وہ تحریر سیدھی آسمان سے آئی تھی۔

وہ ایسی پریشانی میں مبتلا ہو گئی تھی جو دل کو راحت پہنچاتی ہے۔ جو بے چین کرتی ہے اور چین سے کسی ایک کو خیالوں کا مرکز بنا دیتی ہے۔ وہ اچانک آیا تھا۔ اکیلا آیا تھا لیکن خیالوں کی بارات لے کر آیا تھا۔

ساحلی دیوار سے ذرا فاصلے پر سیکیورٹی گارڈز ایک گاڑی کے باہر کھڑے ہوئے تھے۔ سیکیورٹی افسر دوسری گاڑی کی سٹیئرنگ سیٹ سے نکل کر شانی کے قریب آیا پھر اس نے ایک پنسل ٹارچ کی روشنی میں اپنی کلائی کی گھڑی دکھائی۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ شانی دیوار سے اٹھ کر اگلی گاڑی میں آ کر بیٹھ گئی۔



اس نے ایئرپورٹ سے واپسی پر اپنی گاڑی میں بیٹھتے وقت دور کھڑے ہوئے سچل کو دیکھا تھا پھر گاڑی چل پڑی تھی۔ اس کا دل آگے جانا نہیں چاہتا تھا اور کسی اجنبی کی سمت پلٹنا بھی مناسب نہیں تھا اس لیے دل آگے پیچھے ہو رہا تھا۔ اس نے کاغذ پر سیکیورٹی افسر کو لکھ کر دیا۔ "میں ابھی واپس نہیں جاؤں گی۔ کھلی فضا میں وقت گزاروں گی۔ سمندر کی طرف چلو۔"

اس کے حکم کی تعمیل کی گئی تھی اور وہ رات کے گیارہ بجے تک ساحلی دیوار پر بیٹھی سمندر کی شور مچاتی ہوئی لہروں کو نہیں' اپنی بارات کو آتے دیکھتی رہی تھی۔ کبھی کبھی انکار میں سر جھٹک کر سوچتی تھی کہ فضول سی بات ہے۔ زندگی کے چوراہے پر کوئی مخالف سمت سے آیا تھا۔ اس نے سگنل پر اپنی گاڑی اس کی گاڑی سے کچھ فاصلے پر روکی تھی پھر سبز روشنی کے آن ہوتے ہی وہ اپنی اپنی راہ پر گزرتے گئے تھے اور یوں بچھڑتے گئے تھے۔ مخالف سمت سے آنے والے جب کراس کر کے گزر جاتے ہیں تو پھر شاید ہی کسی چوراہے پر ملتے ہیں۔

سیکیورٹی افسر نے ایک ریڈ سگنل کے پاس گاڑی روک دی۔ ٹھیک اس گاڑی کے ساتھ ایک مجسٹریٹ اور پولیس والوں کی گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ شانی ایک گاڑی میں ایک پولیس افسر کے ساتھ اپنے ماموں برکت شاہ سلطانی کو دیکھ کر چونک گئی۔ برکت کے دونوں ہاتھ گاڑی کے ڈیش بورڈ پر رکھے ہوئے تھے اور ان ہاتھوں میں ہتھکڑیاں نظر آ رہی تھیں۔

شانی نے سیکیورٹی افسر کو جھنجھوڑ کر اسے اپنے ماموں کی طرف متوجہ کیا۔ اس وقت برکت شاہ سلطانی نے گھور کر شانی کو دیکھا۔ سیکیورٹی افسر نے پولیس افسر سے کہا۔ "جناب! آپ مجھے جانتے ہیں۔ میں پیر عظمت اللہ شاہ سلطانی کا سیکیورٹی افسر ہوں اور یہ ان کی نواسی ہیں۔ آپ ان کے صاحب زادے کو گرفتار کر کے لے جا رہے ہیں' آخر معاملہ کیا ہے؟"

پولیس افسر نے اس کی باتیں سنیں لیکن جواب نہ دے سکا۔ گرین سگنل ہو چکا تھا۔ ان تمام پولیس والوں کی گاڑیاں تیزی سے آگے چلی گئیں۔ سیکیورٹی افسر نے گاڑی

آگے بڑھاتے ہوئے موبائل فون کے نمبر ڈائل کیے۔ شانی نے کاغذ پر لکھا۔ "میرے ماموں جان کے پیچھے چلو۔ معلوم کرو' انہیں کہاں لے جایا جا رہا ہے۔ انہیں ہتھکڑی پہنائی گئی ہے۔ یہ ہمارے خاندان کی بدنامی ہو رہی ہے۔"

فون پر رابطہ قائم ہو گیا۔ دوسری سے آواز آئی۔ "ہیلو! ہم بول رہے ہیں۔"

"جناب عالی! میں آپ کا خادم غلام رسول سیکیورٹی افسر بول رہا ہوں۔ شہناز بی بی کے حکم کے مطابق ہم ابھی تک ساحل سمندر پر تھے۔ واپسی پر بی بی جی نے آپ کے بڑے صاحب زادے کو پولیس کی ایک گاڑی میں دیکھا۔ انہیں ہتھکڑی پہنائی گئی ہے۔ وہ گاڑیاں آگے جا چکی ہیں مگر میں ان کا پولیس اسٹیشن جانتا ہوں۔ ادھر بی بی جی تحریر کے ذریعے کہہ رہی ہیں کہ ماموں کو ہتھکڑی لگنے سے خاندان کی بدنامی ہو رہی ہے۔ مجھے اپنے ماموں کے پیچھے جانے کا حکم دے رہی ہیں۔"

دوسری طرف چند لمحوں خاموشی رہی پھر انہوں نے کہا۔ "واقعی خاندان کی بدنامی ہو رہی ہے۔ فوراً اس تھانے میں جاؤ اور معلوم کرو کہ ہمارے بیٹے کو کس جرم میں گرفتار کیا گیا ہے۔ ہم ایف آئی آر درج نہیں ہونے دیں گے۔ یہ بتاؤ' وہ کس علاقے کے سپاہی اور افسر تھے؟"

سیکیورٹی افسر نے تھانے اور علاقے کا پتہ بتایا۔ دوسری طرف سے رابطہ ختم ہو گیا۔ شانی نے اسے فون بند کرتے دیکھ کر اشاروں میں پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

سیکیورٹی افسر نے بھی گاڑی ڈرائیو کرنے کے دوران اشاروں میں سمجھایا کہ وہ اسے اس کے ماموں کے پاس لے کر جا رہا ہے۔

پیر عظمت اللہ شاہ سلطانی نے فون کے ذریعے مجسٹریٹ سے کہا۔ "ہماری نواسی نے برکت کو مجرم کی حیثیت سے پولیس کے ساتھ جاتے دیکھ لیا ہے۔ وہ تھانے پہنچنے والی ہے۔ آپ گھر جا کر آرام کریں۔ انسپکٹر کو سمجھا دیں' یہ ظاہر ہو نہ کہ یہ گیم ہمارا ہے۔ ہم ابھی آ رہے ہیں۔"

پندرہ منٹ کے بعد شانی اس تھانے میں پہنچی۔ سیکیورٹی افسر نے پوچھا۔ "برکت شاہ صاحب کہاں ہیں؟ ہماری بی بی جی ان کا جرم معلوم کرنا چاہتی ہیں اور ان سے ملنا بھی



چاہتی ہیں۔"

انسپکٹر نے کہا۔ "مسٹر برکت کی دوا ساز فیکٹری میں نشیلی دوائیں تیار ہو رہی تھیں۔ ہم نے ایک مجسٹریٹ صاحب کی موجودگی میں اچانک چھاپا مارا تو دو نمبر دواؤں اور نشیلی دواؤں کا ذخیرہ برآمد ہوا ہے۔"

سیکیورٹی افسر نے یہ باتیں لکھ کر شانی کو بتائیں۔ شانی نے انسپکٹر کو تحریر کے ذریعے مخاطب کیا۔ "آپ نے اپنا فرض ادا کیا ہے لیکن میرے ماموں جان کو ہتھکڑی پہنانے سے پہلے میرے نانا جان کو اطلاع دینی چاہیے تھی۔"

انسپکٹر نے لکھا۔ "مس! ہم مجبور تھے کیونکہ ہمارے ساتھ مجسٹریٹ صاحب موجود تھے۔"

"میں مجسٹریٹ صاحب سے ملوں گی۔"

"سوری۔ وہ اپنی رپورٹ لکھنے کے بعد یہاں سے جا چکے ہیں۔"

اس نے سیکیورٹی افسر سے بذریعہ تحریر کہا۔ "ابھی نانا حضور کو بلاؤ۔ میں اپنے ماموں جان کو رہائی دلائے بغیر نہیں جاؤں گی اور ابھی ماموں جان سے ملوں گی۔"

انسپکٹر نے بھی وہ تحریر پڑھی پھر ایک سپاہی سے کہا۔ "بی بی جی کو برکت صاحب کے پاس لے جاؤ۔"

مجرم یا ملزم کو صاحب نہیں کہتے' گالیاں دے کر باتیں کرتے ہیں لیکن وہ سارا ڈراما ملزم کے باپ نے رچایا تھا اس لیے اسے برکت صاحب کہا جا رہا تھا۔

شانی ایک سپاہی کے پیچھے کاریڈور سے گزرتی ہوئی اس جگہ پہنچی جہاں حوالاتی کمرے بنے ہوئے تھے۔ ایک کمرے میں برکت شاہ سلطانی آہنی سلاخوں کے پیچھے کھڑا ہوا تھا۔ شانی کو دیکھتے ہی غرا کر بولا۔ "گونگی کی بچی! کیا یہاں میرا تماشا دیکھنے آئی ہے؟"

وہ اپنے بیگ سے کاغذ قلم نکال کر لکھنا چاہتی تھی' برکت شاہ گرج کر اس کے کاغذات کے پیڈ پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ "خبردار! یہ خط و کتابت اپنے باپ اور نانا سے کرنا۔ چلی جاؤ یہاں سے.........."

وہاں فرش پر سوئے ہوئے قیدی نے نیند بھری آواز میں کہا۔ "اے بھائی' آہستہ

بولو۔ کیوں حلق پھاڑ کو دوسروں کی نیند خراب کر رہے ہو۔"

برکت شاہ نے غصے میں قیدی کی طرف دیکھ کر کہا۔ "بکواس مت کر۔ تجھے معلوم ہو جائے کہ میں کون ہوں تو تھر تھر کانپنے لگے گا۔"

سونے والے کا رخ دیوار کی طرف تھا۔ وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ "کون ہو بھائی! شیر کو دیکھ کر تھر تھر کانپا جاتا ہے۔ تم جانور ہو کر انسانوں کے پنجرے میں کیسے چلے آئے ہو؟"

وہ بولتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا پھر جماہی لیتا ہوا برکت شاہ کی طرف گھوم گیا۔ اسے دیکھتے ہی شانی کا دل دھک سے رہ گیا پھر تیزی سے دھڑکنے لگا۔ سچل حیرانی سے آنکھیں مل مل کر یوں دیکھ رہا تھا جیسے اپنے بیدار ہونے کا یقین نہ ہو۔ اس نے آہنی سلاخوں کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھا۔ "تم......... تم ہی ہو نا؟ میں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں؟"

پھر اس نے برکت شاہ سے کہا۔ "اے جانور بھائی! ذرا مجھے پنجے مارو' میں اپنے جاگنے اور اپنی ہونے والی دلہن کی آمد کا یقین کرنا چاہتا ہوں۔"

برکت شاہ نے اس کا گریبان پکڑ کر کہا۔ "جانور ہو گا تُو اور تیرا خاندان۔ تیرے جیسے دو ٹکے کے مجرم کو اتنی جرأت کیسے ہوئی کہ میری بھانجی کو دلہن کہے؟"

"یہ تمہاری بھانجی ہے؟ مگر میں نے نیند میں سنا ہے تم اس پر غرا رہے تھے' غصہ دکھا رہے تھے۔"

ان باتوں کے دوران شانی نے کاغذ پر لکھ کر دیا۔ "پلیز ماموں جان! اس کا گریبان چھوڑ دیں' آپ کیوں جھگڑا کر رہے ہیں؟"

دونوں نے اس تحریر کو پڑھا۔ سچل نے برکت شاہ کی دونوں کلائیاں تھام کر کہا۔ "یہ میری ہونے والی دلہن کی خواہش ہے کہ گریبان چھوڑ دیا جائے۔ یہ دیکھو تم کتنی شرافت اور نزاکت سے چھوڑ رہے ہو۔"

برکت شاہ کی دونوں کلائیاں دُکھ رہی تھیں۔ سچل کی قوت کا اندازہ ہوتے ہی اس نے گریبان چھوڑ دیا۔ شانی نے دوسرا کاغذ لکھ کر سچل کو دیا۔ اس نے لکھا تھا۔ "میں تمہیں یہاں دیکھ کر حیران ہوں۔ سچ بتاؤ کیا واقعی تم مجرم ہو؟ تم نے کیا جرم کیا ہے؟"

سچل نے کاغذ قلم لے کر لکھا۔ "میں نے ائیرپورٹ پر اپنے دل کی گہرائیوں سے



ے صاف اور سیدھی بات کہہ دی تھی۔ میں جتنی سچائی سے تمہیں دلہن بنانا چاہتا ہوں نی ہی سچائی سے خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں کہ میں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ مجھے اسمگلنگ کے کیس میں پھنسایا گیا ہے۔ شاید تم یقین نہ کرو کہ مجھے پھنسانے اور والات میں بھیجنے کی سازش میرے اپنے باپ نے کی ہے۔"

برکت شاہ بھی وہ تحریر پڑھ رہا تھا۔ پڑھنے کے بعد سچل سے بولا۔ "تم اپنی مظلومیت ظاہر کرنے کے لیے میری کہانی کو اپنی کہانی بنا رہے ہو۔ سازش تمہارے باپ نے نہیں' میرے باپ نے کی ہے۔ وہ مجھے تباہ و برباد کرنے کے لیے جیل بھیجنا چاہتا ہے۔"

"اگر یہ تمہاری کہانی ہے تو کہانی مجھ سے بدل لو' باپ کسی اور سے بدل لو۔ کیا تم سازشوں اور دشمنیوں کے باوجود باپ بدل سکتے ہو؟ باپ تو وہ ہوتا ہے جو مرنے کے بعد بھی ہماری رگوں میں خون بن کر دوڑتا ہے۔ میں نے اس کاغذ پر باپ کی سازش لکھی ہے باپ کے لیے نفرت نہیں لکھی۔ لو یہ کاغذ قلم اور اپنے باپ سے نفرت لکھ کر اس کے رشتے سے انکار کر دو۔"

برکت شاہ ہچکچانے لگا۔ اس نے کاغذ قلم نہیں لیا۔ ملک کے اندر اور باہر جتنے شناسا تھے' سب ہی اسے برکت شاہ ولد پیر عظمت اللہ شاہ سلطانی کے رشتے سے پہچانتے تھے۔ اس ولدیت کو قائم رکھنے کے لیے والد کا نام نفرت سے نہیں لکھ سکتا تھا کیونکہ جو حقیقت تحریر میں آ جاتی ہے' وہ دستاویزی ثبوت کے طور پر اپنی ماں کے لیے گالی بن جاتی ہے۔

شانی نے کاغذ قلم کے ذریعے پوچھا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

"سچل نواز ولد سائیں رب راکھن۔"

شانی نے لکھا۔ "میں نے اپنے خاندان میں بیٹوں کو باپ سے بدظن ہوتے اور بڑھاپے میں ساتھ چھوڑتے دیکھا ہے۔ کیا تم نے بھی باپ کے ساتھ یہی سلوک کیا ہے؟"

"میری ماں جی مجھے ہمیشہ گمراہی سے بچاتی رہی اور بابا سائیں ناجائز دولت اور بے جا ذرائع اور اختیارات حاصل کرنے کی راہ پر چلانے کی کوشش کرتے رہے۔ جب ناکام

ہونے لگے تو بے جا ذرائع سے مجھے یہاں پہنچا دیا۔ یہاں سے جیل میں پہنچانے والے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ جرائم کی سب سے بڑی یونیورسٹی جیل ہے۔ میں وہاں برسوں رہ کر اعلیٰ پائے کا مجرم بن کر نکلوں گا.........."

وہ آگے بھی لکھنا چاہتا تھا لیکن رک گیا۔ سیکیورٹی افسر ایک سپاہی کے ساتھ آیا تھا۔ افسر نے ایک پرچی شانی کو دی۔ اس پر لکھا تھا۔ "آپ کے نانا حضور تشریف لے آئے ہیں۔ یہ سپاہی آپ کے ماموں جان کو لینے آیا ہے۔"

سپاہی نے آہنی دروازے کو کھولتے ہوئے کہا۔ "چلیں برکت صاحب! آپ کے والد محترم آئے ہیں۔"

برکت شاہ نے اکڑ کر کہا۔ "میں کسی سے نہیں ملوں گا۔ میں کسی کا محتاج نہیں ہوں۔ مجھے ضمانت پر رہا کرانے والی بڑی بڑی ہستیاں موجود ہیں۔"

سیکیورٹی افسر نے کہا۔ "چھوٹے صاحب جی! آپ بے شک کسی کے محتاج نہیں ہیں۔ آپ کو دوسری بڑی ہستیوں پر ناز بھی ہے لیکن یہ بھی تو دیکھیں یہاں آپ کے پاس کوئی نہیں آیا۔ سب سے پہلے آپ کے والد صاحب آئے ہیں۔"

سچل نے کہا۔ "ایسے باپ کی قدر کرو۔ اگر ایف آئی آر درج ہو گئی تو عدالت سے ضمانت حاصل کرنا پڑے گی اور تم پر مقدمہ چلتا رہے گا۔ تمہاری بڑی بڑی ہستیاں تمہارے لیے مقدمہ لڑ سکتی ہیں لیکن تمہیں ہر پیشی پر ملزم بننا پڑے گا۔"

سیکیورٹی افسر نے کہا۔ "اب یہ ملزم نہیں رہے۔ مجسٹریٹ کی موجودگی میں چھاپا پڑا تھا۔ دو نمبر دوائیں ہی نہیں، نقلی دوائیں بھی برآمد ہوئی ہیں۔ انہیں پہلی پیشی پر ہی سزا ہو جائے گی۔"

سچل نے برکت کے شانے پر ہاتھ مار کر کہا۔ "ایسے باپ کی قدر کرو جو تمہیں دنیا کی نظروں میں مجرم بننے اور سزا پانے سے پہلے ہی بچانے آ گیا ہے۔ کیا تم میری طرح جیل کی درس گاہ میں رہنا چاہتے ہو؟"

برکت شاہ نے اپنے شانے پر سے اس کا ہاتھ ہٹایا پھر سر جھکا کر آہنی دروازے سے باہر آ گیا۔ سپاہی اب ایک قیدی سچل کو آہنی سلاخوں کے پیچھے رکھنے کے لیے دروازہ بند



کرنا چاہتا تھا کہ شانی نے ایک ہاتھ سے آہنی دروازے کو پکڑ کر اسے بند کرنے سے روک دیا پھر اشارے سے بولی کہ سچل کو بھی باہر نکالو۔

سپاہی نے کہا۔ "یہ ملزم ہے۔ حوالات میں رہے گا۔"

سچل نے لکھ کر بتایا۔ "میرے اپنے باپ نے مجھے یہاں قید کرایا ہے اور اتنا مضبوط جال بچھایا ہے کہ مجھے اس جال سے میری ماں جی ہی رہائی دلا سکے گی۔ تم مجھے تھانے دار اور اپنے نانا کے پاس لے جا کر کیا کرو گی؟"

شانی نے لکھا۔ "میرے ماموں جان مجرم ثابت ہو چکے ہیں اس کے باوجود نانا انہیں مکھن کے بال کی طرح یہاں سے نکال کر لے جائیں گے۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ تم مجرم نہیں ہو۔ جب نانا جان مجرم کو رہائی دلا سکتے ہیں تو کیا ایک بے قصور کو باعزت بری نہیں کرا سکیں گے؟"

وہ آہنی سلاخوں کے پیچھے سچل کے پاس آ گئی پھر ایک کاغذ پر سیکیورٹی افسر کو لکھ کر دیا۔ "سپاہی سے کہو، دروازہ لاک کر دے۔ جب تک ایک بے قصور کو انصاف نہیں ملے گا تب تک میں بھی اس کے ساتھ قید رہوں گی۔"

سیکیورٹی افسر نے سپاہی سے کہا۔ "بی بی جی! بہت ضدی ہیں۔ یہ باہر نہیں آئیں گی۔ تم دروازے کو لاک نہ کرو۔"

سپاہی نے کہا۔ "میں حکم کا بندہ ہوں۔ قانون کا پابند ہوں اس لیے قیدی کو مقفل حوالات میں رکھوں گا۔"

برکت شاہ نے کہا۔ "اس گونگی کو اپنی خاندانی عزت کا خیال نہیں ہے۔ ایک اجنبی کے ساتھ تنہا حوالات میں رہ کر ہماری ناک کٹوانا چاہتی ہے۔"

سچل نے کہا۔ "اگر تمہاری ناک ہوتی تو کٹنے کا مسئلہ پیدا ہوتا۔ اپنی بھانجی سے پہلے تم حوالات میں آئے تھے اور اگر اس بات پر اعتراض ہے کہ یہ میرے ساتھ مقفل کمرے میں رہے گی تو یہ خوش خبری پہلے ہی سنا چکا ہوں کہ کسی دن تمہارا داماد بننے والا ہوں۔"

"یو شٹ اپ، میں تمہارا منہ توڑ دوں گا۔"

"ابھی نہیں۔ میرے منہ پر سے سہرا ہٹا کر توڑ سکو تو ضرور توڑ دینا۔"

سیکیورٹی افسر نے کہا۔ "مسٹر! تم ائیرپورٹ پر بھی بڑی دیدہ دلیری دکھا رہے تھے۔ کیا زندگی سے بیزار ہو گئے ہو؟"

"کیسے بیزار ہو سکتا ہوں۔ زندگی تو کھلی فضا سے بند حوالات میں آئی ہے۔ مجھے موت کی دھمکی دینے والا سیکیورٹی افسر کیا میری خوب صورت زندگی کو گولی مار سکتا ہے؟"

سپاہی نے دروازے کو مقفل کرتے ہوئے کہا۔ "میں تو اپنے بڑے صاحب کے حکم کی تعمیل کر رہا ہوں۔ ان کے نانا جان خود انہیں یہاں سے لے جائیں گے۔"

سپاہی، برکت شاہ اور سیکیورٹی افسر کے ساتھ چلا گیا۔ سچل نے لکھ کر پوچھا۔ "کیا محبت کے پنجرے میں بھی ساری عمر میرے ساتھ رہو گی؟"

اس نے لکھا۔ "میں کوئی معمولی سا فیصلہ کرنے میں بھی جلد بازی نہیں کرتی جبکہ تم زندگی کا سب سے اہم فیصلہ سننا چاہتے ہو۔ فی الحال میں نے تمہارے حق میں قانونی فیصلہ کرانے کے لیے خود کو احتجاجاً قیدی بنایا ہے۔"

پولیس انسپکٹر کے کمرے میں پیر عظمت اللہ شاہ سلطانی ایک کرسی پر بیٹھے تھے اور انہوں نے دوسری کرسی پر پاؤں پھیلا رکھا تھا۔ ان کے سامنے برکت شاہ حاضر ہوا اور سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ انسپکٹر نے پوچھا۔ "پیر شاہ صاحب! مجھے کیا کہنا چاہیے، آپ کے سامنے بیٹا آیا ہے یا میرے سامنے مجرم؟"

"جب یہ ہمیں چھوڑ کر بیوی کے ساتھ گیا تھا تب ہی ہم سمجھ گئے تھے کہ ہمارے دشمن ہمارے بیٹوں کے خلاف ایسی چالیں چلیں گے جس کے نتیجے میں ہمارے دوسرے معاملات پر بھی برا اثر پڑے گا اور ہمارے خاندان کی نیک نامی بدنامی میں بدل جائے گی۔ ہم کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ہمارے بیٹے کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنائی جائیں گی۔"

برکت شاہ نے کہا۔ "میرے دو نمبر کے دھندے کے متعلق صرف آپ جانتے تھے۔ مجھے یہاں تک آپ نے پہنچایا ہے اور آپ ہی رہائی دلانے آئے ہیں۔ ایک بیٹا اپنے باپ کی چالبازیوں کو خوب سمجھتا ہے۔"

"ہوں! تو تم بہت سمجھ دار ہو۔ دشمن گاڈ فادر کو الو کا پٹھا سمجھتے ہو اور یہ پولیس



والے بھی نادان ہیں۔ تمہارے دو نمبر کے دھندوں کو یہ نہیں جانتے تھے۔ تمہاری شریک حیات اور تمہارا جوان بیٹا جمشید بھی نشے کی حالت میں گھر کا بھیدی نہیں بنتا ہو گا۔ کیوں انسپکٹر، کس نے مجسٹریٹ صاحب کو اطلاع دی تھی کہ آج اس کی فیکٹری میں جعلی اور نشیلی دواؤں کی پیکنگ ہو رہی ہے؟"

انسپکٹر نے کہا۔ "ایک نامعلوم شخص نے آپ کی آواز کی نقل کرنے کی ناکام کوشش کی تھی اور کہا تھا، ہم پیر عظمت اللہ شاہ سلطانی اپنے بیٹے کے خلاف ایک جرم کی نشاندہی کر رہے ہیں۔ یہ سنتے ہی ہمیں شک گزرا کہ کوئی آپ کا نام لے کر آپ کے بیٹے کے خلاف کوئی چال چل رہا ہے۔ پھر یہ کہ جب بھی آپ فون پر گفتگو کا آغاز کرتے ہیں تو اپنے مخصوص انداز میں کہتے ہیں، ہیلو! ہم بول رہے ہیں لیکن اس شخص سے چوک ہو گئی تھی، وہ آپ کا یہ مخصوص انداز اپنانا بھول گیا تھا۔"

"آپ نے اس کی اطلاع پر چھاپا کیوں مارا۔ اس سے پہلے فون کے ذریعے تصدیق کیوں نہیں کی کہ ہم ہی اپنے بیٹے کو اتنا بڑا نقصان اٹھانے کی اور حوالات میں پہنچانے کی سازش کر رہے ہیں؟"

"میں نے کئی بار فون کیا۔ کوٹھی کے اندر شاید کوئی فون اٹینڈ کرنے والا نہیں تھا اور ہمیں آپ کے موبائل فون کا نمبر معلوم نہیں تھا۔ مجسٹریٹ صاحب نے کہا جس نے بھی اطلاع دی ہے، اس کے مطابق قانونی کارروائی کی جائے۔ اگر یہ کارروائی پیر شاہ سلطانی کے مزاج کے خلاف ہو گی اور انہیں بیٹے کی گرفتاری کا علم ہو گا تو دوڑے چلے آئیں گے۔ واقعی شاہ سلطانی صاحب آپ نے ایک باپ کی ذمے داری پوری کی ہے۔ ہمیں ایف آئی آر بھی لکھنے نہیں دی۔ مجسٹریٹ صاحب کو بھی ہموار کر لیا ہے۔ آپ ابھی بیٹے کو لے جا سکتے ہیں۔"

"ہم تو بیٹے کو اس وقت لے جاتے تھے جب یہ ہماری انگلی پکڑ کر چلتا تھا اور ہماری طرف کوئی انگلی اٹھانے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ اب یہ ہمارے بغیر کہیں بھی چلا جاتا ہے۔ اس سے کہو، رہائی مل چکی ہے۔ ہماری نظروں سے دور ہو جائے۔"

انسپکٹر نے کہا۔ "مسٹر برکت شاہ! آپ نے سن لیا۔ اب آپ جائیں اور ٹھنڈے

دماغ سے غور کریں کہ باپ ایسی کوئی مخالفانہ چال نہیں چلے گا جس کے نتیجے میں بیٹے کو یہاں پہنچا کر اپنے خاندان کی نیک نامی پر دھبا لگائے' پلیز آپ جائیں۔"

برکت شاہ سلطانی نے چور نظروں سے باپ کو دیکھا پھر سوچنے کے انداز میں سر کو جھکائے وہاں سے چلا گیا۔ انہوں نے سیکیورٹی افسر سے پوچھا۔ "یہ ہماری شانی کہاں رہ گئی ہے؟"

سیکیورٹی افسر نے کہا۔ "میں پہلے بتانے والا تھا لیکن آپ بیٹے کے سلسلے میں اہم گفتگو کر رہے تھے۔ ہماری بی بی جی' اسی حوالات میں ایک اجنبی قیدی کے ساتھ قید ہو گئی ہیں اور کہتی ہیں کہ وہ اجنبی قیدی بے قصور ہے۔ آپ اپنے مجرم بیٹے کو رہائی دلا سکتے ہیں تو اس بے قصور کو حوالات سے نکالیں۔ یہ دیکھیے' یہ بی بی جی کی تحریر ہے۔"

انہوں نے نواسی کی تحریر پڑھی پھر انسپکٹر سے پوچھا۔ "وہ دوسرا قیدی کون ہے؟ کیا واقعی وہ بے قصور ہے؟"

"وہ اسی لاکھ روپے کے سونے کی اسمگلنگ کے سلسلے میں رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہے اور اس کا پکڑا جانا بھی محض ایک ڈراما ہے۔ وہ نہایت ہی شریف نوجوان ہے مگر باپ اسے اپنے مجرمانہ رنگ میں رنگنا چاہتا ہے۔"

"کون ہے وہ باپ؟"

"آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔ وہ سائیں رب راکھن ہیں۔"

"ہوں۔ رب راکھن........... صوبے کے اندرونی حصوں میں ڈاکوؤں کی سرپرستی کرتا ہے اور اب بیٹے کو شہر میں لا کر ڈاکو بنانا چاہتا ہے۔ آپ اسے یہاں بلائیں۔"

انسپکٹر نے سپاہی کو حکم دیا۔ تھوڑی دیر میں سچل اور شانی کو لے کر سپاہی حاضر ہو گیا۔ انہوں نے اسے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ حوالات کی زمین پر سونے کے باعث لباس میلا سا ہو گیا تھا' بال بکھرے ہوئے تھے مگر بگڑے ہوئے حلیے کے باوجود اس قد آور گبھرو جوان میں ایسی کشش تھی کہ انہوں نے بے اختیار اپنی نواسی کو دیکھا۔ ذہن میں ایک سوال پیدا ہوا' کیا وہ گونگی بہری بھی اس کی ذات میں کسی کشش کے باعث دلچسپی لے رہی ہے اور اسے حوالات سے نکالنا چاہتی ہے۔ انہوں نے پوچھا۔ "کیا تمہارا نام



سچل نواز ہے اور تمہاری والدہ ملک کی مشہور و معروف لوک گلوکارہ ہیں؟"

"جی ہاں۔ میں ماں جی کے حوالے سے خوش نصیب ہوں۔"

"کیا باپ کی اربوں روپے کی جائیداد تمہیں خوش نصیب نہیں بنا رہی ہے؟"

"میں نے بابا سائیں کی کالی کمائی کا ایک پیسہ بھی اپنی ذات پر خرچ نہیں کیا ہے۔"

"پھر فارن کنٹری میں مہنگے اخراجات کیسے پورے کرتے تھے؟"

"میں ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں پلیٹیں صاف کرتا تھا۔"

انہوں نے چونک کر پوچھا۔ "تم اتنے لوگوں کے سامنے ایسی بے باکی سے سچ بول رہے ہو' کیا تمہیں اپنی اور باپ دادا کی توہین کا احساس نہیں ہو رہا ہے؟"

"محنت میں توہین کیسی؟ میں پلیٹیں صاف کرتے کرتے اپنی محنت اور لگن کے ذریعے اسی ہوٹل کا اسسٹنٹ منیجر بن گیا ہوں۔"

انہوں نے اسے ناگواری سے دیکھا پھر پوچھا۔ "ہماری نواسی کو کب سے جانتے ہو؟"

"آج رات نو بجے ائیرپورٹ پر پہلی بار دیکھا اور دیکھتے ہی دل کی گہرائیوں سے فیصلہ کر لیا کہ اسے اپنی شریک حیات بناؤں گا۔"

انہوں نے غصے سے کرسی پر پہلو بدلا۔ وہ اس بات پر گرجنا چاہتے تھے پھر یاد آیا کہ وہ نیویارک میں محض ہوٹل منیجر نہیں ہے بلکہ کروڑوں روپے کی دولت اور جائیداد کا وارث بھی ہے۔ انہوں نے غصے کو برداشت کیا پھر انسپکٹر سے کہا۔ "ہم ابھی رب راکھن سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ آپ ان سے فون پر بات کرائیں۔"

انسپکٹر ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگا۔ انہوں نے سچل سے پوچھا۔ "کیا تم نے شانی پر اپنا یہ احمقانہ ارادہ ظاہر کیا ہے؟"

"جی ہاں۔ تحریر کے ذریعے میں یہ دانش مندانہ ارادہ ظاہر کر چکا ہوں۔"

انسپکٹر نے کان سے ریسیور لگائے رکھا تھا۔ رابطہ ہوتے ہی بولا۔ "میں انسپکٹر کمال احمد بول رہا ہوں۔ وڈے سائیں سو رہے ہوں' تب بھی انہیں جگاؤ۔"

انسپکٹر انتظار کرنے لگا۔ انہوں نے کاغذ پر لکھا۔ "بیٹی! یہ میں کیا سن رہا ہوں۔ کیا

سچل نے تمہیں پرو پوز کیا ہے؟"

شانی نے اسے پڑھ کر لکھا۔ "جی ہاں‘ اس نے پرو پوز کیا ہے۔ میں نے کوئی فیصلہ کن جواب نہیں دیا ہے۔ ویسے میں اس سے بہت متاثر ہوں۔"

انہوں نے نواسی کو جواب لکھا۔ اس وقت انسپکٹر نے ریسیور ان کی طرف بڑھایا۔ انہوں نے اپنے کان سے لگا کر سنا۔ ادھر سے سائیں رب راکھن کہہ رہا تھا۔ "ہیلو‘ ہیلو........."

انہوں نے کہا۔ "ہیلو! ہم بول رہے ہیں۔"

سائیں رب راکھن نے حیرت اور مسرت سے پوچھا۔ "آپ......... آپ پیر شاہ سلطانی صاحب ہیں؟ مجھے یقین نہیں آ رہا ہے کہ میں گہری نیند سے اٹھ کر آپ کی آواز سن رہا ہوں۔"

"باتھ روم میں جا کر منہ پر پانی کے چھینٹے مارو۔ ہم سے حواس میں رہ کر گفتگو کرو۔ اس وقت ہم تھانے سے بول رہے ہیں‘ جہاں تم اپنے بیٹے کو چھوڑ آئے ہو۔ ابھی یہ ہمارے سامنے کھڑا ہوا ہے اور بڑی بے باکی سے کہہ رہا ہے کہ ہماری نواسی سے شادی کرے گا۔"

"کیا؟" وہ چیخ کر بولا۔ "کیا میرے بیٹے نے آپ کی نواسی کو پسند کیا ہے؟ یہ تو میری زندگی کی سب سے بڑی خوش خبری ہے۔ میں آپ سے کاروباری نوعیت کے تعلقات قائم کرنے کی خواہش کرتا رہتا ہے مگر میرا بیٹا مجھ سے کئی قدم آگے نکل رہا ہے۔ کیا آپ اسے پسند فرما رہے ہیں؟"

"ہاں۔ لیکن ہماری بیٹی کا داماد ہوٹل منیجر نہیں ہوگا۔"

"یہی بات میں اس گدھے کو سمجھاتا رہا ہوں۔ آخر تنگ آ کر اسے چار چھ برس کی سزا دلانے اور مجرموں کے درمیان رہنے کے لیے جیل بھجوانے کا بندوبست کیا تھا کہ وہ وہاں سے جرائم کے نت نئے ہتھکنڈے سیکھ کر آئے گا۔"

"ذرا ایک منٹ‘ ہم اس سے ایک سوال کرتے ہیں۔"

یہ کہہ کر انہوں نے سچل سے پوچھا۔ "تم ہماری نواسی سے شادی کرنے کے لیے



کیسی کیسی قربانیاں دے سکتے ہو؟"

"ابھی آپ بابا سائیں سے کہہ رہے تھے کہ شانی کا جیون ساتھی ہوٹل منیجر نہیں ہوگا۔ بہتر ہے آپ شانی سے اس کی مرضی معلوم کریں۔"

"ہم معلوم کر چکے ہیں۔ وہ صرف تم سے متاثر ہے اور ہم یہ تاثر آسانی سے ختم کر سکتے ہیں۔"

"آپ ایسا کیوں کرنا چاہتے ہیں؟"

"ہم دولت سے کھیلتے ہیں اس لیے ہمارا داماد کم سے کم ارب پتی ہوگا۔"

"یعنی آپ بابا سائیں کے دل کی زبان بول رہے ہیں؟"

"ذرا عقل سے سوچو۔ جوانی کے بہترین لمحات جیل میں نہ گزارو۔ اپنے باپ کی دولت اور جائیداد کے وارث بنو۔ ہم ابھی تمہیں یہاں سے رہائی دلائیں گے۔"

"میری ماں جی کا حکم ہے کہ رشوت سے یا کسی ناجائز طریقے سے ملنے والی آزادی قبول نہ کروں۔"

"تمہاری ماں ایک گھٹیا قسم کی عورت ہے۔"

سچل نے یکبارگی پاس کھڑے ہوئے سیکیورٹی افسر کی کلاشنکوف ایک جھٹکے سے چھین لی۔ افسر ایسے اچانک حملے کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کا ایک الٹا ہاتھ کھا کر لڑکھڑاتے ہوئے پیچھے چلا گیا پھر وہ سنبھل کر اس پر جھپٹنا چاہتا تھا کہ سچل نے پیر شاہ سلطانی کو نشانے پر رکھتے ہوئے کہا۔ "کسی نے بھی میرے قریب آنے یا مجھے نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو پیر شاہ سلطانی کی موت کا سبب بنے گا اور تم نے......... تم نے میری ماں جی کی شان میں گستاخی کی۔ اپنے الفاظ واپس لو اور میری ماں کو سلام کرو۔"

انسپکٹر اور سپاہی بہت کچھ کر سکتے تھے لیکن پیر شاہ صاحب کو زندہ سلامت رکھنے کے لیے انہیں اپنی اپنی جگہ بتوں کی طرح ساکت رہنا پڑا‘ ان سب کے برعکس شانی تیزی سے آگے بڑھ کر اپنے نانا جان کے سامنے ڈھال بن گئی۔ اس نے اشاروں کی زبان میں سچل سے پوچھا۔ "یہ کیا کر رہے ہو؟"

سچل نے انسپکٹر سے کہا۔ "اسے لکھ کر دو کہ اس کے نانا نے میری ماں کی شان میں

گستاخی کی ہے۔ یہ معافی مانگیں اور ماں جی کو سلام کریں ورنہ پہلے ڈھال بننے والی مرے گی پھر اس کا نانا۔ اپنی ماں کو گھٹیا قسم کی پاگل عورت کہنے والے کی موت پر مجھے اطمینان ہوگا لیکن محبوبہ کی موت کو میں کبھی نہیں بھولوں گا۔ اس کے بعد کسی سے شادی نہیں کروں گا۔"

انسپکٹر نے اس کے کہنے کے مطابق وہی باتیں لکھیں پھر اسے شانی کو دیا۔ اس نے پڑھنے کے بعد نانا کی طرف گھوم کر وہ تحریر انہیں پڑھوائی پھر اشاروں میں گستاخی کے لفظ پر انگلی رکھ کر پوچھا۔ "آپ نے گستاخی کیوں کی؟"

ریسیور کان سے لگا ہوا تھا۔ سائیں رب راکھن پوچھ رہا تھا۔ "وہاں کیا ہو رہا ہے۔ مجھے دھیمی دھیمی آوازیں آ رہی ہیں۔"

انہوں نے کہا۔ "تم اپنے بیٹے کو جیل میں رکھ کر مجرم بنانا چاہتے تھے۔ تمہارے لیے خوش خبری ہے کہ اس نے کلاشنکوف پکڑ لی ہے۔ جرم کی نوعیت بھیانک ہوگی۔ یہ پہلا قتل کرے گا اور ہمیں قتل کرے گا۔"

سائیں نے فون پر چیخ کر کہا۔ "نہیں۔ آپ اسے ریسیور دیں۔ میں اس گدھے کو سمجھاؤں گا کہ آپ پر کوئی انگلی اٹھانے کی جرأت نہیں کرتا ہے اور اس نے بندوق اٹھانے کی حماقت کی ہے۔"

"تمہارے بیٹے کو یہ ریسیور دینا ضروری نہیں ہے۔ ہم اس سے کہہ دیتے ہیں کہ اس بچے نے کسی نہ کسی مافیا کے گاڈفادر کا ذکر سنا ہوگا۔ آج سامنا کر رہا ہے۔ اسے معلوم ہو جائے گا کہ نہ ہم الفاظ واپس لیتے ہیں' نہ کسی عورت کو سلام کرتے ہیں۔ صرف اپنے جاں نثاروں کو حکم دیتے ہیں کہ اسے ایک فائر کی سلامی دو۔"

سچل نے خطرہ محسوس کیا۔ چونکہ کبھی مجرمانہ زندگی نہیں گزاری تھی اس لیے جان نہیں سکا کہ چند لمحات کے بعد کیا ہوگا؟

ان کا صرف ایک سیکیورٹی افسر نہیں تھا۔ دوسرے بھی مسلح گارڈز تھے جو کمرے سے باہر تھے۔ ایک گارڈ میز پر چڑھ کر روشندان تک پہنچ گیا تھا۔ اس نے وہاں سے نشانہ لیا پھر ایک فائر کی سلامی دی۔ اس کے ساتھ ہی سچل کے حلق سے کراہ نکلی۔ کلاشنکوف



ہاتھ سے چھوٹ گئی اور وہ زخمی بازو کو تھام کر فرش پر گر پڑا۔

سیکیورٹی افسر نے کلاشنکوف اٹھا کر اس کے دوسرے بازو کو بھی زخمی کرنا چاہا مگر اس سے پہلے ہی شانی روتی ہوئی' چیختی ہوئی دوڑ کر آئی پھر سچل کے اوپر اوندھے منہ چھا گئی۔ پہلے نانا کو بچا رہی تھی اب محبوب کے لیے ڈھال بن گئی تھی۔

انہوں نے قریب آ کر نواسی کا ایک ہاتھ پکڑ کر اسے سچل کے پاس سے ہٹنے کا اشارہ کیا۔ اس نے انکار میں سر ہلایا پھر ہاتھ چھڑا کر دوبارہ ڈھال بن گئی۔ انہوں نے لکھا۔ "شانی! ہمیں موت کی دھمکی دینے والا زندہ نہیں رہتا لیکن ہم سائیں رب راکھن سے دوستانہ تعلقات رکھنا چاہتے ہیں اس لیے سچل کی جان نہیں لی جائے گی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے کلاشنکوف اٹھائی تھی لہٰذا اس کا دوسرا بازو بھی زخمی کیا جائے گا۔"

اس کے ایک بازو میں پہلی گولی پیوست ہو گئی تھی۔ ایسی اذیت ناک تکلیف ہو رہی تھی جسے وہ بڑی قوت ارادی سے برداشت کر رہا تھا۔ اس کے باوجود بے ہوشی طاری ہو رہی تھی۔ اس نے بڑے کرب سے شانی کو دیکھا پھر اس کا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔ آنکھیں بند ہو گئیں۔ شانی نے چیخ مار کر اس کے سینے سے کان لگا کر دل کی دھڑکنیں سننا چاہیں۔ وہ زندہ تھا مگر دل بڑی سستی اور نقاہت سے دھڑک رہا تھا۔

وہ ایک جھٹکے سے کھڑے ہو کر اشاروں کی زبان سے بولی۔ "کوئی گولی نہ چلائے۔" پھر اس نے چھت کے پنکھے کی طرف اشارہ کرنے کے بعد دونوں ہاتھوں سے اپنے گلے کو دبایا۔ یہ سمجھایا کہ سچل کو مزید گولی ماری جائے گی تو وہ بھی گلے میں پھندا ڈال کر چھت کے پنکھے سے لٹک جائے گی۔ یہاں مرنے سے روکا جائے گا تو اسے کہیں نہ کہیں جا کر خودکشی کرنے کا موقع ضرور ملے گا۔

اس کے نانا نے ایک ہاتھ اٹھا کر اونچی آواز میں کہا۔ "کوئی گولی نہ چلائے۔ یہ بڑی ضدی ہے۔ ہم اسے زندہ رکھنے کے لیے چوبیس گھنٹے پہرا نہیں دے سکیں گے۔ یہ کسی وقت بھی جان پر کھیل جائے گی۔"

شانی نے کاغذ پر لکھا۔ "اسے فوراً اسپتال پہنچاؤ اور اس کے بازو سے گولی نکالو۔ ابھی فوراً آپریشن ہونا چاہیے۔"

یہ لکھ کر وہ ٹیلی فون کے پاس آئی پھر نمبر ڈائل کرنے لگی۔ انسپکٹر نے کہا۔ "جناب عالی! آپ کی نواسی گونگی بہری ہے۔ فون پر کیسے بولے گی' کیسے سنے گی؟"

دوسری طرف اپنے پاپا صداقت سے رابطہ ہو گیا۔ وہ فون پر گونگی آوازیں سن کر سمجھ رہا تھا کہ بیٹی کسی بھی طریقے سے اپنی بات کہے گی۔

گونگی نے سچل کو فوراً اسپتال پہنچانے کے بارے میں جو کچھ لکھا تھا اس کاغذ کو انسپکٹر کے ہاتھ میں دیا اور دوسرے ہاتھ میں فون کا ریسیور تھما دیا۔ اس نے پوچھا۔ "ہیلو! کیا یہ اسپتال ہے؟"

صداقت نے کہا۔ "میں انٹیلی جنس کا ڈائریکٹر جنرل صداقت علی ہوں۔ تم کون ہو؟ جلدی بتاؤ' ہری اپ............"

انسپکٹر نے ایڑیاں بجاتے ہوئے سلیوٹ کیا' پھر کہا۔ "سر! میں انسپکٹر نثار احمد نثار بول رہا ہوں۔ آپ کی صاحب زادی خیریت سے ہیں۔ یہاں ایک جوان قیدی کے بازو میں گولی ماری گئی ہے۔ ایسا نہ کیا جاتا تو یہ جوان آپ کے سسر صاحب کو گولی مار دیتا۔ اب آپ کی صاحب زادی ضد کر رہی ہیں کہ زخمی جوان کو فوراً اسپتال پہنچا کر اس کے بازو سے گولی نکالی جائے۔ یہ نادان ہیں' اپنے نانا کے دشمن کو بچانا چاہتی ہیں۔"

"یو شٹ اپ۔ جو میری بیٹی نے لکھ دیا اس پر فوراً عمل کرو۔ پندرہ منٹ کے اندر قریبی اسپتال میں پہنچا کر فوراً آپریشن کے انتظامات کراؤ۔ وہاں میرا ایک ماتحت پہنچ رہا ہے۔ وہ تمہاری کارکردگی دیکھے گا۔ اگر اس نے کوئی کوتاہی دیکھی تو تمہاری وردی اتروا لوں گا۔ جلدی کرو اور فون پیر شاہ سلطانی صاحب کو دو۔"

انسپکٹر پیر شاہ سلطانی کو ریسیور دیتے ہوئے بولا۔ "آپ کے داماد ڈائریکٹر جنرل گفتگو کریں گے۔"

وہ ریسیور رکھ کر سپاہیوں کو حکم دینے لگا۔ وہ سچل کو ایک اسٹریچر پر ڈال کر باہر کھڑی ہوئی پولیس وین میں اسے لے جانے لگے۔ ادھر پیر شاہ سلطانی نے کان سے ریسیور لگا کر انتظار کیا۔ جب آواز نہیں آئی تو انہوں نے کہا۔ "ہیلو! ہم بول رہے ہیں۔"

صداقت نے کہا۔ "میں نے یہی فقرہ سننے کے لیے خاموشی اختیار کی تھی۔ آپ



ایسے رعب اور دبدبے سے کہتے ہیں کہ سننے والوں پر دہشت طاری ہو جاتی ہے۔"

"بکواس مت کرو' کام کی باتیں کرو۔"

"کام کی باتیں تو رئیس ہمدانی وغیرہ نے سنا دی ہوں گی............ فی الحال یہ بتا دیں کہ میری بیٹی تھانے میں کیوں آئی ہے؟"

"تمہاری طرح صاحب زادی کا دماغ چل گیا ہے۔ اس نے صاف طور سے لکھ کر اعتراف کیا ہے کہ وہ اس زخمی جوان سے متاثر ہو گئی ہے۔ اس کا مطلب تو یہی ہے کہ اس سے عشق کرنے لگی ہے۔"

"وہ جوان کون ہے؟"

"اس کا نام سچل نواز ہے۔ وہ سائیں رب راکھن کا بیٹا ہے۔ تم اسے یقیناً جانتے ہو گے۔"

"میں آپ جیسے پیر اور اس جیسے سائیں وڈیروں کی پوری ہسٹری جانتا ہوں۔ فی الحال کچھ جاننے کے لیے رہ گیا ہے تو مزید معلومات اس لیے حاصل کروں گا کہ میری بیٹی اس جوان کو چاہتی ہے۔"

"صرف بیٹی کی پسند نہ دیکھو' یہ بھی سن لو کہ وہ نیویارک جا کر ایک ہوٹل میں پلیٹیں صاف کرتا تھا۔"

"ایک ارب پتی وڈیرے کا بیٹا کسی ہوٹل میں ملازمت کرتا تھا تو ضرور کوئی مصلحت ہو گی۔"

"مصلحت کیا ہو سکتی ہے۔ باپ لاکھوں روپے بھیجتا رہا ہو گا اور بیٹا عیاشی میں اڑا کر باقی اخراجات پورے کرنے کے لیے دوسروں کے جھوٹے برتن صاف کرتا رہا ہو گا۔"

"آپ کی باتیں درست ہو سکتی ہیں۔"

"ہو سکتی ہیں نہیں' سو فی صد درست ہیں۔ کسی کے بارے میں میری رائے غلط نہیں ہو سکتی۔"

"آپ بہت خوش فہم ہیں۔ غلطی تو ہر انسان سے ہوتی ہے۔ کیا آپ میرے متعلق کوئی رائے قائم کر کے جو خفیہ معاملات طے کرتے ہیں اس سلسلے میں یہ حقیقت

سامنے نہیں آتی کہ آپ نے مجھے سمجھنے میں غلطی کی تھی۔"

"تم نے قرض نادہندگان کی جعلی فائلوں کے ذریعے دھوکا دیا۔ ہم نے وقتی طور پر دھوکا کھالیا۔ اب ہماری جوابی کارروائی بہت مہنگی پڑے گی۔ ہم نے تمہارے خلاف ایک ایسا ٹھوس ثبوت حاصل کیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ تم اسکاٹ لینڈ یارڈ سے برطانوی حکومت کے ایک خاص مشن پر آئے ہو اور یہاں محب وطن پاکستانی کی حیثیت سے حکومت کو مطمئن کر رہے ہو اور ہمارے جیسے گاڈفادر کے لیے عذاب بن رہے ہو۔"

"یہ میرے لیے نئی بات ہے کہ میں برطانوی حکومت کا خفیہ ایجنٹ ہوں۔ میرے خلاف جو ٹھوس ثبوت آپ کے پاس ہے اسے آپ نے ایسی جگہ چھپایا ہوگا جہاں میرے ہاتھ پہنچ سکتے ہیں اور نہ ہی میری ذہانت کی اڑان۔"

"ہاں۔ ہم اپنی بیٹی ہاجرہ کی محبت سے مجبور ہیں۔ اس سے تمہارا رشتہ نہ ہوتا تو ہم اس ثبوت کے ذریعے تمہیں ایک ملک دشمن ثابت کر چکے ہوتے۔"

"آپ نے اس ٹھوس ثبوت کو ایسی جگہ چھپایا ہے جہاں آپ کے اپنے بیٹے بھی نہیں پہنچ سکتے۔ آپ کے پاس ایک ایسا آئرن سیف ہے جسے کوئی کھول نہیں سکتا۔ کھولنا تو دور کی بات ہے آپ کے بیٹے بھی آپ کی خواب گاہ میں اجازت کے بغیر قدم نہیں رکھ سکتے۔ آپ کی ڈائری میں سیف کا مخصوص نمبر ہے۔ اس نمبر سے بھی وہ سیف نہیں کھل سکتا۔"

انہوں نے طنزیہ ہنسی کے ساتھ کہا۔ "اچھا تو ہمارے کسی باغی بیٹے سے مل کر آئرن سیف کے بارے میں اتنی معلومات حاصل کی ہیں۔ یہ معلومات یہیں تک رہیں گی، تم نہ کبھی ہماری خواب گاہ میں پہنچ سکو گے اور نہ ہی اپنی تمام ذہانت سے اس سیف کو کبھی کھول سکو گے۔"

"ہمارے ملک میں ساس بہو کے جھگڑوں کی کہانیاں اور لطیفے عام ہیں لیکن سسر داماد کے درمیان جھگڑے شاید کم ہوتے ہیں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں بھی ہاجرہ جیسی شریک حیات کی محبت کی وجہ سے آپ کو ڈھیل دیتا ہوں اور شاید اس لیے بھی ڈھیل دیتا ہوں کہ آپ وسیع ذرائع اور اختیارات کے مالک ہیں۔ آپ کی سزا یہی ہے کہ آپ



میرے ملک کو نقصان پہنچانے کے معاملے میں میرے ہاتھوں شکست کھاتے رہیں لیکن خود مجھے کبھی شکست نہ دے سکیں۔ میرے خلاف ٹھوس ثبوت تو اُس وقت ہوگا جب میں بکاؤ مال بن جاؤں گا۔"

"کیا تم جھوٹ سمجھ رہے ہو۔ وہ ٹھوس ثبوت ہم نے آئرن سیف میں چھپا رکھا ہے۔"

"جناب جھوٹے پیر صاحب! اس سیف میں ہیرے اور موتیوں سے جڑی ہوئی ایک رحل ہے۔ اس رحل میں ایک قرآن مجید ہے اور قرآن مجید سونے کی تاروں سے لکھا ہوا ہے۔ رحل کے پاس عدن کے بیش قیمت پتھروں سے بنی ہوئی ایک تسبیح ہے اور ایک چھوٹے سے کیسٹ ریکارڈر میں آپ کی آواز کا کیسٹ ہے۔"

پیر عظمت اللہ شاہ سلطانی کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ انہوں نے کہا۔ "دنیا کے تمام دولت مند آئرن سیف میں نقد رقم، ہیرے موتی جواہرات اور اہم دستاویزات رکھتے ہیں۔ ہم نے اس میں صرف بیٹی کی محبت رکھی ہے اور یہ بات ابھی تک بیٹی کو بھی نہیں بتائی ہے۔ تمہیں کیسے معلوم ہوگیا؟"

"میں نے آپ کی کوٹھی کی تلاشی لینے کے لیے کئی بار سرچ وارنٹ حاصل کرنے کی کوششیں کی لیکن اوپر والوں سے کبھی اجازت نہیں ملی۔ تب میں نے آپ کی خالی کوٹھی سے فائدہ اٹھایا۔ بیٹے بہو، پوتے پوتی چلے گئے۔ شانی سنی کو رخصت کرنے ایئرپورٹ گئی تھی۔ سیکیورٹی افسر اور کئی گارڈ ان کے ساتھ تھے۔ میں جعلی سرچ وارنٹ آپ کے بقیہ گارڈز کو دکھا کر آپ کے بیڈروم پہنچ گیا اور جو سیف کھولنا آپ دوسروں کے لیے ناممکن سمجھتے ہیں اسے کھول کر جو کچھ دیکھا وہ آپ کے گوش گزار کر دیا۔ وہاں ایک گاڈفادر کا اپنی بیٹی سے ایماندارانہ پیار ہے لیکن میرے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے۔ آئندہ مجھ پر دباؤ ڈالنے کے لیے آپ کسی دوسرے سیف میں میرے خلاف ثبوت رکھنے کا شوشہ چھوڑ سکتے ہیں۔"

وہ گرج کر بولے۔ "تم.......... تم نے ہماری خواب گاہ میں پہنچنے کی جرأت کی؟ ہمارا وہ سیف کھول لیا؟ تم حد سے بڑھ چکے ہو۔ اب ہم تمہارے ساتھ سختی کریں گے۔

تمہیں داماد کی حیثیت سے زندہ رکھیں گے مگر تم اپاہج بن کر رہو گے۔"

"ہاں۔ اسی طرح گرج کر اونچی آواز میں بولتے رہیں۔ میں اپنے ہر فون کی گفتگو ٹیپ کرتا ہوں۔ آپ کا یہ دعویٰ بھی ریکارڈ ہو چکا ہے کہ آئندہ آپ مجھے اپاہج داماد بنائیں گے اور ابتدائی گفتگو میں قرض نادہندگان والی باتیں بھی ٹیپ میں محفوظ رہیں گی۔"

یہ سنتے ہی انہوں نے ریسیور کو کریڈل پر پٹخ دیا۔ وہ غصے میں تھے مگر غصے سے زیادہ حیرانی تھی کہ صداقت کو آئرن سیف کھولنے کا راز کیسے معلوم ہو گیا؟ اگرچہ اس سیف میں ایک گاڈ فادر کی کوئی کمزوری موجود نہیں تھی۔ صرف ایک بیٹی کے لیے باپ کا پیار تھا اور اس پیار کا انداز بیٹی کو ابھی تک نہیں بتایا گیا تھا ورنہ یہی شبہ ہوتا کہ بیٹی نے صداقت کو ایک بیوی کی حیثیت سے یہ سب کچھ بتا دیا ہے۔

پھر........ پھر وہ چالباز سیف کے اندر تک کیسے پہنچ گیا؟ انہوں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ شانی نظر نہیں آئی۔ وہ اس پر شبہ نہیں کر سکتے تھے کیونکہ اس کے سامنے بھی سیف کو کھولا نہیں تھا۔ صرف اس کا نمبر ڈائری میں لکھا تھا۔ وہ یہ سمجھ ہی نہیں سکتی تھی کہ سیف کا کھلنے والا اصلی پٹ دیوار کی طرف لگا ہوا ہے اور سامنے جو پٹ اور لاک ہے وہ محض دوسروں کو دھوکا دینے کے لیے نمائشی طور پر بنوایا گیا ہے اور جس کاریگر نے وہ سیف بنایا تھا' وہ مر چکا تھا۔ اس طرح انہوں نے سب کے لیے اس سیف کو بہت پُراسرار بنا دیا تھا۔ اب یہی بات کھٹک رہی تھی کہ اس اسرار کو داماد نے کیسے سمجھ لیا ہے؟

★============★============★

بیگم ریحانہ برکت' رحمت شاہ سلطانی اور اس کی بیگم سلمیٰ پیٹ بھر کر کھانے کے بعد دوسرے گاڈ فادر حمزہ بیگ کی ایک خفیہ رہائش گاہ سے چلے آئے تھے۔ حمزہ بیگ نے وعدہ کیا تھا کہ وہ صبح تک برکت کو تھانے سے لے آئے گا اور یہ خوش خبری سنائی تھی کہ اس گونگی بہری کو اغوا کر کے اس کے نانا کو کانٹوں کے بستر پر کروٹیں بدلتے رہنے پر مجبور کیا جائے گا۔

برکت شاہ سلطانی اور رحمت شاہ سلطانی کی کوٹھیاں الگ الگ تھیں۔ دونوں بھائی ایک دوسرے کے پڑوسی تھے۔ رات زیادہ گزرنے کے باوجود رحمت شاہ اور اس کی بیگم



سلمیٰ رحمت اپنی کوٹھی میں نہیں گئے تھے۔ وہ اپنی ریحانہ بھابی کو تنہا چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔

روبی کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ اس سے اندازہ ہوا تھا کہ وہ سو رہی ہے۔ جمشید اکثر رات کو دیر سے آتا تھا۔ ان کے بزرگ ڈرائنگ روم میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ریحانہ نے کہا۔ "اگرچہ انکل گاڈ فادر نے برکت کی رہائی کا یقین دلایا ہے پھر بھی نیند نہیں آ رہی ہے۔"

بیگم سلمیٰ رحمت نے کہا۔ "مجھے تو اس خوشی میں نیند نہیں آ رہی ہے کہ ابھی ایک آدھ گھنٹے میں اس گونگی کو اغوا کر لیا جائے گا۔"

ریحانہ نے کہا۔ "سچ پوچھو تو مجھے برکت کی فکر بھی ہے اور گونگی کے کہیں مر کھپ جانے کی خوشی بھی ہے۔ وہ مر جائے یا اس کے ساتھ ایسا سلوک ہو کہ وہ اور اس کے نانا کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں۔"

رحمت شاہ سلطانی نے کہا۔ "بھابی! آپ نے گاڈ فادر حمزہ بیگ کی بیٹی بن کر ابا حضور کے خلاف زبردست مورچہ بنایا ہے۔ بس ایک کام اور ہو جائے۔ ابا حضور کے پاس ہمارے خلاف چند دستاویزی ثبوت ہیں۔ ان تمام ثبوتوں کو کسی طرح حاصل کر کے جلا دیا جائے۔"

ریحانہ نے کہا۔ "تمہارا وہ بڈھا باپ یہی کانٹے ہمیں چبھو رہا ہے۔ انکل حمزہ بیگ نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ تم دونوں بھائیوں کے خلاف جتنے ثبوت ہیں' انہیں وہ کسی طرح حاصل کریں گے۔ اس کے بعد وہ بڈھا نہ دباؤ ڈالنے والا باپ رہے گا' نہ دھمکیاں دینے والا گاڈ فادر۔ ہم سب انکل حمزہ بیگ کے سائے میں محفوظ رہیں گے۔"

"ایک اندیشہ تھا کہ ہم بھائی جان کو ابا حضور کے بچھائے جال سے نکال کر لے آئیں گے اور انکل حمزہ بیگ کا تعاون حاصل کریں گے تو وہ ہمارے خلاف دوسری کارروائی کریں گے مگر انکل حمزہ بیگ ان سے زیادہ چالاک ہیں۔ وہ اس گونگی کو اغوا کرا لیں گے تو ابا حضور کی تمام توجہ اپنی نواسی کو واپس لانے پر رہے گی اور وہ ہمارے خلاف قدم نہیں اٹھا سکیں گے۔"

اچانک کال بیل کی آواز سنائی دی۔ ریحانہ نے کہا۔ "شاید جمشید آیا ہے۔"

رحمت شاہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ڈرائنگ روم کے باہر گیا پھر ایک کاریڈور سے گزر کر دروازے کے قریب آ کر اونچی آواز میں پوچھا۔ "کون ہے؟"

"میں ہوں تمہارا بھائی برکت........."

رحمت نے جلدی سے دروازہ کھول کر بھائی کو دیکھتے ہوئے خوشی سے بلند آواز میں کہا۔ "بھابی جان! جلدی آیئے' بھائی جان آ گئے ہیں۔"

برکت اندر آیا۔ دونوں بھائی گلے مل گئے۔ ریحانہ اور سلمیٰ تیزی سے چلتی ہوئی وہاں آئیں۔ ریحانہ نے برکت کے بازوؤں کو خوشی سے تھام کر کہا۔ "دیکھا آپ نے میرے انکل کا کمال۔ انہوں نے صبح نہیں ہونے دی اور آپ کو تھانے سے گھر بھیج دیا۔"

برکت نے خاموشی اور سنجیدگی سے اپنی بیگم کو دیکھا پھر ان کے ساتھ چلتے ہوئے بولا۔ "مجھے رنگے ہاتھوں نشیلی اور دو نمبر دواؤں کے ذخیرے کے ساتھ گرفتار کیا گیا تھا۔ وہاں ایک مجسٹریٹ بھی موجود تھا۔ ایسی صورت میں کوئی مجھے رہائی نہیں دلا سکتا تھا۔"

ریحانہ نے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں' کوئی آپ کو رہائی نہیں دلا سکتا تھا؟ پھر کیا آپ پولیس کسٹڈی سے فرار ہو کر آئے ہیں؟"

وہ ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "مجھے ابا حضور نے رہائی دلائی ہے۔"

ان سب نے چونک کر اس کی طرف دیکھا پھر ریحانہ نے پوچھا۔ "آپ نے ان کی طرف سے رہائی کیوں قبول کی۔ میرے انکل حمزہ بیگ آپ کو صبح تک لے آتے۔"

"صبح تک اخبارات کے رپورٹرز اور فوٹوگرافرز بھی پہنچ جاتے پھر شام کے اخبارات میں ایک مجرم کی حیثیت سے میری تصویریں شائع ہو جاتیں۔ میری بدنامی سے انکل حمزہ بیگ کا کیا بگڑتا۔ انہیں تو خوشی ہوتی کہ ہم باپ بیٹے کی عزت خاک میں مل رہی ہے۔"

"کیا بات ہے؟ جس باپ کا گھر چھوڑ دیا اس کے حق میں بول رہے ہیں۔"

"تم سب خود ہی غور کرو اور سمجھو۔ کیا ابا حضور ایسے نادان ہیں کہ اپنے نام پر اور



اپنے خاندان کے نام پر کیچڑ اچھالنے کے لیے مجسٹریٹ کے ساتھ پولیس ٹیم کو میری فیکٹری میں مال پکڑنے کے لیے بھیجیں گے؟"

ریحانہ نے کہا۔ "انہیں اپنی عزت کا خیال ہو گا۔ کئی دنوں سے بیٹی لاپتا ہے مگر وہ زیادہ پریشان نہیں ہیں۔ آپ کے لیے بھی پریشان نہ ہوتے۔ جب آپ کہتے ہیں کہ کوئی رہائی نہیں دلا سکتا تو پھر انہوں نے کیسے دلا دی؟"

"ابا حضور کے ذرائع اور ہتھکنڈوں کو سمجھنا مشکل ہے۔"

"ایک مجسٹریٹ کی موجودگی میں مال برآمد ہوا اور آپ کو گرفتار کر لیا گیا۔ مجسٹریٹ نے آپ کے خلاف سخت رپورٹ لکھی ہو گی۔ انکل حمزہ بیگ نے کہا تھا کہ آپ کے بچاؤ کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ یہ ثابت کر دیا جائے کہ وہ فیکٹری میرے نام تھی اور آپ وہاں کے منتظم تھے پھر میں نے چھ ماہ پہلے اسے فروخت کر دیا تھا۔ جس شخص نے اسے خریدا تھا وہی نشیلی اور دو نمبر کی دوائیں اس فیکٹری میں تیار کرتا تھا لیکن چھاپا پڑنے سے پہلے ہی وہ فرار ہو گیا۔ مجسٹریٹ اور پولیس اس سے لاعلم تھی۔ انہوں نے میری فیکٹری کا منتظم سمجھ کر آپ کو گرفتار کر لیا تھا۔"

"ہاں' اس طرح مصیبت اور بدنامی سے ہم بچ جاتے۔ یہ اچھی تدبیر تھی۔ چلو اچھا ہے فیکٹری کسی کے نام لکھنے کی ضرورت نہیں پڑی اور میں نے وہاں سے رہائی پا لی۔"

"یہی تو میں کہہ رہی ہوں۔ آپ نے باپ کا احسان کیوں لیا؟ میں تو اس فیکٹری کو فروخت کرنے کے کاغذات لکھ کر انکل حمزہ بیگ کو دے چکی ہوں۔ انکل حمزہ بیگ صبح تک ان کاغذات کو دکھا کر ثابت کر دیں گے کہ آپ کو غلط فہمی میں گرفتار کیا گیا تھا۔"

برکت شاہ نے کہا۔ "یہ تم نے کیا حماقت کی۔ میری فیکٹری فروخت کر دی۔ جہاں سے لاکھوں روپے کی آمدنی ہوا کرتی تھی اس جگہ کو دوسرے کے نام کر دیا؟ اب یہ ہر ماہ لاکھوں روپے کہاں سے آئیں گے؟"

"آپ فکر نہ کریں۔ انہوں نے مجھے بیٹی بنایا ہے۔ وہ کاغذات واپس کر دیں گے۔ فیکٹری پھر ہماری ہو جائے گی۔"

"دیکھو' یہ لاکھوں روپے کی آمدنی کا معاملہ ہے۔ تم ابھی ان سے فون پر بات کرو۔"

میری رہائی کی خوش خبری سنا دو اور کہہ دو کہ صبح اپنی فیکٹری کے کاغذات لینے آ رہی ہو۔"

اس نے فون کے ذریعے رابطہ کیا۔ دوسری طرف سے آواز آئی۔ "ہیلو، فرمائیے۔"

"میں بیگم ریحانہ برکت بول رہی ہوں۔ انکل حمزہ بیگ سے بات کرنا چاہتی ہوں۔"

"بیگم صاحبہ! وہ موجود نہیں ہیں۔ آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟ میں وہی خاکسار احمد علی ہوں جس کو آپ نے کوئی رقم لیے بغیر فیکٹری فروخت کی ہے۔ اب میں آپ کے شوہر کو بے قصور اور نہایت شریف انسان ثابت کرنے کے لیے خود مجرم بن کر اپنے گاڈفادر کی خفیہ رہائش گاہ میں روپوش ہو گیا ہوں۔"

وہ بولی۔ "یہ اچھا ہوا کہ تم سے بات ہو گئی۔ اب تمہیں روپوش رہنا نہیں پڑے گا۔ برکت کے والد صاحب نے یہ کیس ختم کرا دیا ہے۔ برکت رہا ہو کر آ گئے ہیں۔ انکل آئیں تو کہہ دینا میں صبح فیکٹری کے کاغذات لینے آؤں گی۔"

"بیگم صاحبہ! گاڈفادر وہ کاغذات سٹی کورٹ کے ایک جج کے پاس لے گئے ہیں۔ ان کاغذات سے جیسے ہی ثابت ہو گا کہ آپ فیکٹری کی مالک اور برکت شاہ صاحب منتظم نہیں تھے تو صبح جج صاحب کی طرف سے غلط فہمی کی نشاندہی کر دی جائے گی۔ ان کاغذات سے اصلی مجرم مجھے ہی ثابت کیا جائے گا اور برکت صاحب کو باعزت بری کیا جائے گا۔"

برکت، رحمت اور سلمیٰ فون کے اسپیکر سے باتیں سن رہے تھے۔ برکت نے بیوی کے ہاتھ سے ریسیور لے کر کہا۔ "میں برکت شاہ سلطانی بول رہا ہوں۔ رہائی پا کر گھر آ گیا ہوں۔ تم گاڈفادر سے فوراً رابطہ کر کے فیکٹری کے کاغذات واپس منگوا لو۔"

"یہ تو میرے حق میں بہتر ہو گا۔ نہ مجرم کہلاؤں گا اور نہ مجھے روپوش رہنا پڑے گا لیکن گاڈفادر یہ کہہ گئے تھے کہ فیکٹری کے کاغذات کی ایک نقل اس مجسٹریٹ کو بھی دیں گے جس نے آپ کو گرفتار کیا تھا۔ مجسٹریٹ ان کاغذات کو دیکھنے کے بعد آپ کے حضور سے لی ہوئی رشوت واپس کر دے گا اپنی رپورٹ بدل کر لکھے گا کہ آپ غلط فہمی میں گرفتار کیے گئے تھے۔"

"تم یہ بتاؤ کہ فوری طور پر کیا کیا جا سکتا ہے؟"

"جناب! اصل کاغذات جج صاحب کے گھر پہنچ چکے ہوں گے اور ان کی ایک نقل پولیس موبائل میں جانے والے مجسٹریٹ کو مل چکی ہو گی۔ آپ گھڑی دیکھیں۔ رات کے دو بج چکے ہیں۔ اتنی رات کو صرف ہمارے گاڈفادر ہی کسی جج کے گھر جا کر اسے جگا سکتے ہیں اور آپ کے حق میں کارروائی کر سکتے ہیں بلکہ کارروائی ہو چکی ہو گی۔ اب اس سلسلے میں گاڈفادر سے صبح کسی وقت بات ہو سکتی ہے۔"

برکت نے ریسیور کریڈل پر پٹخ کر کہا۔ "بیگم! تم نے مجھے ندامت اور بدنامی سے بچانے کے لیے بڑی عجلت میں فیکٹری دوسرے کے نام کر دی۔ کل صبح احمد علی فیکٹری کا اصلی مالک اور مجرم ثابت ہو گا تو پھر اس فیکٹری میں ہم قدم نہیں رکھ سکیں گے۔"

اس نے کچھ سوچا پھر ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کیے۔ رابطہ قائم ہونے پر آواز آئی۔ "ہیلو! ہم بول رہے ہیں۔"

"ابا حضور! میں برکت شاہ سلطانی بول رہا ہوں۔"

"ہمیں ابا حضور نہ کہو' صرف کام کی باتیں کرو۔"

"جی۔ وہ ایک گڑبڑ ہو گئی ہے۔ ریحانہ نے مجھے قانون کے شکنجے سے نکالنے کے لیے چھ ماہ پہلے کی تاریخ میں وہ فیکٹری دوسرے کے نام لکھ دی ہے۔ اس طرح وہ دوسرا شخص فیکٹری کا مالک اور مجرم بن کر روپوش ہو گیا ہے۔ گاڈفادر حمزہ بیگ نے وہ کاغذات ایک جج کو پہنچا دیے ہیں۔ ان کی نقل اس مجسٹریٹ کو بھی دی ہے جس نے پولیس موبائل کے ساتھ آ کر مجھے گرفتار کیا تھا۔"

دوسری طرف سے باپ نے کہا۔ "واہ کیا تیزی دکھائی ہے۔ وہ بھی ہمارے دشمن کے مشورے پر۔ اب یہ بتاؤ کہ اپنے دشمن کو ہم زیادہ سمجھتے ہیں یا تمہاری چہیتی شریک حیات؟"

"جی۔ آپ ہم سب سے زیادہ تجربہ کار ہیں۔"

"لیکن جو حماقت تمہاری بیوی نے کی ہے اس حماقت کو ہمارا تجربہ ذہانت میں نہیں

بدل سکے گا کیونکہ ہم نے ناجائز اختیارات کے ذریعے تمہیں رہائی دلائی تھی۔ وہ دشمن گاڈفادر قانونی طور پر وہ فیکٹری دوسرے کے نام کر کے تمہیں ایک شریف اور باعزت شہری ثابت کرے گا۔ ہم اس فیکٹری کی فروخت کے کاغذات کو غلط ثابت نہیں کر سکیں گے لہٰذا صبر کرو۔ تمہاری شریک حیات نے دشمن کی چال میں آ کر تمہیں شریف اور باعزت شہری تو بنا دیا لیکن ماہانہ لاکھوں روپے کی آمدنی کو خاک میں ملا دیا ہے۔"

"دیکھیے صبح نو بجے سے پہلے کورٹ کی طرف سے کارروائی نہیں ہو گی۔ ابھی ساڑھے چھ گھنٹے ہیں۔ آپ بہت کچھ کر سکتے ہیں۔"

"جب دو پہاڑ ٹکراتے ہیں تو تمہارے جیسے ذرے ان کے درمیان پس جاتے ہیں۔ تم کہتے ہو ابھی ساڑھے چھ گھنٹے کچھ کرنے کے لیے ہیں۔ ہم کہتے ہیں ساڑھے چھ منٹ بھی نہیں رہے۔ جس گاڈفادر نے آدھی رات کے بعد ایک جج جیسی شخصیت کو نیند سے جگایا ہو پھر تمہیں گرفتار کرنے والے مجسٹریٹ کو ہموار کیا ہو اور تھانے میں قانونی کارروائی کا سکہ جمایا ہو' اس کے لیے گھڑی کی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔ میرا تجربہ کہتا ہے کہ گاڈفادر حمزہ بیگ نے صبح نو بجے تک کا انتظار نہیں کیا ہے۔ تم جس تھانے سے آئے ہو' اسی تھانے کے انسپکٹر کو فون کرو اور معلوم کرو' کیا جعلی دوا سازی کے سلسلے میں کسی دوسرے مجرم کی نشاندہی ہو رہی ہے۔ اب فون نہ کرنا' ہم سونے جا رہے ہیں۔"

انہوں نے فون بند کر دیا۔ ریحانہ' سلمٰی اور رحمت فون کے اسپیکر کے ذریعے وہ تمام باتیں سن رہے تھے۔ ریحانہ نے ریسیور لے کر کریڈل پر ہاتھ رکھا پھر نمبر ڈائل کیا۔ رابطہ ہونے پر تھانے کے انسپکٹر کی آواز سنائی دی۔ ریحانہ نے کہا۔ "میں بیگم ریحانہ برکت بول رہی ہوں۔ چند گھنٹے پہلے میرے شوہر کو نشیلی اور جعلی دوا سازی کے جرم میں گرفتار کیا گیا تھا۔ کیا اس سلسلے میں میں اصلی مجرم کا سراغ ملا ہے؟"

"جی ہاں۔ ابھی ہمیں ایسے قانونی کاغذات ملے ہیں جن سے ثابت ہو گیا ہے کہ اس فیکٹری کا مالک احمد علی اصل مجرم ہے۔ ہم نے غلطی سے مسٹر برکت شاہ کو گرفتار کیا تھا۔ ہم آپ سے اور آپ کے شوہر سے شرمندہ ہیں۔ ہم پولیس والے بھی انسان ہیں' ہم سے بھی غلطیاں ہوتی ہیں۔"



ریحانہ نے ریسیور رکھ دیا۔ فون بند ہو گیا۔ سب کی زبانیں بھی بند ہو گئیں۔ اب کہنے کے لیے کیا رہ گیا تھا؟ گاڈفادر حمزہ بیگ سے یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ فیکٹری کی ملکیت کے کاغذات دوبارہ ریحانہ اور منتظم برکت شاہ سلطانی کے نام کر دیے جائیں۔

اگر ایسا کیا جاتا تو منتظم برکت شاہ پھر مجرم قرار دیا جاتا پھر اسے گرفتار کیا جاتا اور عدالت کے حکم کے مطابق اس فیکٹری کو سیل کر دیا جاتا۔ یوں ان کے ہاتھ کچھ نہ آتا۔ گاڈفادر حمزہ بیگ نے اپنی قانونی کارروائی کے ذریعے برکت شاہ کو شریف اور عزت دار ثابت کیا تھا لیکن ماہانہ لاکھوں روپے کی آمدنی ڈبو دی تھی۔

باپ نے بھی بیٹے کو رہائی دلائی تھی۔ اس رہائی کے بعد عزت اور شرافت بھی رہتی' فیکٹری بھی اپنی ہوتی اور وہ اس سے حاصل ہونے والے لاکھوں روپے سے محروم بھی نہ رہتے۔

برکت شاہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر ریحانہ سے بولا۔ "کچھ سمجھ میں آیا کہ اپنے اور پرائے میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ تم نے جس گاڈفادر کی بیٹی بن کر اسے اپنا بنایا ہے' اس نے ہمارے ساتھ آدھی نیکی کی ہے۔ ہماری شرافت اور عزت کو برقرار رکھا ہے مگر ہم سے لاکھوں روپے کی آمدنی چھین لی ہے۔ جس باپ کو ہم نے چھوڑا ہے۔ اس نے ہماری نیک نامی کے علاوہ ہماری لاکھوں روپے کی آمدنی بھی برقرار رکھی تھی۔"

"آپ غصہ نہ دکھائیں۔ یہ نہ بھولیں کہ اسی باپ نے پولیس کو فیکٹری میں بھیجا تھا اور گرفتار کرایا تھا۔"

"ریحانہ! عقل کے ناخن لو۔ مجھے اس طرح ذلیل کر کے میرا باپ کیا عزت والا رہ سکتا تھا۔ رشتے داروں میں جھگڑے ہوتے ہیں لیکن عزت والے آپس کے جھگڑوں کو چاردیواری تک رکھتے ہیں۔ انہیں باہر والوں کے سامنے تماشا نہیں بناتے۔"

"باپ نے حوالات سے رہائی کیا دلائی ہے کہ اب ان کی حمایت میں بولنے لگے ہو۔ یہ نہیں سوچتے کہ آپ کے دو نمبر کے دھندے کا علم انہیں تھا۔ انہوں نے مخبری کی۔ آپ کو گرفتار کرایا پھر اس سے پہلے کہ صبح ہو اور بدنامی پھیلے' انہوں نے یہ کیس ہی ختم کرا دیا اور تاثر یہ دے رہے ہیں کہ مخبری کسی دشمن نے کی تھی اور انہوں نے تھانے

پہنچ کر ایک باپ کا فرض ادا کیا ہے۔"

"مخبری کس نے کی، اس کا پتہ آج نہیں تو کل چل ہی جائے گا لیکن آج اتنا تو معلوم ہوا کہ تمہارے انکل حمزہ بیگ نے تمہارے سر پر شفقت کی چادر رکھ کر پیروں کے نیچے سے زمین کھسکا دی ہے۔ وہ فیکٹری ہمیں ہر ماہ سات لاکھ سے دس لاکھ تک کا منافع دیتی تھی۔"

"میں آپ سے بحث نہیں کروں گی۔ مجھ سے اتنے بڑے نقصان کا صدمہ برداشت نہیں ہو رہا ہے۔ ہائے اب ہم اپنا اسٹیٹس کیسے برقرار رکھیں گے؟ آپ کا کوئی دوسرا کاروبار نہیں ہے۔ ہم تو پیسے پیسے کے محتاج ہو جائیں گے۔"

رحمت شاہ نے کہا۔ "بھائی جان! ایسی باتیں نہ کریں۔ ابھی میرا کاروبار سلامت ہے۔ اسے آپ اپنا سمجھیں۔ بھائی جان میرے کاروبار میں اس وقت تک برابر کے شریک رہیں گے جب تک اپنا کوئی کاروبار اچھی طرح جم کر شروع نہیں کریں گے۔"

برکت شاہ نے چھوٹے بھائی کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "محبت کرنے والے بھائی تمہارے جیسے ہوتے ہیں اور برے وقت پر کام آتے ہیں لیکن جو حملہ مجھ پر ہوا ہے، وہ تم پر بھی ہو سکتا ہے۔ تم بھی تو اپنے کاروبار کی آڑ میں دو نمبر کا دھندا کرتے ہو۔ ہمیں جلد سے جلد معلوم کرنا ہوگا کہ یہ دشمنی کون کر رہا ہے۔"

"دشمنی میں دو باتیں ہوتی ہیں۔ دشمنی یا تو انتقاماً ہوتی ہے یا پھر دوسرے کا منافع خود حاصل کرنے کے لیے ہوتی ہے۔"

برکت شاہ نے کہا۔ "اور یہ دونوں باتیں گاڈفادر حمزہ بیگ کے خلاف جاتی ہیں لیکن تمہاری بھابی جان اس گاڈ فادر کی بیٹی بن کر یہ نہیں سوچنا چاہیں گی کہ ہمارے ابا حضور جیسے فولادی گاڈفادر سے انتقام لینے کے لیے حمزہ بیگ نے انہیں بیٹی بنایا ہے اور جس دوا ساز فیکٹری کی آڑ میں ہم دو نمبر کے دھندے سے لاکھوں کماتے تھے اس فیکٹری کو اس نے اپنے ایک کارندے کے نام کر کے اسے روپوش کر دیا۔ فی الحال اسے قانون کی گرفت سے بچا لیا۔ آئندہ کچھ عرصے تک فیکٹری سرکاری طور پر مقفل رہے گی پھر حمزہ بیگ اوپر والوں کو ہموار کر کے اس کیس کو منوں فائلوں کے نیچے دبا دے گا پھر ہماری سونا اگلنے والی



فیکٹری کو اپنی کسی اولاد کے نام کر دے گا۔"

ریحانہ یہ کبھی تسلیم نہ کرتی کہ ایک بیٹی بنانے والے نے بہت بڑا فریب دیا ہے لیکن عورت لاکھوں روپے، سونے چاندی اور ہیرے جواہرات سے محروم نہیں رہنا چاہتی۔ اب وہ محروم ہو کر سوچ رہی تھی کہ اس کے سسر پیر شاہ سلطانی نے کوئی نقصان اٹھائے بغیر برکت کو رہائی دلائی ہے تو بیٹی بنانے والا حمزہ بیگ بھی خود کو بڑے ذرائع اور اختیارات والا گاڈفادر کہتا ہے، وہ بھی اس فیکٹری کو دوسرے کے نام نہ لکھواتا اور منہ بولی بیٹی کو کوئی نقصان پہنچائے بغیر برکت کو رہائی دلا سکتا تھا۔

بہت بڑا نقصان اٹھانے کے بعد عقل آتی ہے مگر تب تک نقصان پورا کرنے کا وقت گزر چکا ہوتا ہے۔ اس وقت کال بیل کی آواز سنائی دی۔ برکت نے دروازے کے پاس جا کر پوچھا۔ "کون ہے؟"

بیٹے کی آواز سنائی دی۔ "ڈیڈ! میں ہوں جمشید۔"

اس نے دروازہ کھول کر پوچھا۔ "یہ تمہارے گھر آنے کا وقت ہے؟"

جمشید نے اندر آ کر دروازے کو بند کیا پھر باپ کے ساتھ کاریڈور سے گزرتے ہوئے بولا۔ "کیا بتاؤں ڈیڈ! پہلے کسی پولیس والے کی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ ہماری گاڑی کے کاغذات چیک کرے۔ ایک ٹریفک سارجنٹ نے میری کار روک لی تھی۔"

وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے ڈرائنگ روم میں آئے۔ برکت نے پوچھا۔ "پھر کیا ہوا؟ کیا تمہارے پاس گاڑی کے کاغذات نہیں تھے؟"

"آپ جانتے ہیں کہ ہمارے پاس چوری کی گاڑیاں آتی ہیں۔ ان کے ہم جعلی کاغذات تیار کراتے ہیں۔ کاغذات ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے جعلی ہونے کا شبہ نہیں ہوتا لیکن اس سارجنٹ نے کاغذات دیکھے بغیر کہہ دیا کہ وہ جعلی ہیں۔ وہ مجھے ٹریفک پولیس کے ہیڈ کوارٹر لے گیا تھا۔"

بیگم ریحانہ برکت نے پریشان ہو کر بیٹے سے پوچھا۔ "یہ معاملہ کیا ہے؟ پھر کوئی نئی مصیبت آ گئی ہے؟"

وہ ماں سے بولا۔ "آپ تو جانتی ہیں، ہنڈا ایکارڈ کتنی مہنگی ہے مگر وہ چوری کا مال

تھا۔ دلال نے اس کے نئے کاغذات بنا کر صرف چھ لاکھ روپے میں وہ نئی گاڑی دی تھی۔"

"ہاں تو پھر کیا ہوا؟"

"ہونا کیا تھا؟ وہاں افسران کے سامنے ایک شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے پاس گاڑی کے اصلی کاغذات تھے۔ یعنی کار چوروں نے اس سے گاڑی چھین کو دلال کو دی تھی اور دلال نے اسے ہمارے سر تھوپ دیا تھا۔"

رحمت شاہ نے کہا۔ "ہمارے ہاں تین گاڑیاں چور بازار کی ہیں اور ابا حضور کی تین کوٹھیوں میں ایسی دس گاڑیاں ہیں مگر آج تک کسی نے ان گاڑیوں کی طرف انگلی اٹھانے کی جرأت نہیں کی۔ بیٹے جمشید! تمہیں فوراً اباحضور کو اطلاع دینا چاہیے تھی۔"

وہ بولا۔ "جس دادا کو ہم نے چھوڑ دیا ہے اب اس کے محتاج نہیں رہیں گے۔ میں نے انکل گاڈفادر سے رابطہ کیا تھا۔ انہیں اپنے حالات بتائے تھے۔ انہوں نے مجھے تسلیاں دیں پھر فوراً ہی اپنا ایک خاص آدمی ان ٹریفک پولیس کے افسران کے پاس بھیج دیا۔ اس نے آ کر ان افسران کو اور کار کے مالک کو الگ لے جا کر کچھ باتیں کیں۔ پھر پندرہ منٹ کے اندر تمام معاملات طے کر لیے۔"

"کیسے معاملات؟"

"انکل گاڈفادر کے خاص آدمی نے میرے پاس آ کر کہا' آپ میری باتوں کا برا نہ مانیں۔ آپ جعلی کاغذات کے ساتھ ایک کار چور کی حیثیت سے پکڑے گئے ہیں۔ اصلی مالک اور اصلی کاغذات یہاں موجود ہیں۔ ان حالات میں آپ کی رہائی ممکن نہیں ہے لیکن آپ کے انکل حمزہ بیگ کا حکم ہے کہ آپ پر ذرا سا بھی الزام نہ آنے دیا جائے اور آپ کے والدین کی عزت پر حرف نہ آئے لہٰذا آپ اس کار کی ملکیت سے انکار کر دیں۔ میں نے ان افسران اور کار کے مالک سے معاملات طے کر لیے ہیں۔ اب یہ آپ پر کوئی الزام نہیں دھریں گے۔ آپ سب کے سامنے یہ لکھ دیں کہ اس نمبر کی ہنڈا ایکارڈ نہ آپ کی ملکیت ہے اور نہ کسی حوالے سے آپ کا اس سے کوئی تعلق ہے۔ ایک دلال اسے آپ کے پاس فروخت کرنے لایا تھا۔ آپ نے قانون کا احترام کرتے ہوئے اسے پولیس



کی تحویل میں پہنچا دیا ہے۔"

برکت شاہ نے پوچھا۔ "کیا تم وہ لاکھوں روپے کی ہنڈا ایکارڈ پولیس کی تحویل میں چھوڑ آئے ہو؟"

"اور کیا کرتا؟ کیا کار چوری کرنے اور جعلی کاغذات بنانے کے الزام میں جیل چلا جاتا؟"

ریحانہ نے بیٹے کی حمایت میں کہا۔ "ہم اپنی شان و شوکت کا مظاہرہ کرنے اور عام لوگوں سے برتر و افضل رہنے کے لیے مہنگی سے مہنگی کاروں میں بیٹھتے ہیں۔ اگر میرا بیٹا کار چوری کے الزام میں جیل چلا جاتا تو ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتے۔"

"تم بیٹے کی محبت میں اور اس کے آسانی سے رہا ہو کر آنے کی خوشی میں یہ بھول رہی ہو کہ تمہیں بیٹی کہنے والے گاڈ فادر نے آج ایک رات میں یہ دوسرا نقصان پہنچایا ہے۔ تم نے بیٹے کے لیے بیس لاکھ روپے کی کار چھ لاکھ میں خریدی مگر حمزہ بیگ اسے مفت میں لے گیا ہے۔ اگر ہم اسے فروخت کرنا چاہتے تو ہمیں اس کار سے کم از کم پندرہ لاکھ روپے مل جاتے۔"

"ڈیڈ! آپ رقم کا حساب کر رہے ہیں کیا آپ کو میرے بچنے کی خوشی نہیں ہوئی ہے؟"

"اپنی ممی سے پوچھو' انہیں میرے بچنے کی کتنی خوشی ہوئی ہے؟ بیٹے! میں بھی تمہاری طرح حوالات سے نکل کر آیا ہوں۔"

جمشید نے چونک کر سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اس کے چچا رحمت شاہ نے اسے بتایا کہ کس طرح لاکھوں روپے اگلنے والی فیکٹری اب دوسرے کے نام ہو گئی ہے۔ یوں کنگال بنا دینے کا سہرا بھی انکل گاڈفادر کے سر ہے۔

جمشید نے تمام واقعات سننے کے بعد کہا۔ "ممی! یہ آپ نے کیا کیا؟ آپ نے اس فیکٹری کو دوسرے کے نام لکھ دیا' جس سے ہونے والی بے حساب کمائی کے بل پر ہم نے دادا جان کو چھوڑ دیا۔ آپ نے یہ بھی نہیں سوچا کہ آپ کا بیٹا آئندہ شہزادوں کی طرح زندگی کیسے گزارے گا؟"

"میں نے تمہارے باپ کو حوالات سے رہائی دلانے' سزا سے بچانے اور اپنی عزت برقرار رکھنے کے لیے ایسا کیا تھا۔"

برکت شاہ نے کہا۔ "جبکہ ایسا کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ضرورت دوست اور دشمن کو سمجھنے کی تھی۔ جسے ہم دشمن سمجھ کر چھوڑ آئے تھے' تمہارے اسی دادا جان نے کوئی نقصان پہنچائے بغیر مجھے باعزت طور پر رہائی دلائی۔ اگر تم بھی اس کار کے سلسلے میں دادا جان کو آواز دیتے تو وہ قیمتی کار اب بھی تمہاری ہوتی۔"

ریحانہ پاؤں پٹخ کر ایک طرف جاتے ہوئے بولی۔ "ہاں ہاں' میں آپ باپ بیٹے کی دشمن ہوں۔ اگر میں انکل گاڈفادر کو ایک باپ کی طرح بزرگ نہ مانتی تو یہ برا وقت نہ آتا۔ میں نے صرف سونا اگلنے والی فیکٹری نہیں گنوائی بلکہ اپنے بیٹے کے مستقبل کو بھی تاریک بنا دیا ہے۔ میری سزا یہ ہے کہ آپ باپ بیٹے مل کر مجھے گولی مار دیں۔"

"یعنی مرنے کے بعد بھی نقصان پہنچانا چاہتی ہو۔ ہم باپ بیٹے گولی مار کر پھانسی کے تختے پر پہنچ جائیں۔"

رحمت شاہ نے کہا۔ "بھائی جان! پلیز' آپ بھابی جان کو کسی طرح کا الزام نہ دیں۔ یہ آپ کی محبت سے مجبور ہو کر آپ کو قانون کے شکنجے سے نکالنے کے لیے اس انکل گاڈفادر سے دھوکا کھا گئی تھیں۔"

برکت شاہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ ریحانہ نے جا کر ریسیور اٹھایا پھر کہا۔ "ہیلو' کون؟"

دوسری طرف سے روبی کی آواز سنائی دی۔ "ممی! میں آپ کی بیٹی روبی بول رہی ہوں۔"

ماں نے چونک کر اوپری منزل کی طرف دیکھا پھر پوچھا۔ "روبی! تم اپنے بیڈ روم سے فون کیوں کر رہی ہو؟ یہاں آ جاؤ۔"

روبی کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ ماں نے فون کے اسپیکر کو آن کر دیا تاکہ سب ہی اس کی آواز سن سکیں پھر اس نے پوچھا۔ "تم اس طرح کیوں ہنس رہی ہو؟"

"اس لیے کہ آپ مجھے گھر کے بیڈ روم میں سمجھ رہی ہیں جبکہ میں اس گھر میں بھی



نہیں ہوں اور اس شہر میں بھی نہیں ہوں۔ میں لاہور سے بول رہی ہوں۔"

"لاہور؟" سب ہی چونک گئے اور ٹیلی فون کے قریب آ گئے۔ ریحانہ نے ناگواری سے پوچھا۔ "یہ کیا مذاق ہے؟ تم جانتی ہو۔ ہم یہاں کئی معاملات میں الجھے ہوئے ہیں۔ ہماری پریشانی میں اضافہ نہ کرو۔"

"آپ پریشان نہ ہوں۔ میں کامران کے ساتھ لاہور کی ایک خوب صورت کوٹھی میں ہوں۔ میں نے پہلے آپ سب سے کامران کا ذکر نہیں کیا تھا کیونکہ آپ بزرگوں نے ہمارے بچپن ہی میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ میری شادی سنی جیسے مسخرے سے کی جائے گی۔ میں نے سوچا' گھر میں رہ کر آپ بزرگوں سے اپنے دل کی بات کروں گی تو میرے ڈیڈ اور سنی کے ڈیڈ کے درمیان تلخیاں پیدا ہوں گی۔ وہ دونوں بھائی ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے ہیں۔ آپ بھی سنی کو داماد بنانے پر تُلی ہوئی تھیں اس لیے میں نے بڑی خاموشی سے اپنا راستہ الگ کر لیا ہے۔"

ریحانہ نے بیٹی کی باتیں سننے کے دوران اپنے ہونٹوں کو سختی سے بھینچ لیا تھا۔ دوسرے بھی سوچ میں پڑ گئے تھے کہ جوان لڑکی ان سب کی دسترس سے بہت دور ہے۔ اسے فون پر صرف باتیں سنا سکتے ہیں لیکن اس کا ہاتھ پکڑ کر ابھی گھر نہیں لا سکتے۔

برکت شاہ نے بیوی سے ریسیور چھین کر کہا۔ "روبی! تم جو کچھ کہہ رہی ہو' اسے تمہاری زبان سے بھی سن کر یقین نہیں آ رہا ہے۔ بیٹی! ہماری عزت کو خاک میں ملانے والی کوئی بات نہ کرو۔"

"او ڈیڈ! آپ بھی میری باتیں سن رہے تھے۔ یعنی فون کا اسپیکر آن ہے۔ شاید انکل' آنٹی اور جمشید بھی موجود ہوں گے۔ چلیں اچھا ہے یہ کوئی چھپانے والی بات تو نہیں ہے۔"

"بیٹی! تم نے ہمیں کامران کے متعلق پہلے کیوں نہیں بتایا۔ ہم نے تمہاری کون سی خواہش یا ضد پوری نہیں کی ہے؟ ہم یہ بھی کر دیتے۔"

روبی نے کہا۔ "کوئی بیس گھنٹے پہلے ایک گھر ٹوٹ گیا۔ دو بیٹے اپنے باپ سے الگ ہو گئے۔ ایسے میں آپ کامران سے میری شادی کرانے پر راضی ہوتے تو آپ دونوں

بھائیوں میں اختلافات پیدا ہو جاتے۔ پہلے باپ بیٹے الگ ہوئے' پھر بھائی سے بھائی الگ ہو جاتا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ آپ دونوں بھائیوں کے درمیان نفرت پیدا ہو۔ میں نے سوچا' باغیانہ انداز میں کامران کے ساتھ گھر چھوڑ کر جاؤں گی۔ اپنی من مانی کروں گی تو انکل کو یقین ہو جائے گا کہ سنی سے میری شادی کے لیے آپ تو برسوں سے راضی تھے' آپ بھائی کو دی ہوئی زبان کے پابند تھے۔ میں ہی اپنی مرضی سے گھر سے چلی آئی ہوں۔"

رحمت شاہ نے بھائی سے ریسیور لے کر کہا۔ "بیٹی! تمہاری خوشی ہماری خوشی ہے۔ ہم دونوں بھائیوں میں کبھی کسی معاملے میں عداوت پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس سے پہلے کہ بدنامی پھیلے تم کل کسی بھی پہلی فلائٹ سے کامران کے ساتھ چلی آؤ۔ یہاں تم دونوں کی دھوم دھام سے شادی کریں گے۔"

روبی نے کہا۔ "انکل! میں نے اتنا بڑا قدم اٹھانے سے پہلے سوچا کہ ممی کسی بھی اہم مسئلے میں انکل حمزہ بیگ سے مشورہ کرتی ہیں۔ مجھے بھی ان سے چپ چاپ مشورہ کرنا چاہیے پھر میں نے انکل کو اپنے معاملات بتائے تو انہوں نے کہا ممی اور آپ سب فراخ دل ہیں۔ مجھے کامران سے شادی کی اجازت دے دیں گے لیکن دادا جان اکڑ جائیں گے۔ بچپن کے رشتے کو توڑنے میں اپنی توہین سمجھیں گے لہٰذا پہلے مجھے کراچی سے کسی دوسرے شہر جا کر کامران سے نکاح پڑھوا لینا چاہیے۔ جب نکاح ہو جائے گا تو دادا جان ٹھنڈے پڑ جائیں گے۔"

ریحانہ نے رحمت شاہ سے ریسیور چھین کر غصے سے چیختے ہوئے پوچھا۔ "کیا اس بدمعاش گاڈفادر نے تمہیں گھر سے بھاگنے اور کامران سے نکاح پڑھوانے کا مشورہ دیا تھا؟"

"ممی! آپ کسے بدمعاش گاڈفادر کہہ رہی ہیں؟"

"اسی حمزہ بیگ کو تو کہہ رہی ہوں۔ اس ذلیل نے ایک ہی رات میں ہمارے خاندان کو' ہمارے تمام رشتوں کو' ہماری لاکھوں روپے کی آمدنی کو اور ہماری عزتوں کو خاک میں ملانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔"

"آپ کہتی ہیں تو انکل حمزہ نے ایسا کیا ہو گا لیکن میں تو ان سے مشورہ لینے سے



بہت پہلے ہی سے کامران کو پسند کرتی رہی ہوں پھر یہ کہ شادی بھی اپنی مرضی سے کر رہی ہوں۔"

"مگر اس نے تمہیں ماں باپ کو چھوڑ کر لاہور جانے کا مشورہ دیا اور تم اس پر عمل کر رہی ہو۔ بیٹی! میں تمہیں کیسے سمجھاؤں' میرا دل گھبرا رہا ہے۔ اس دشمن گاڈفادر نے کوئی گہری چال چلنے کے لیے تمہیں یہاں سے لاہور پہنچا دیا ہے۔"

"او ممی! میں کوئی نادان بچی نہیں ہوں۔ پلیز' آپ پریشان نہ ہوں۔ اب میں فون بند کرتی ہوں کیونکہ یہاں ویڈیو فلم تیار کرنے والے اپنا کیمرا اور لائٹس وغیرہ لا رہے ہیں۔"

ریحانہ نے پریشانہ ہو کر پوچھا۔ "یہ ویڈیو فلم کس سلسلے میں تیار ہو رہی ہے؟"

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ ابھی قاضی صاحب آئیں گے' ہمارا نکاح پڑھائیں گے۔ اس سلسلے میں ویڈیو فلم تیار کی جائے گی۔"

دوسری طرف سے فون بند کر دیا گیا۔ ریحانہ نے آوازیں دیں' ہیلو ہیلو کہہ کر کریڈل کو کھٹکھٹایا پھر جھنجلا کر ریسیور کو پٹختے ہوئے کہا۔ "یہ ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟"

برکت شاہ نے کہا۔ "وہی ہو رہا ہے جو ہمارے اعمال کے نتیجے میں ہونا چاہیے۔ ہمارے ابا حضور کے مخالف گاڈفادر سے تم نے رشتے کی ابتدا کی تھی۔ اب انتہا بھی دیکھو۔"

رحمت شاہ نے کہا۔ "یہ بھائی جان کو طعنے دینے کا وقت نہیں ہے۔ روبی ہم سے سیکڑوں میل دور ہے۔ ہمارے وہاں پہنچنے سے پہلے اس کے ساتھ کوئی زبردست فراڈ ہو سکتا ہے۔"

رحمت شاہ ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگا۔ برکت شاہ نے پوچھا۔ "کسے فون کر رہے ہو؟"

وہ بولا۔ "ایک ابا حضور ہی ایسے ہیں جو ناممکن کو ممکن بنا سکتے ہیں۔ وہ یہاں بیٹھ کر ایک بٹن دباتے ہیں اور امریکہ میں ان کے کٹھ پتلے ناچنے لگتے ہیں۔ لاہور تو یہاں سے صرف آٹھ سو میل دور ہے۔"

"رحمت! تم بھول رہے ہو۔ ابا حضور سونے سے پہلے اپنے تمام ٹیلی فون بند کر دیتے ہیں۔"

واقعی رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے کئی نمبر ڈائل کیے پھر سیکیورٹی افسر سے رابطہ کیا۔ اسے جواب ملا۔ "میں اسسٹنٹ افسر ہوں۔ آپ کون ہیں؟"

"میں رحمت شاہ سلطانی بول رہا ہوں۔ ابھی بھائی جان کے ساتھ آ رہا ہوں۔ تم ابا حضور کو ہماری آمد کی اطلاع دو۔"

"سوری سر! ہم نہ تو کوٹھی کے اندر جا سکتے ہیں اور نہ باہر سے دستک دے سکتے ہیں۔ ہمیں پیر شاہ صاحب کی نیند میں خلل ڈالنے کی اجازت نہیں ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔ ہم ابھی آ کر انہیں جگائیں گے۔"

"سوری سر! ہمیں سختی سے تاکید کی گئی ہے کہ آپ دونوں بھائیوں اور آپ کے ساتھ جانے والے تمام فیملی ممبرز کو کوٹھی کے احاطے میں داخل نہ ہونے دیا جائے۔"

برکت نے رحمت سے ریسیور لے کر کہا۔ "ہم کوٹھی کے احاطے سے باہر رہیں گے۔ تم صرف ایک کام کرو۔ کوٹھی کے اندر ان کی گونگی نواسی کو کسی طرح جگا دو۔ جب ہم اسے معاملے کی سنگینی بتائیں گے تو وہ اپنے نانا کو ضرور جگائے گی۔"

"جناب! نہ تو وہ بولتی ہیں' نہ سنتی ہیں اور نہ ہم کوٹھی کے اندر جا کر انہیں جھنجوڑ کر جگا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ شانی بی بی ابھی تک کوٹھی میں واپس نہیں آئی ہیں۔ وہ ہمارے سیکیورٹی افسر کے ساتھ اسپتال میں ہیں۔ وہاں کسی زخمی نوجوان کا آپریشن ہو رہا ہے۔"

برکت شاہ نے غصے سے گرج کر کہا۔ "اگر ہم مر رہے ہوں اور ہماری عزت خاک میں مل رہی ہو تب بھی ابا حضور کو نیند سے نہیں جگایا جائے گا۔"

"سر! ناراض نہ ہوں۔ اپنے والد صاحب کے خاص ماتحت سے رابطہ کریں۔ وہ آپ کے کسی کام آ سکتے ہیں۔"

برکت شاہ نے کریڈل پر انگلیاں رکھ کر رابطہ ختم کیا پھر دوسرے نمبر ڈائل کرتے ہوئے بڑبڑایا۔ "پریشانی اور بدحواسی میں ہم یہ بھول گئے کہ جب تک ابا حضور سوتے



رہتے ہیں تب تک ان کا خاص ماتحت دھنی بخش پیش آنے والے ہنگامی حالات اور مسائل سے نمٹتا رہتا ہے۔"

رابطہ ہونے پر اس نے کہا۔ "ہیلو دھنی بخش! میں برکت شاہ سلطانی ہوں۔"

"حکم کریں سائیں۔ غلام حاضر ہے۔"

وہ بتانے لگا کہ جس مخالف گاڈ فادر پر انہوں نے تکیہ کیا تھا اس نے کیسے کیسے نقصانات پہنچائے ہیں اور اب روبی کی زندگی اور عزت خطرے میں ہے اور یہ بھی پتہ نہیں ہے کہ وہ کس کوٹھی میں ہے۔ لاہور بہت بڑا شہر ہے۔ وہاں اسے ڈھونڈ نکالنا مشکل ہے۔

"سائیں! آپ فکر نہ کریں۔ آپ کی صاحب زادی عزت و آبرو کے ساتھ واپس آ جائیں گی۔"

"کیسے آ جائے گی؟ یہ نہ ہم جانتے ہیں' نہ تم جانتے ہو کہ اسے اتنے بڑے شہر میں کہاں رکھا گیا ہے۔"

"سائیں! وہ جو ڈاکیے ہوتے ہیں' وہ لفافوں پر لکھے ہوئے پتے پڑھ کر مطلوبہ گھروں کی چٹھیاں پہنچاتے ہیں۔ ہم تو سائیں پیر شاہ سلطانی کے ڈاکیے نہیں' ڈائری ہیں۔ ہمارے اندر بڑے سے لے کر چھوٹے مجرموں تک کے نام' پتے' فون نمبر اور ایک ایک گاڑی کے نمبر لکھے ہوتے ہیں۔ ان کی بدلتی ہوئی گاڑیوں اور بدلتے ہوئے خفیہ اڈوں کا بھی علم ہوتا ہے۔ آپ اطمینان سے انتظار کریں۔ میں ایک گھنٹے کے اندر خوش خبری سناؤں گا۔"

فون کا رابطہ ختم ہو گیا۔ ریحانہ نے دعا کے لیے دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "یا اللہ! میری بچی خیر سے واپس آئے۔ ہماری عزت پر کوئی حرف نہ آئے۔ میں حضرت عبداللہ شاہ غازیؒ کے مزار پر حاضری دوں گی اور غریبوں کو کھلانے کے لیے پانچ دیگیں پکواؤں گی۔"

جب گاڈ فادر حمزہ بیگ نے ریحانہ کو یہ خوش خبری سنائی تھی کہ آج رات ہی کسی وقت پیر شاہ سلطانی کی گونگی نواسی کو اغوا کرایا جائے گا تو اس نے خوش ہو کر منت مانی تھی کہ غازی باباؒ کے مزار پر حاضری دے گی اور غریبوں کو کھلانے کے لیے پانچ دیگیں پکوائے

گی۔ اب بازی پلٹ گئی تھی۔ اب وہ بیٹی کی واپسی کے لیے منت مان رہی تھی۔

اور جمشید ایک صوفے پر بیٹھ کر تصور میں شانی کو دیکھ رہا تھا۔ جو چیز ہاتھ نہیں آتی' اس کے لیے دل مچلتا ہے اور اب تو ضد ہو گئی تھی۔ اس نے نانا جان سے اسے ایک پاؤں پر تمام رات کھڑے رہنے کی سزا دلائی تھی۔ وہ رقابت سے سوچ رہا تھا' اسپتال میں وہ زخمی جوان کون ہے جس کے لیے وہ اتنی رات تک ایک پاؤں پر کھڑے رہنے گئی ہے۔

جب دل میں محبت ہو اور محبت میں سچائی ہو تو انتظار کے لمحات میں ایسا ہی لگتا ہے جیسے محبوب ایک ٹانگ پر کھڑا منتظر ہو۔ شانی کو بھی کسی کل قرار نہیں تھا۔ جب تک آپریشن نہیں ہوا' سچل کے بازو سے گولی نہیں نکلی اور ڈاکٹر نے اس کی خیریت کی اطلاع نہیں دی' تب تک وہ آپریشن تھیٹر کے سامنے ٹہلتی رہی۔

سیکیورٹی افسر نے اسے آرام سے بیٹھ جانے کو کہا۔ ڈائریکٹر جنرل صداقت علی کا خاص ماتحت اس کے لیے ایک ڈاکٹر کے چیمبر سے کرسی اٹھا لایا لیکن اس نے کرسی ایک طرف پھینک دی۔ اپنے باپ کے ماتحت کو ایک کاغذ پر لکھ کر دیا۔ "تمہیں میری خدمت کے لیے نہیں' اس زخمی کی سلامتی کے لیے بھیجا گیا ہے۔ اگر نہایت تجربے کار سرجن نے آپریشن نہ کیا اور گولی بازو سے نہ نکلی تو میں تمہارے خلاف سخت کارروائی کراؤں گی۔"

وہ کیس پولیس اور انٹیلی جنس والوں کا تھا۔ ڈاکٹر اور آپریشن کرنے والی ٹیم بھی بڑی مستعدی اور پھرتی سے کام کر رہی تھی۔ بازو سے گولی نکالنے کا مسئلہ تشویش ناک نہیں تھا لہٰذا ایک کاغذ پر یہ خوش خبری لکھ کر شانی کو سنا دی گئی کہ گولی نکل چکی ہے اور مریض خطرے سے باہر ہے۔

رات کے تین بج چکے تھے۔ سیکیورٹی افسر نے تحریر کے ذریعے پوچھا۔ "کیا آپ گھر چلیں گی؟ ہم پھر صبح آجائیں گے۔"

اس نے لکھا۔ "فون کر کے اپنی ڈیوٹی بدلو۔ دوسرے سیکیورٹی افسر اور گارڈز کو بلاؤ۔ میں اس کے ہوش میں آنے تک نہیں جاؤں گی۔"



سیکیورٹی افسر نے پریشان ہو کر فون کے ذریعے اپنے ماتحت سے پوچھا۔ "کیا پیر شاہ صاحب جاگ رہے ہیں؟"

"نو سر! کوٹھی کے اندر تمام ٹیلی فون بند ہیں۔ میرے لیے حکم سر!"

"میں پچھلے پندرہ گھنٹے سے ڈیوٹی پر ہوں۔ بری طرح تھک گیا ہوں۔ دوسرے افسر کو چار نئے گارڈز کے ساتھ بھیج دو۔ میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔"

اس نے فون بند کر دیا۔ شانی نے سچل کے لیے اسپیشل ایئرکنڈیشنڈ کمرا مخصوص کرایا تھا۔ وہاں اس کے بیٹھنے کے لیے ایزی چیئر بھی تھی۔ سچل آرام دہ بستر پر آنکھیں بند کیے لیٹا ہوا تھا اور وہ ایزی چیئر پر بیٹھی اسے دیکھ رہی تھی۔ شاعر خوابیدہ حسن پر شاعری کرتے ہیں مگر اس کے دل کی دھڑکنیں خوابیدہ عاشق کے لیے گنگنا رہی تھیں۔

اس نے پہلی بار اسے دیکھ کر سوچا تھا کہ بس اچھا لگتا ہے۔ اب وہ بس میں نہیں تھی' بے بس ہو کر سوچ رہی تھی کہ تمام اچھوں سے زیادہ اچھا لگتا ہے۔ اس کی فکر کرنا اچھا لگتا ہے۔ اس کی صحت یابی کے لیے دعائیں مانگنا اور اس کی تیمارداری کے جذبے سے جاگنا اچھا لگتا ہے۔

صبح پانچ بجے وہ ہوش میں آیا۔ ان کی آنکھیں بند تھیں۔ پہلے اس کے منہ سے کراہنے کی آواز نکلی۔ اس نے آواز نہیں سنی لیکن اسے ہولے سے کسمساتے ہوئے دیکھا۔ وہ جلدی سے اٹھ کر اس کے قریب آئی۔ اسے غور سے دیکھتے ہوئے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔ وہ دھیمی آواز میں کراہ رہا تھا۔ سننے والے کراہیں سن کر کسی کی تکلیف کا اندازہ کرتے ہیں۔ وہ اس کے چہرے سے ظاہر ہونے والے کرب سے اس کی تکلیف کو سمجھ رہی تھی پھر وہ تیزی سے چلتی ہوئی دروازے تک آئی۔ دروازے کے باہر دو مسلح گارڈ کھڑے ہوئے تھے۔ کچھ فاصلے پر اسسٹنٹ سیکیورٹی افسر ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ شانی کو دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اشارے کی زبان بولی' فوراً ڈاکٹر کو بلاؤ۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا ڈاکٹر کے چیمبر کی طرف چلا گیا۔

شانی پھر کمرے میں آئی۔ بستر کے سرے پر بیٹھ کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔ شانی نے اس کا ہاتھ اٹھا کر اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ اس کی

ہتھیلی کی پشت کو سہلانے لگی۔ ایسے وقت سچل نے آہستگی سے آنکھیں کھولیں۔ اسے کمرے کی چھت نظر آ رہی تھی۔ وہ اسے تک رہا تھا۔ شاید سوچ رہا تھا کہ وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے؟

پھر اس نے اپنا ہاتھ کسی کے نرم و گداز ہاتھوں میں محسوس کیا۔ اس کی نظریں چھت سے اترتی ہوئی شانی پر آ کر ٹھہر گئیں۔ وہ ایسا کھلا ہوا چہرہ تھا کہ نگاہوں کے سامنے بہار آ گئی۔ زندگی ہمیشہ موت کی طرف سفر کرتی ہے۔ پہلی بار وہ موت سے زندگی کے دو پھول جیسے ہاتھوں میں چلا آیا۔

سچل کی آنکھیں مسکرانے کے انداز میں چمک رہی تھیں۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے اپنے ہونٹ کھولے پھر انہیں بند کر لیا۔ ایک تو نقاہت محسوس ہو رہی تھی پھر خیال آ گیا تھا کہ بولنے سے وہ کچھ سن نہیں پائے گی۔ ایسے وقت ڈاکٹر' ایک لیڈی ڈاکٹر' دو نرسیں اور وارڈ بوائے وہاں آ گئے۔ ڈاکٹر نے سچل کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "ویری ویل' ہوش میں آ گئے ہو۔ اب ہماری جان چھوٹے گی۔"

سچل نے ڈاکٹر کی بات نہ سمجھ کر سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ لیڈی ڈاکٹر نے کہا۔ "اس پولیس اسپتال میں ہم نے آج تک بڑے آرام سے ملازمت کی۔ آج پہلی بار ڈیوٹی کے وقت کے بعد بھی ڈیوٹی پر ہیں۔ ڈائریکٹر جنرل کی صاحب زادی نے ہم سب کو روک رکھا ہے۔ لکھ کر حکم دیا ہے کہ جب تک آپ کو ہوش نہ آئے' تب تک ہم میں سے کوئی اسپتال سے نہیں جائے گا۔"

ڈاکٹر نے اس کا اچھی طرح معائنہ کرتے ہوئے کہا۔ "جب سے آپ کو زخمی حالت میں لایا گیا ہے تب سے مس شہناز نے پورے اسپتال کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ کسی ڈاکٹر کو کمر سیدھی کر کے لیٹنے کا بھی موقع نہیں دیا۔ خود بھی یہ تمام رات بیٹھی رہیں۔ شاید انہوں نے رات سے کچھ کھایا بھی نہیں ہے۔"

سچل یہ ساری باتیں سن رہا تھا اور محبت سے سرشار ہو کر مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا۔ ایک نوجوان کو اس سے بڑا انعام اور کیا مل سکتا ہے کہ ایک حسین و جمیل دوشیزہ اس کے لیے تمام رات جاگتی رہی۔ اس کے لیے اس قدر بے چین رہی کہ کھانا



تک بھول گئی۔

سچل نے ڈاکٹر سے کہا۔ "ڈاکٹر! مجھے افسوس ہے کہ اس نے میری خاطر آپ تمام کو ڈیوٹی کے وقت کے بعد بھی اب تک روک رکھا ہے۔ اب ایسا نہیں ہو گا۔"

لیڈی ڈاکٹر نے کہا۔ "دوسرے ڈاکٹروں کی ڈیوٹی بہت پہلے شروع ہو چکی ہے لیکن ہم نے آپ کا آپریشن کیا تھا اور گولی نکالی تھی۔ اس لیے یہ چاہتی ہیں کہ آپ کے ہوش میں آنے کے بعد آپ کو پوری طرح چیک کر کے مطمئن ہو کر جائیں۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "زخم گہرا نہیں ہے۔ گولی گہرائی تک گوشت میں نہیں اتری تھی۔ ماشاء اللہ آپ بھی جی دار ہیں۔ ایک ہفتے کے اندر زخم بھر جائے گا۔"

وہ اسے ایک انجکشن لگانے لگا۔ نرس نے دو گولیوں اور ایک کیپسول کے ساتھ جوس کا گلاس پینے کے لیے دیا۔ سچل نے شانی سے کاغذ قلم مانگ کر لکھا۔ "تم نے پچھلی رات سے میری خاطر جس بھرپور محبت کا مظاہرہ کیا ہے اس کا شکریہ ادا نہیں کروں گا کیونکہ محبت میں شکریہ ادا نہیں کیا جاتا۔ اپنا حق ادا کیا جاتا ہے۔ تمہاری خاموش محبت کی قسم میں بھی پیار کے تمام حقوق ادا کرتا رہوں گا۔

"ویسے محبت دوسروں پر ظلم نہیں کرتی۔ آپریشن کے بعد دوسرے ڈاکٹر بھی مجھے اٹینڈ کر سکتے تھے لیکن تم نے آپریشن کرنے والی پوری ٹیم کو صرف اپنے اطمینان کی خاطر روک رکھا تھا۔ اگرچہ اس طرح بھی تمہاری محبت کا بھرپور اظہار ہوتا ہے لیکن اس کا دوسرا پہلو منفی ہے' یہ اختیارات کا ناجائز استعمال ہے۔ کیا آپریشن کرنے والی ٹیم سے معافی مانگو گی؟"

شانی نے اسے پڑھا۔ ندامت سے سچل اور ڈاکٹروں کو دیکھا پھر لکھا۔ "ڈاکٹر! آپریشن کرنے والی پوری ٹیم نے فرض شناسی کا ثبوت دیا ہے۔ میرا یہ رویہ غلط رہا کہ میں نے اپنے باپ کے وسیع اختیارات سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے آپ لوگوں کو ناحق زحمتیں دیں۔ آپریشن کے دوران جتنے ڈاکٹر' لیڈی ڈاکٹر' نرسیں اور اسسٹنٹ بوائز موجود تھے ان سب کے سروس ریکارڈ شام تک ڈائریکٹر جنرل صداقت علی کے دفتر میں بھیج دیے جائیں گے۔ جن کی ترقیاں ناجائز طور پر روک لی گئی ہیں' انہیں ترقیاں دی [illegible] گی۔

جتنے ڈاکٹر مزید ٹریننگ کے لیے غیر ممالک جانا چاہتے ہیں ان کی کارکردگی کے پیش نظر انہیں ضرور غیر ممالک روانہ کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ بھی آپ حضرات اور خواتین کی جو شکایتیں ہوں گی' دور کی جائیں گی۔ میں نے پچھلی رات سے جو سخت رویہ اختیار کیا تھا اس کے لیے معافی چاہتی ہوں۔ سو سوری اینڈ وش یو گڈ لک۔"

ڈاکٹروں اور نرسوں نے وہ تحریر پڑھی پھر شانی کو دیکھا تو وہ معافی مانگنے کے انداز میں دونوں ہاتھ جوڑے کھڑی تھی۔ اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں لیکن وہ مسکرا رہی تھی۔ ڈاکٹر اور لیڈی ڈاکٹر نے فوراً قریب آ کر اس کے دونوں ہاتھوں کو تھام لیا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ "آپ نے ہمیں زحمت دی ہے لیکن اس سے زیادہ ہمارے حقوق ہمیں دلانے والی ہیں۔"

لیڈی ڈاکٹر نے کہا۔ "آپ ایک بہت بڑے باپ کی بیٹی اور بہت بڑے نانا کی نواسی ہیں۔ اس کے باوجود آپ کے سینے میں ایک درد بھرا دل ہے۔"

سچل نے کہا۔ "ڈاکٹر! آپ بھول رہے ہیں کہ یہ سن نہیں سکتی ہے۔"

انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس کے بعد وہ شانی کو یہ تحریری تسلی دے کر چلے گئے کہ سچل بالکل ٹھیک ہے۔ ہفتہ بھر میں اس کے بازو کا زخم بھر جائے گا۔

★==========★==========★

سنی لاہور جانے کے لیے طیارے کے قریب آیا۔ فرسٹ کلاس کی طرف جانے والے زینے پر اسے دور ہی سے روبی نظر آئی۔ وہ ایک نوجوان کے ساتھ مسکراتی ہوئی' باتیں کرتی ہوئی زینے پر چڑھتی جا رہی تھی۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ "یہ تنہا کہاں جا رہی ہے اور وہ اجنبی کون ہے؟"

وہ روبی کی منزل اور ارادے معلوم کرنا چاہتا تھا اور اسے اپنی موجودگی سے بے خبر رکھنا چاہتا تھا اس لیے اکانومی کلاس کے زینے کی طرف آ گیا۔ بورڈنگ کارڈ اور بیگیج چیک کرنے والے نے کہا۔ "مسٹر! آپ فرسٹ کلاس کے مسافر ہیں۔ اس دوسرے زینے سے جائیں۔"

اس نے کہا۔ "اکانومی کلاس میں میری ایک کزن ایئر ہوسٹس ہے۔ میں اس سے



کچھ ضروری باتیں کرتا ہوا جاؤں گا۔"

وہ اس بہانے زینے پر چڑھ کر اوپر آیا۔ اوپر استقبال کرنے والی ایئر ہوسٹس نے پوچھا۔ "آپ ادھر کیوں آئے ہیں۔ آپ تو فرسٹ کلاس کے مسافر ہیں؟"

وہ کراہ کر بولا۔ "یہ میری بدقسمتی ہے۔ ابھی مجھے پتہ چلا ہے کہ فرسٹ کلاس میں میری ساس سفر کر رہی ہے۔ پلیز میرے حال پر رحم کریں۔ اکانومی کلاس کا کوئی بھی تنہا مسافر راضی خوشی فرسٹ کلاس میں چلا جائے گا۔ میں اس مسافر کی جگہ بیٹھ کر سفر کروں گا۔"

استقبال کرنے والی ہوسٹس نے اسے دوسری ہوسٹس کے حوالے کیا۔ دوسری ہوسٹس نے ذرا سی کوشش کے بعد ایک مسافر کو فرسٹ کلاس میں بھیج کر اس کی جگہ بٹھا دیا اور سنی اس مسافر کی جگہ بیٹھ کر روبی کی نظروں میں آئے بغیر لاہور پہنچ گیا۔ وہاں بھی وہ دور ہی سے اس کا تعاقب کرتا رہا۔ وہ اجنبی نوجوان بہت امیر رہا ہوگا۔ اس کے لیے ایک پجیرو آئی تھی۔ سنی نے ایک ٹیکسی ڈرائیور سے کہا۔ "کرائے کی فکر نہ کرو۔ وہ سامنے والی پجیرو جہاں جا رہی ہے' مجھے بھی وہیں لے چلو لیکن انہیں تعاقب کا شبہ نہیں ہونا چاہیے۔"

ڈرائیور کو توقع سے زیادہ رقم ملی۔ وہ پجیرو کا تعاقب کرتا ہوا شہر کے اس حصے میں پہنچا جہاں آبادی کم تھی۔ دور دور چند خوب صورت کوٹھیاں بنی ہوئی تھیں اور مزید تعمیرات ہو رہی تھیں۔ وہ پجیرو ایک کوٹھی کے احاطے میں جا کر رک گئی تھی۔

اس احاطے میں کچھ لوگ نظر آئے۔ ان میں سے کچھ کوٹھی کے اندر آ جا رہے تھے۔ ایک شخص ویڈیو کیمرے کے ذریعے روبی اور اجنبی نوجوان کو اس کوٹھی کے احاطے میں آتے اور پجیرو سے اتر کر کوٹھی کے اندر جانے کا سین پکچرائز کر رہا تھا۔

سنی ٹیکسی میں بیٹھ کر اس علاقے کے بازار میں گیا پھر ایک دکان سے کراچی فون کرنے لگا۔

روبی بہت خوش تھی کیونکہ اس کے محبوب کے ساتھ اس کی ویڈیو فلم تیار ہو رہی تھی۔ اس نے حیرانی سے مسکرا کر پوچھا۔ "کامران! یہ سب کیا ہے؟"

کامران نے کہا۔ "میں تمہیں سرپرائز دینا چاہتا تھا۔ تم نے کہا تھا کہ شادی سے پہلے میں صرف تمہارا ہاتھ پکڑ سکتا ہوں۔ آج میں نے تمہیں سر سے پاؤں تک اپنا بنانے کے لیے یہاں نکاح پڑھوانے کے انتظامات کیے ہیں۔"

وہ حیرت اور مسرت سے بولی۔ "کیا واقعی! تم بہت اچھے ہو۔ میں جو چاہتی تھی، وہی کر رہے ہو۔"

وہ بولا۔ "یہ انکل حمزہ کا حکم ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ تم ان کی منہ بولی بیٹی کی بیٹی ہو۔ تمہاری عزت پر آنچ نہیں آنا چاہیے اور یہ بدنامی نہیں ہونا چاہیے کہ تم میرے ساتھ اس کوٹھی میں نکاح کے بغیر رہتی ہو۔"

"انکل گاڈفادر بہت اچھے ہیں۔ ایک ہمارے دادا جان ہیں جو ہمیشہ پتھر کی طرح لگتے تھے۔ تھینکس گاڈ ایسے دادا سے نجات مل گئی۔"

وہ کامران کے ساتھ کوٹھی کے اندر آئی۔ ڈرائنگ روم میں کامران کے تین دوست بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے دوستوں سے اس کا تعارف کرایا۔ ایک دوست نے کہا۔ "ہماری ہونے والی بھابی سفر سے تھک گئی ہوگی۔ قاضی صاحب کے آنے تک انہیں آرام کرنے دو۔"

کامران نے اسے ایک خواب گاہ میں پہنچا کر کہا۔ "اس الماری میں ریڈی میڈ ملبوسات ہیں۔ جو تمہیں پسند آئے، غسل کر کے پہن لو۔ کیا تم کچھ پینا پسند کرو گی؟"

"ہاں۔ پیاس لگ رہی ہے۔ کولڈ ڈرنک منگوا دو۔ اب میں کراچی فون کروں گی اور گھر والوں کو اپنی شادی کی خوش خبری سناؤں گی۔"

وہ بوتل لانے چلا گیا۔ روبی نے فون کے ذریعے اپنے والدین سے رابطہ کیا۔ کامران نے کچن میں جا کر ایک ٹھنڈی بوتل نکالی۔ اسے کھول کر گلاس کے آدھے حصے میں مشروب کو انڈیلا پھر باقی آدھے حصے میں شراب انڈیلی۔ اس کے بعد گلاس اٹھا کر خواب گاہ میں آگیا۔ وہ فون پر اپنی ممی سے باتیں کر رہی تھی۔ کامران اس کے سامنے گلاس پر رکھ کر وہاں سے چلا آیا۔

ڈرائنگ روم میں اس کے تینوں دوست ایک ایک سگریٹ کا تھوڑا تھوڑا سا تمباکو



نکال کر اس میں چرس بھر رہے تھے۔ ان کے سامنے چھ سگریٹ پہلے ہی چرس بھرے رکھے تھے۔ ان میں سے وہ ایک ایک سلگانے کے بعد پی رہے تھے۔ کامران بھی ایک سگریٹ ہونٹوں میں دبا کر اسے سلگانے لگا۔ روبی خواب گاہ میں بیٹھی پیش آنے والی تباہی سے بے خبر بڑے فخر سے اپنے بزرگوں کو فون پر اپنی نئی زندگی گزارنے کے سلسلے میں بتا رہی تھی اور گلاس سے ایک ایک گھونٹ پی رہی تھی۔ پہلے گھونٹ میں اسے ہلکی سی جلن، کچھ تلخی سی محسوس ہوئی لیکن روب کی مٹھاس بھی تھی اور اس سے زیادہ ابھی دلہن بننے کی مٹھاس نے ملاوٹ کی تلخی کی نظرانداز کر دیا تھا۔ اپنی کامیابی کا نشہ ایسا ہوتا ہے کہ اس کے سامنے تمام نشے پھیکے پڑ جاتے ہیں۔

اس نے فون پر باتیں کرنے کے بعد ریسیور رکھا تو سر ذرا سا چکرانے لگا۔ فون پر باتیں کرنے کے دوران گلاس خالی ہو گیا تھا۔ ویڈیو کیمرا مین اور دو لائٹس مین اپنے سامان کے ساتھ آ گئے اور لائٹنگ کے انتظامات کرنے لگے۔ روبی الماری سے لباس نکال کر غسل خانے میں جانا چاہتی تھی۔ کیمرا مین نے کہا۔ "تم یہیں بستر پر لیٹی رہو۔ میرے اسسٹنٹ تمہارے چہرے اور جسم کی لائٹنگ سیٹ کر رہے ہیں۔"

"پہلے میں غسل کروں گی۔ لباس بدل کر آؤں گی۔ کیا قاضی صاحب آ گئے ہیں؟"

"قاضی صاحب؟ بھئی وہ تو گھر سے بھاگنے والی لڑکیوں کا نکاح پڑھانے نہیں آتے۔"

"کیا بکواس کر رہے ہو؟" وہ غصے سے اٹھنا چاہتی تھی پھر بیٹھ گئی۔ سر چکرانے لگا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا۔

کیمرا مین نے کہا۔ "شروع میں ہر لڑکی میری باتوں کو بکواس سمجھتی ہے۔ ذرا عقل سے سوچو۔ قاضی ایک عورت کا نکاح ایک ہی مرد سے پڑھاتا ہے مگر یہاں تو تمہارے چار دولہے ہیں، وہ دیکھو۔"

روبی نے دروازے کی طرف دیکھا۔ کامران سگریٹ کا ایک گہرا کش لگاتا ہوا اندر آیا۔ اس کے پیچھے ایک ایک کر کے تینوں ساتھی دھواں چھوڑتے ہوئے اندر آنے لگے۔ اس نے پوچھا۔ "کامران! یہ سب کیا ہو رہا ہے؟"

"وہی جو تم دیکھ رہی ہو۔"

"دیکھو میرا سر بھاری ہو رہا ہے۔ خواہ مخواہ میرے دل میں اندیشے پیدا نہ کرو۔"

"سر اس لیے بھاری ہو رہا ہے کہ تم نے مشروب کے ساتھ شراب پی ہے اور ہم چرس کا دھواں اڑا رہے ہیں۔ ایک حسینہ ہو' چار مرد ہو' ویڈیو کیمرا ہو تو تمہیں خود ہی سب کچھ سمجھ لینا چاہیے۔ کالج میں پڑھنے والی لڑکیاں ایسی نادان بھی نہیں ہوتی ہیں۔"

حالات بدل گئے۔ دلہن بننے کا نشہ ہرن ہو گیا۔ کامران سگریٹ کا کش لگا کر دھواں چھوڑتا ہوا قریب آنے لگا' وہ بولی۔ "وہیں رک جاؤ۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "یہ لو رک گیا مگر کتنی دیر روک سکو گی؟"

"میں انکل حمزہ سے بات کرنا چاہتی ہوں۔"

"ہاں۔ ایسا نام لیا ہے کہ ہم انکار نہیں کر سکتے اور تمہیں ان کا فون نمبر بھی نہیں بتا سکتے۔"

اس نے موبائل فون آن کر کے نمبر ملا دیا پھر فون روبی کی طرف بڑھا دیا۔ روبی نے فون کان سے لگا کر کہا۔ "ہیلو انکل! میں روبی بول رہی ہوں۔"

دوسری طرف سے آواز آئی۔ "کمال ہے۔ ماں بھی مجھے انکل کہتی ہے' بیٹی بھی انکل کہتی ہے۔ ایسا ان حالات میں ہوتا ہے' جب رشتے معتبر نہیں ہوتے۔ معتبر سمجھتی ہو نا؟ اعتبار سے خالی' کھوکھلے رشتے........."

"انکل! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ ہم نے خون کے رشتے کو توڑ کر آپ پر اعتبار کیا ہے۔"

"خون کا رشتہ اس طرح ٹوٹ سکتا ہے کہ تمہاری رگوں میں اس فراڈ پیر کا خون نہ رہے۔ اس کے خون میں ہمارے کارندوں کا لہو بھر جائے۔ ہمارے وہ چاروں کارندے بڑے جاں نثار ہیں۔ یوں سمجھ لو' تمہیں خون کا عطیہ دینے آئے ہیں۔"

"آپ کو ایسی باتیں کرتے ہوئے شرم آنی چاہیے۔"

"شرم تمہارے دادا کو نہیں آئی پھر ہمیں کیوں آئے گی۔ پتہ نہیں اس کی بیٹی ہاجرہ کو کس نے اغوا کیا ہے لیکن وہ ہمیں الزام دے رہا ہے۔ ہم بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ وہ



بڑے وسیع ذرائع کا مالک ہو کر اب تک بیٹی کی بازیابی کے لیے ہمارے خلاف کارروائی نہیں کر سکا۔ بے شرم ایسا ہے کہ بیٹی کی گم شدگی پر کم توجہ دے رہا ہے اور قرض دہندگان سے کروڑوں کا لین دین کر رہا ہے۔"

"اب سمجھ رہی ہوں کہ ممی اور ہم سب نے آپ سے زبردست دھوکا کھایا ہے۔"

"میں تو تمہارے پورے خاندان کی کمر توڑ دینا چاہتا تھا۔ میں نے تمہارے باپ کو حوالات میں پہنچا دیا اور تمہاری ممی کے نام جو سونا اگلنے والی فیکٹری تھی وہ مفت میں حاصل کر لی۔ ارادہ تھا کہ تمہارے باپ کو حوالات سے رہائی دلانے سے پہلے اخبارات کے رپورٹرز اور فوٹوگرافرز کو وہاں پہنچا دوں تاکہ ہتھکڑی لگی ہوئی تمہارے باپ کی تصویریں تمام اخبارات میں دیکھ کر تمہارے دادا کا سر جھک جائے گا مگر وہ بڈھا نہ جانے کیسے تھانے پہنچ گیا۔"

روبی کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ جس دادا جان کو دشمن سمجھ رہی تھی اس دادا جان نے اس کے باپ کو اخبارات میں مجرم کی حیثیت سے ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔ فون پر حمزہ بیگ اسے بتا رہا تھا کہ اس کا بھائی جمشید کنگال ہے۔ اس کے پاس صرف ایک کار رہ گئی تھی وہ بھی حمزہ بیگ نے مفت میں حاصل کر لی تھی۔ مخالف گاڈ فادر کا تیسرا حملہ روبی پر ہو رہا تھا۔

اس نے کہا۔ "تمہارے دادا نے تمہارے باپ کو تھانے سے لے جا کر بدنامی سے بچا لیا لیکن تمہیں کیسے بچائے گا۔ تم تو اس بڈھے سے سیکڑوں میل دور ہو۔"

وہ پریشان ہو رہی تھی اور سمجھ رہی تھی کہ آج رات کے بعد وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گی۔ وہ عاجزی سے بولی۔ "آپ نے انکل بننے سے انکار کر دیا ہے۔ اس کے باوجود میں انسانیت کا واسطہ دیتی ہوں۔ میں نے سنا ہے کہ آپ کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ خدا نہ کرے' آپ کی کسی بیٹی پر ایسا شرمناک وقت آئے گا تو آپ کے دل پر کیا گزرے گی؟"

"جرائم کی دنیا میں رہنے والے یہ نہیں سوچتے کہ وہ کب پولیس کی گولی سے

مارے جائیں گے۔ یہ بھی نہیں سوچنا چاہتے کہ ہم پر کسی طرح کا برا وقت آ سکتا ہے۔ ہم ہر طرح کے حالات سے نمٹنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں لہٰذا تم بھی موجودہ حالات سے گزرو اور اس انکل کو بھول جاؤ جس سے خون کا نہیں پانی کا رشتہ رہا ہے۔"

فون بند کر دیا گیا۔ وہ ہیلو ہیلو کہتی رہ گئی۔ کامران نے اس سے موبائل فون چھین کر اسے آف کر دیا پھر کہا۔ "بات ہو گئی؟ تمہاری تسلی بھی ہو گئی ہو گی کہ جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے۔"

اس کی بات پر تینوں ساتھیوں نے قہقہہ لگایا۔ کامران نے ایک لانبے پھل کا چاقو کھول کر کیمرا مین سے کہا۔ "لائٹس آن کر کے پہلے روبی کو ایکسپوز کرو۔ جب یہ احتجاج کرے گی اور چیخنا چاہے گی تو میں چاقو لے کر اس منظر میں داخل ہو جاؤں گا اور چاقو کی نوک اس کے سینے پر رکھ دوں گا۔ اس کو اپنی جان عزیز ہو گی تو یہ خاموش رہے گی ورنہ یہ چاقو اسے خاموش کر دے گا۔ لیس کم آن' لائٹس آن کر دو۔"

روشنی پہلے سے خواب گاہ میں تھی۔ ویڈیو شوٹنگ کے لیے دو خاص لائٹس آن ہوئیں لیکن دوسرے ہی لمحے بجھ گئیں۔ کمرے میں بھی تاریکی چھا گئی۔ کیمرا مین نے تاریکی میں کہا۔ "بجلی گئی ہے۔"

کامران کے ایک ساتھی نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر دیکھا پھر کہا۔ "آس پاس کی کوٹھیوں میں روشنی ہے۔ اپنے مین سوئچ کو چیک کرنا ہو گا۔"

ایک لائٹ مین ٹارچ کی روشنی میں کامران کے ایک ساتھی کے ساتھ کمرے سے باہر مین سوئچ کی طرف گیا۔ ٹارچ کے جانے کے بعد پھر کمرے میں تاریکی چھا گئی۔ اندھیرے میں کامران کے ہنسنے کی آواز آئی۔ وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "روبی! میں پورے یقین سے کہتا ہوں کہ تم دعا مانگ رہی ہو۔ جب عورت کا بس نہیں چلتا تو وہ روتی ہے یا پھر خدا سے دعا مانگتی ہے لیکن یہی دیکھا گیا ہے کہ آنسو نیچے گر کر دامن میں جذب ہو جاتے ہیں اور دعا اوپر عرش پر جا کر اٹک جاتی ہے۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی پھر کمرا روشن ہو گیا لیکن کامران دوبارہ یہ نہ کہہ سکا کہ دعا عرش پر جا کر اٹک گئی۔ وہ بوکھلا گیا تھا۔ اس کمرے میں چھ افراد کلاشنکوفیں لیے ان



سب کو گھیرے ہوئے تھے۔

روبی نے پہلے تو سنی کو بے یقینی اور حیرت سے دیکھا پھر سنی کہہ کر چیختی ہوئی دوڑ کر آئی اور اس سے لپٹ کر دہاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ سنی نے زبان سے کچھ نہ کہا۔ اس کی پشت کو تسلی دینے کے انداز میں ہولے ہولے تھپکنے لگا۔

وہاں بڑی بڑی مونچھوں والا ایک پہاڑ جیسا آدمی کھڑا تھا۔ اس نے کہا۔ "باؤ سنی! کڑی نوں ایتھوں لے جا.........."

سنی نے اس کے آنسو پونچھے پھر اسے ایک بازو کے حصار میں لے کر کمرے سے چلا گیا۔ اس قدآور شخص نے دروازے کی طرف دیکھ کر چٹکی بجائی۔ دروازے سے ایک شخص داخل ہوا' اس نے ایک لڑکی کی گردن دبوچ رکھی تھی۔ اسے اسی طرح کمرے میں لے کر آیا پھر اسے دھکا دے کر بستر پر گرا دیا۔

وہ غصے سے بولی۔ "اب تک میرے بابا کو خبر ہو چکی ہو گی۔ تم سب کتے کی موت مارے جاؤ گے۔"

اسی قدآور شخص نے کامران کو دیکھ کر چٹکی بجائی پھر کہا۔ "اوئے لا اپنا موبائل فون اسے دے۔ یہ اپنا بابا سے بات کرے گی۔"

کامران نے اس لڑکی کو فون دیا۔ وہ فون لیتے ہی جلدی جلدی اسے آن کر کے نمبروں کے بٹن دبانے لگی پھر رابطہ ہونے پر کہا۔ "ہیلو ہیلو بابا جانی! میں نازو بول رہی ہوں۔ یہاں مجھے کئی بدمعاشوں نے پکڑ رکھا ہے۔"

دوسری طرف سے گاڈفادر حمزہ بیگ کی آواز سنائی دی۔ "یہ کیا کہہ رہی ہو۔ تم تو اپنے چاچا کے پاس گئی تھیں؟ وہ کون لوگ ہیں' ان سے بات کراؤ۔"

نازو نے موبائل فون اسی قدآور شخص کی طرف بڑھایا۔ اس شخص نے کامران کی طرف دیکھ کر چٹکی بجائی۔ اشارے میں کہا کہ وہ بات کرے۔

کامران نے فون اپنے کان سے لگا کر کہا۔ "ہیلو!"

پھر وہ دوسری طرف سے اپنے گاڈفادر کی آواز سن کر چونک گیا۔ وہ پوچھ رہا تھا۔ "تم کون ہو؟ کیا تم جانتے ہو کہ کس کی بیٹی کو ہاتھ لگا کر موت کو پکارا ہے؟"

وہ حیرانی سے بولا۔ "سر! آ......... آپ ہیں۔ میں کامران بول رہا ہوں۔ یہ......... یہ مس نازو کیا آپ کی صاحب زادی ہیں؟"

حمزہ بیگ نے شدید حیرانی سے پوچھا۔ "گدھے کے بچے! تم کامران ہو؟ وہاں تو روبی تھی۔ ابھی میں نے اس سے باتیں کی تھیں پھر وہاں میری بیٹی کیسے پہنچ گئی؟"

"سر! ہم ٹریپ کیے گئے ہیں۔ اچانک بازی پلٹ گئی ہے۔ چند مسلح افراد نے ہمیں چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔ پیر شاہ سلطانی کا پوتا سنی یہاں آیا تھا۔ وہ روبی کو لے گیا ہے۔ اس کے جانے کے بعد یہ مسلح افراد آپ کی صاحب زادی کو یہاں لے آئے ہیں۔"

"ان بدمعاشوں کا سرغنہ کون ہے؟ اسے فون دو۔"

کامران نے قد آور شخص کی طرف فون بڑھایا۔ اس نے فون لے کر کان سے لگا کر اس کے قریب ایک چٹکی بجائی پھر دوسری چٹکی بجائی۔ ادھر سے پوچھا گیا۔ "یہ کیسی آواز ہے؟"

"یہ چٹکی ہے۔ چٹکی ایک آواز بھی ہے اور موت کا اشارہ بھی۔ اسے پھر ایک بار سن لو۔"

اس نے دوبارہ چٹکی بجائی پھر کہا۔ "میرا نام چٹکی بادشاہ ہے۔ میں کسی بھی مخالف کو ایک چٹکی میں مسل دیتا ہوں۔"

"میرے آدمی نے بتایا ہے کہ میرے دشمن کا پوتا آیا تھا' وہ روبی کو لے گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم گاڈ فادر پیر شاہ سلطانی کے لیے کام کر رہے ہو؟"

"کیا تمہارے لیے بھی کام کروں؟"

"ہاں' جو مانگو گے دوں گا۔ بولو کیا چاہتے ہو؟"

"میں چاہتا ہوں' یہاں جو شرمناک ویڈیو کیسٹ تیار ہونے والا تھا وہ بے شرمی نہ ہو۔ اگر ہو گی تو روبی جا چکی ہے اور نازو ہے۔ میری بات ایک چٹکی میں سمجھ میں آ جاتی ہے۔"

اس نے چٹکی بجائی۔ حمزہ بیگ نے کہا۔ "ہاں بالکل۔ میں سمجھ گیا ہوں۔ ایسی بے شرمی نہیں ہونی چاہیے۔"



"بازی پلٹنا میرا کام ہے۔ اگر میں نازو کو یہاں سے ہٹا کر دوبارہ روبی کو لے آؤں تو معاوضہ کیا ہو گا؟"

"آں؟ تم اسے بے شرمی بھی کہہ رہے ہو اور ایسے کام کے لیے معاوضے کی بات بھی کر رہے ہو؟"

وہ چٹکی بجا کر بولا۔ "وقت ضائع نہ کرو۔ ایک چٹکی میں سمجھ لیا کرو۔ روبی تمہارے دشمن کی بیٹی ہے۔ شرم اپنی بیٹی کے لیے ہوتی ہے' دشمن کی بیٹی کے لیے نہیں۔"

"ہاں بالکل۔ اس دشمن کو میں پچھلی رات سے توڑتا آ رہا ہوں۔ اگر تم روبی کے سلسلے میں تعاون کرو تو وہ گاڈ فادر شرم کے مارے خودکشی کر لے گا۔"

"تم تعاون کے لیے کہہ رہے ہو تو میں انکار نہیں کروں گا۔ میں کسی کا دل توڑنا نہیں چاہتا۔ پیر شاہ سلطانی نے بھی مجھ سے تعاون کی درخواست کی تھی۔ میں اس کا بھی دل توڑنا نہیں چاہتا۔"

"تم یہ کیسی باتیں کر رہے ہو؟"

وہ چٹکی بجا کر بولا۔ "ایسی باتیں ایک چٹکی میں سمجھ میں آ جاتی ہیں۔ بھئی میں دونوں سے تعاون کر رہا ہوں۔ ابھی یہاں روبی اور نازو دونوں کی ویڈیو فلم ان چرسی جوانوں کے ساتھ تیار ہو گی۔ میں روبی کی فلم تمہیں دوں گا اور نازو کی فلم پیر شاہ سلطانی کے حوالے کر دوں گا۔ میرا دل بھی مطمئن رہے گا کہ میں نے دونوں سے تعاون کیا ہے۔"

"نہیں۔ تم ایسا نہیں کرو گے۔ ذرا ایک منٹ ہولڈ آن کرو۔"

"کوئی چالاکی دکھانے سے پہلے اور اپنی اس کوٹھی کا محاصرہ کر کے مجھے مجبور کرنے سے پہلے یہ سوچ لینا کہ اس علاقے میں تمہارا ایک بھی بندہ نظر آئے گا تو یہ نازوں کی پالی نازو زندہ نہیں ملے گی۔"

"تم اسے عزت و آبرو کے ساتھ رہا کرنے کی قیمت بتاؤ۔"

"تم نے بڑی چالبازی سے بیگم برکت شاہ سلطانی کی فیکٹری مفت میں حاصل کر لی ہے۔ وہ فیکٹری دوبارہ ان کے نام منتقل کرو اور برکت شاہ سلطانی کا کیس ختم کراؤ۔"

"اس فیکٹری کو بیگم برکت شاہ کے نام پکے کاغذات پر منتقل کرنے کے لیے کل

کچہری کھلنے کا انتظار کرنا ہوگا۔"

"تو پھر انتظار کرو۔ جب تک فیکٹری بیگم برکت شاہ کو نہیں ملے گی' برکت شاہ کا کیس ختم نہیں ہوگا اور جمشید کی گاڑی اسے واپس نہیں کی جائے گی' تب تک تمہاری صاحبزادی بطور یرغمال میرے پاس رہے گی۔ میں اسے لے جا رہا ہوں۔"

"نہیں ٹھہرو۔ میری بیٹی کو کسی دوسری جگہ نہ لے جاؤ۔"

"تم وہاں چیختے رہو۔ یہاں بیٹی کو سمجھا دو کہ میرے ساتھ کہیں بھی رہ کر شور نہ مچائے' چالاکی نہ دکھائے ورنہ ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر اس کی زندگی کی چٹکی بجا دوں گا۔"

اس نے فون نازو کو دیا۔ وہ روتے ہوئے بولی۔ "بابا جانی! میں اس بدمعاش کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔ آپ مجھے کسی طرح یہاں سے نکالیں۔"

"بیٹی! اس سے کہو' ہمیں تھوڑا سا وقت دے۔ میں خود پیر شاہ سلطانی سے معاملات طے کر رہا ہوں۔"

نازو نے اپنے باپ کی بات چٹکی بادشاہ کو سنائی' وہ بولا۔ "ہمارا گاڈ فادر جب سوتا ہے تو اپنے تمام ٹیلی فون کنکشن ختم کر دیتا ہے۔ وہ سوتا ہے اور ہم جاگتے ہیں۔ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ کوئی بھی دشمن ایک چٹکی میں شرائط تسلیم نہ کرے تو اس پر جرمانہ کیا جائے۔ جو شرائط میں نے بیان کی تھیں اب اس کے ساتھ جرمانہ یہ ہے کہ وہ بیٹی کو حاصل کرنے سے پہلے نیویارک کے بینک اکاؤنٹ میں پچیس لاکھ ڈالر جمع کر دے۔ اس کے بعد بھی بحث کی گئی تو پچاس لاکھ ڈالر جمع کرنے ہوں گے۔ اس طرح جرمانے کی رقم بڑھتی جائے گی۔"

حمزہ بیگ نے یہ باتیں سن کر کہا۔ "بیٹی! صبر کرو۔ حوصلے سے کام لو۔ میں کل دن کے بارہ یا ایک بجے تک ان کی تمام شرائط پوری کر کے تمہیں اس کی قید سے لے آؤں گا۔"

"آپ تو کراچی میں ہیں' مجھے کیسے لینے آئیں گے؟"

"میں کل کسی بھی فلائٹ سے آؤں گا۔ اگر کسی وجہ سے نہ آ سکا تو میرا خاص



ماتحت نعیم صدیقی تمہیں لینے آئے گا۔"

چٹکی بادشاہ نے غرا کر کہا۔ "چلو اٹھو ورنہ یہاں شوٹنگ شروع کرا دوں گا۔"

وہ فوراً ہی اٹھ کر کھڑی ہو گئی' پھر بولی۔ "میں جا رہی ہوں بابا جانی! لیکن آپ یہ ضرور سوچیں کہ پرائی بیٹی کے ساتھ جو بے شرمی کی جانے والی تھی وہ آپ کی بیٹی کو کتنی مہنگی پڑ رہی ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے فون کو بند کیے بغیر ایک طرف پھینک دیا۔ پھر چٹکی بادشاہ کے قریب آ گئی۔ وہ اپنے مسلح ساتھیوں سے بولا۔ "میں اسے لے کر جا رہا ہوں۔ یہ جتنے دو ٹکے کے بدمعاش ہیں ان سب کو..........."

اس نے بات ادھوری چھوڑ کر چٹکی بجائی پھر نازو کا بازو پکڑ کر وہاں سے کھینچتا ہوا لے گیا۔

★============★============★

پیر عظمت اللہ شاہ سلطانی کی عادت تھی' وہ صبح پانچ بجے سے پہلے بیدار ہو جاتے تھے پھر معمول کے مطابق جتنے اہم کام ہوتے تھے' انہیں انجام دیتے تھے۔ ان دنوں پہلا ضروری کام یہ تھا کہ آنکھ کھلتے ہی وہ بستر پر لیٹے ہی لیٹے اپنی فرمانبردار بیٹی ہاجرہ کو فون کرتے تھے۔ اس سے کچھ پیار بھری باتیں کرتے تھے۔ اس کے بعد بستر سے اٹھ جاتے تھے۔

اس روز انہوں نے رابطہ کیا تو دوسری طرف فون کی گھنٹی بجتی رہی لیکن بیٹی نے ریسیور اٹھا کر اپنی آواز نہیں سنائی۔ انہوں نے دیر تک انتظار کیا۔ حیرانی اور پریشانی سے سوچا' بیٹی فوراً ہی فون اٹینڈ کیا کرتی تھی۔ ایسی کیا بات ہو گئی ہے کہ فون کی گھنٹی نہیں سن رہی ہے۔ وہ نہ سہی' کم از کم ملازمہ کو فون اٹینڈ کرنا چاہیے۔

انہوں نے اپنے خاص ماتحت دھنی بخش سے رابطہ کیا پھر کہا۔ "

ہیں۔"

"یس سر! یہ کامیابی کی صبح ہے۔ حمزہ بیگ نے گھٹنے ٹیک........"

انہوں نے بات کاٹ کر کہا۔ "ہم ابھی کوئی رپورٹ نہیں سنیں گے۔ تم فوراً سوسائٹی والی کوٹھی میں جاؤ۔ وہاں ہماری بیٹی اور اس کی ملازمہ دونوں ہی فون اٹینڈ نہیں کر رہے ہیں۔ ہمیں آدھے گھنٹے کے اندر ان کی خیریت سے آگاہ کرو۔"

انہوں نے فون بند کر دیا۔ ان کے دل میں طرح طرح کے اندیشے پیدا ہو رہے تھے۔ ان کا مخالف گاڈفادر حمزہ بیگ پچھلی رات سے ان کے بیٹے بہو اور پوتے پوتی کو نقصان پہنچانے کی بھرپور کوششیں کر رہا تھا اور بڑی حد تک کامیاب بھی ہو رہا تھا۔ اس



طرح یہ اندیشہ بھی بار بار پیدا ہو رہا تھا کہ اس نے ہاجرہ کو اس کوٹھی میں شاید اتفاق سے دیکھ لیا ہو اور اسے اغوا کر لیا ہو۔

انہوں نے آدھے گھنٹے تک انتظار کیا۔ دھنی بخش نے فون پر کہا۔ "سر! بری خبر ہے۔ یہاں آپ کی صاحب زادی نہیں ہیں۔ ملازمہ ایک کمرے میں بند تھی۔ کسی نے باہر سے دروازہ بند کر دیا تھا۔ اس نے کسی کو کوٹھی میں آتے اور ہاجرہ بی بی کو جاتے نہیں دیکھا ہے۔"

"ہوں۔ تمہارا کیا خیال ہے' کیا حمزہ بیگ کا آخری وقت آ گیا ہے؟"

"نو سر! وہ تو ہوا نکلے ہوئے غبارے کی طرح پچک گیا ہے۔ لاہور میں چٹکی بادشاہ حمزہ بیگ کی بیٹی نازو کو یرغمال بنا کر لے گیا ہے۔ جب تک وہ ہماری تمام شرائط پوری نہیں کرے گا اسے بیٹی نہیں ملے گی۔ اگر وہ ہاجرہ بی بی کو اپنے قبضے میں رکھتا تو ہمارے آگے گھٹنے نہ ٹیکتا۔ بیٹی کے بدلے بیٹی کا مطالبہ کرتا۔"

بات معقول تھی۔ انہوں نے کہا۔ "کل ہمارے گارڈ نے سائیں رب راکھن کے بیٹے کو گولی ماری تھی۔ کیا رب راکھن انتقام لینے کے لیے ہاجرہ تک پہنچ سکتا ہے؟"

"نو سر! رب راکھن کسی بھی صورت میں آپ کے لیے چیلنج نہیں بنے گا۔ اول تو اس کا بیٹا زندہ سلامت ہے پھر شہناز بی بی اس کی تیمارداری کے لیے ابھی تک اسپتال میں ہیں۔ رب راکھن آپ سے دوستی رکھنا چاہتا ہے پھر اس کی لائن الگ ہے۔ وہ صرف ڈاکوؤں اور دہشت گردوں کے ذریعے بڑا مال کماتا ہے۔ ہمارے معاملات اس کے معاملات سے بالکل الگ ہیں۔ مجھے آپ کے داماد پر شبہ ہے۔ صداقت صاحب بڑی زبردست چالیں چلتے ہیں۔"

انہوں نے ناگواری سے سوچا پھر کہا۔ "اس نے ہاجرہ سے کہا تھا کہ اسے صبح تک ڈھونڈ نکالے گا۔ اگر ناکام ہو گا تو پھر شہناز بیٹی کے ساتھ لندن چلا جائے گا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ لندن جائے گا یا نہیں؟ اگر جائے گا تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ وہ ہاجرہ کو ڈھونڈ نکالنے میں ناکام رہا ہے اور اگر وہ جانے کا ارادہ ترک کر دے گا تو........"

بات ادھوری رہ گئی۔ سرہانے رکھے ہوئے فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ انہوں نے

دھنی بخش سے ہولڈ آن کے لیے کہا پھر فون کا ریسیور اٹھا کر کہا۔ "ہیلو! ہم بول رہے ہیں۔"

دوسری طرف سے صداقت کی آواز آئی۔ "آپ بولتے ہی رہیں گے اور میری بیوی ہاجرہ نہ جانے کتنے عرصے تک حبس بے جا میں رہے گی۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اغوا کرنے والے دشمن پر بھروسا کروں گا۔ وہ ضرور ہاجرہ کو میرے پاس لندن پہنچا دے گا۔"

"کیا تم نے ملک چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا ہے؟"

"اور کیا کر سکتا ہوں۔ دشمن کی شرط کے مطابق آج نہ گیا تو نہ جانے ہاجرہ پر اور کیا قیامت ٹوٹے گی۔ میں نے اس لیے فون کیا ہے کہ آپ شانی کو سفر کی تیاریاں کرنے کی ہدایت کریں۔ اسے بتائیں کہ وہ میرے ساتھ آج شام کی فلائٹ سے لندن جا رہی ہے۔"

"وہ پچھلی رات ایک زخمی جوان کو اسپتال لے گئی تھی۔ پتہ نہیں واپس آئی ہے یا نہیں؟ تم نے اسے بہت سر پر چڑھا رکھا ہے۔"

"کیا آپ نے اپنی بیٹی کو سر پر نہیں چڑھایا ہے؟"

"ہمیں ہاجرہ سے جتنی محبت ملی ہے' وہ اور کسی اولاد سے نہیں ملی۔"

"میں جانتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ آپ کی بیٹی کو آپ سے ملا دوں۔"

انہوں نے چونک کر پوچھا۔ "کیسے ملاؤ گے؟ کیا تم نے اسے ڈھونڈ نکالا ہے؟"

"اگر وہ مجھے یہاں مل جاتی تو میں ملک چھوڑ کر نہ جاتا مگر وہ لندن میں یقیناً ملے گی۔ آپ بیٹی کو دل و جان سے چاہتے ہیں لہٰذا اس سے ملنے وہاں ضرور جائیں گے۔"

وہ تو صبح اٹھتے ہی بیٹی کی آواز نہ سن کر بے چین ہو گئے تھے اور اب تجسس میں مبتلا ہو گئے تھے کہ کسی نے ملازمہ کو کمرے میں بند کرنے کے بعد ہاجرہ کو اغوا کیا ہے؟ کیا اسے اغوا کرنے والے پُراسرار دشمن کا سراغ مل سکتا ہے؟

صداقت نے کہا۔ "میرے لندن جانے کی دو اہم وجوہات ہیں۔ ایک تو یہ کہ مجھے میری شریک حیات واپس مل جائے گی۔ دوسری اہم وجہ یہ ہے کہ میں ہاجرہ سے یہ



حقیقت اگلوا لوں گا کہ اسے کس نے اغوا کیا ہے۔ اگر آپ پسند فرمائیں کہ وہ حقیقت اگلے تو پھر آپ بھی ایک دو روز میں لندن پہنچ جائیں۔"

پیر شاہ سلطانی کے لیے بڑا آزمائشی وقت تھا۔ یہ تو انہوں نے ہی اغوا کرنے والے کی حیثیت سے بالواسطہ داماد سے کہا تھا کہ ہاجرہ لندن پہنچا دی جائے گی لیکن اب تو ہاجرہ ان کے پاس نہیں تھی۔ جو بھی اسے لے گیا تھا وہ اسے لندن نہ پہنچاتا۔ وہ کوئی انجانا دشمن ان کے داماد ڈائریکٹر جنرل کو شاید کسی معاملے میں بلیک میل کر رہا ہو۔

انہوں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "ہم لندن نہیں جائیں گے۔"

"تعجب ہے۔ جس بیٹی کو بیٹوں سے زیادہ چاہتے ہیں اور اس پر اندھا اعتماد کرتے ہیں' اس سے ملنے نہیں جائیں گے۔"

"تم اپنے معاملات میں بہت زیادہ ذہین ہو۔ دشمن پر اعتماد کر رہے ہو تو کچھ سوچ کر وہاں ہاجرہ کو پانے کی امید کر رہے ہو لیکن ہم اس بیٹی کو اغوا کرنے والے پر بھروسہ نہیں کریں گے۔ وہ تمہیں دھوکا دے رہا ہے۔ وہ ہاجرہ کو کبھی تمہارے پاس نہیں بھیجے گا۔"

"جرائم کی دنیا میں آپ کا بڑا رعب اور دبدبہ ہے۔ وہ ہاجرہ کو میرے پاس نہ سہی' آپ کے پاس بھیج سکتا ہے۔"

"یہ تو سراسر احمقانہ باتیں کر رہے ہو۔"

"میں ایک منطقی بات کہہ رہا ہوں۔ چونکہ وہ پہلے آپ کی بیٹی تھی' نکاح کے بعد میری بیوی ہوئی۔ اس حساب سے آپ کے بڑے حقوق ہیں۔"

ایسے ہی وقت خواب گاہ کے دروازے پر زور زور سے دستک ہوئی۔ صداقت نے کہا۔ "مجھے کھٹ کھٹ کی آواز سنائی دے رہی ہے۔ کیا آپ کے دروازے پر دستک ہو رہی ہے؟"

"ہاں۔ شانی ہو گی۔ ذرا ایک منٹ ہولڈ آن رکھو۔"

پھر انہوں نے دھنی بخش سے کہا۔ "ہم تم سے بعد میں گفتگو کریں گے۔"

انہوں نے موبائل فون کو بند کیا۔ دوسرے فون کے ریسیور کو کریڈل سے ہٹا کر

ایک طرف رکھا پھر بستر کے پاس سے چلتے ہوئے دروازے تک آئے۔ اس کے بعد اندر کے لاک کو کھولنے کے بعد دروازہ کھولا تو ایک دم سے حیرت زدہ رہ گئے۔

کھلے ہوئے دروازے کے باہر ان کے روبرو ہاجرہ کھڑی ہوئی تھی۔

وہ ایک بیٹی تھی۔ باپ نے اس کے شوہر کی مخالفت میں اسے اغوا کیا تھا۔

وہ ایک بیوی تھی۔ شوہر نے اس کے باپ کی ایک کوٹھی سے اسے اغوا کیا تھا۔

گھریلو معاملات میں رشتے دار کسی ایک رشتے کو ایک گھر سے دوسرے گھر لے جائیں تو اسے اغوا نہیں کہتے لیکن لانے اور لے جانے کی نیت میں مجرمانہ مفادات ہوں اور قانون کی گرفت بھی ہو تو پھر وہ اغوا کا کیس بن جاتا ہے۔

ہاجرہ کا کیس پردۂ راز میں تھا۔ وہ بیٹی اور بیوی کے مرکب سے ایک سنگریزہ بن گئی تھی اور دو چٹانوں کے درمیان پس رہی تھی۔

اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام رکھا تھا۔ باپ نے جیسے ہی آگے بڑھ کر بیٹی کہا' وہ چکرا کر فرش پر گر پڑی۔

ہاجرہ اپنے ابا حضور کے بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ اسے تیز بخار تھا۔ ایک لیڈی ڈاکٹر نے اس کا ٹمپریچر دیکھنے کے بعد اس کے سر پر آئس بیگ رکھا۔ اس کی تیمارداری کرتی رہی۔ اس دوران پیر عظمت اللہ شاہ سلطانی کمرے میں ٹہلتے رہے۔ تشویش بھری نظروں سے بیٹی کو دیکھتے رہے۔

وہ ایسی سعادت مند بیٹی تھی کہ شادی کے دوسرے سال جب شہناز عرف شانی چار ماہ کی تھی تو ابا حضور کے حکم پر شوہر اور بیٹی کو چھوڑ کر چلی آئی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ میکے آکر اپنے شوہر اور باپ کے درمیان بڑھتے ہوئے اختلافات کو ختم کرے یا کم کرے۔ وہ ایسا باپ کے قریب رہ کر کر سکتی تھی۔

وہ صداقت کے نام ایک خط لکھ کر آئی تھی۔ "آپ مجھے غلط نہ سمجھیں۔ میں آپ کے اور ابا حضور کے درمیان رہ کر الجھ جاتی ہوں۔ میں ان کی ضد سے میکے جا رہی ہوں۔ آپ سے بھی چلنے کو کہتی تو آپ راضی نہ ہوتے اس لیے شہناز بیٹی کو آپا کے پاس چھوڑ کر جا رہی ہوں۔ جب یہ ننھی سی جان ماں کے لیے روئے گی تو آپ کا دل پسیج



جائے گا اور آپ بیٹی کے ساتھ میرے پاس ضرور آئیں گے۔ میں ابا حضور کے مزاج کو خوب سمجھتی ہوں اس لیے ان کے قریب رہ کر رفتہ رفتہ انہیں قائل کر سکتی ہوں کہ آپ سچے محب وطن اور قانون پسند ہیں اس لیے ان کی مخالفت کرتے ہیں۔ آپ بھی میری اور اپنی بیٹی کی خاطر اپنے رویے میں ذرا سی لچک پیدا کریں اور کچھ دنوں کے لیے کراچی چلے آئیں.........."

لیکن صداقت بیٹی کو لے کر نہیں آیا۔ پیر عظمت اللہ شاہ سلطانی اس سے پیچھا چھڑانا چاہتے تھے کیونکہ ان دنوں صداقت ان کے ایک بہت بڑے منصوبے میں حائل ہو رہا تھا۔ انہوں نے اپنے بڑے بڑے ذرائع اختیار کر کے اس کا انٹیلی جنس کے شعبے سے لندن کے سفارت خانے میں تبادلہ کرا دیا۔ ان کی اس حرکت سے صداقت علی کے اندر مزید تلخی پیدا ہو گئی اور وہ ہاجرہ کو چھوڑ کر بیٹی کو لے کر لندن چلا گیا۔

پیر عظمت اللہ شاہ سلطانی نے کمرے میں ٹہلنے کے دوران بیمار بیٹی کو دیکھا۔ وہ دل سے اعتراف کرتے تھے کہ بیٹی نے باپ کے لیے بڑی بڑی قربانیاں دی ہیں۔ وہ اپنی چار ماہ کی بچی سے جدا ہو گئی تھی۔ اس نے ابا حضور کی خاطر اپنے اندر ممتا کو دفن کر دیا تھا۔ برسوں تک بیٹی سے جدا رہی تھی۔ شوہر کو دل و جان سے چاہتی تھی مگر سسرال سے زیادہ میکے میں رہی تھی۔

اس کے برعکس بیٹے نافرمانی کا ایسا کھلا مظاہرہ کر چکے تھے کہ باپ کو چھوڑ کر بیویوں کے آنچل پکڑ کر گھر سے چلے گئے تھے۔ جبکہ آخری سانس تک بیٹے سہارا ہوتے ہیں اور بیٹیاں پرائی ہو جایا کرتی ہیں۔ جانے ایسی کتنی بیٹیاں ہیں جو اپنے سسرال میں اپنے شوہر اور بچوں کے درمیان رہ کر ان کی تمام ذمے داریاں پوری کرتی ہیں اور میکے میں چھوٹ جانے والے ماں باپ کو ایک آہ کے ساتھ یاد کرتی ہیں۔ کبھی میکے آتی ہیں تو ماں کے منع کرنے کے باوجود چولہے کے پاس بیٹھ کر کوئی ایسی ڈش تیار کرتی ہیں جو ان کے والدین ہمیشہ سے پسند کرتے آئے ہیں۔

ٹہلنے کے دوران پیر شاہ سلطانی کی کمر پہلی بار جھک گئی۔ وہ گرنے کے انداز میں صوفے پر بیٹھ گئے۔ اگرچہ عمر کے لحاظ سے کمر کو جھکنا چاہیے تھا لیکن بیٹی کی محبت نے

بیٹوں کی منافقت اور خود غرضی کو اتنی صفائی سے واضح کیا تھا کہ وہ ہمیشہ کی طرح تن کر نہ رہ سکے۔ گاڈ فادر نہ کبھی جھکتا ہے' نہ کبھی گرتا ہے۔ وہ گرتے گرتے صوفے کے سہارے بیٹھ گئے تھے۔

اسی وقت شانی اسپتال سے واپس آئی۔ اس نے نانا جان کی خواب گاہ کے دروازے کو کھلا دیکھا تو دہلیز پر آئی۔ نانا جان نڈھال سے ہو کر صوفے پر بیٹھے ہوئے نظر آئے پھر اس کی نظر لیڈی ڈاکٹر پر گئی۔ اس کے بعد بستر پر لیٹی ہوئی ماں کو دیکھتے ہی وہ تڑپ گئی۔ تیزی سے چلتی ہوئی بستر کے قریب آئی۔ ماں کی آنکھیں بند تھیں۔ لیڈی ڈاکٹر کی موجودگی نے سمجھا دیا تھا کہ ماں بیمار ہے۔ اس نے چھو کر دیکھا۔ بخار تھا' مگر کم ہو چکا تھا۔ اس نے نانا جان کی طرف دیکھا۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے تسلی دی۔ وہ بستر سے ہٹ کر صوفے کے پاس آئی۔ ان کے پاس بیٹھ کر کاغذ قلم نکال کر لکھا۔ "ممی کب آئی ہیں؟ انہیں کیا ہوا ہے؟ کیا اغوا کرنے والے نے ٹارچر کیا ہے؟"

انہوں نے کاغذ قلم لے کر لکھا۔ "کسی نے ٹارچر نہیں کیا ہے۔ ایسی بات بھی نہ سوچو۔ یہ صبح ساڑھے پانچ بجے اچانک کہیں سے آئی ہے۔ جب اس کی طبیعت سنبھلے گی تو ہم کچھ معلوم کر سکیں گے' جاؤ تم آرام کرو۔"

"میں نہیں جاؤں گی۔ ممی اتنے دنوں کے بعد آئی ہیں اور بیمار ہیں۔ میں ان کے پاس رہوں گی۔"

"سیکیورٹی افسر نے مجھے اسپتال سے ابھی فون پر بتایا ہے کہ تم وہاں تمام رات جاگتی رہی ہو۔ تمہیں اب سونا چاہیے ورنہ بیمار پڑ جاؤ گی۔"

"میں نے کہہ دیا' نہیں جاؤں گی۔ نیند آئے گی تو اسی کمرے میں ممی کے پاس سو جاؤں گی۔"

"چلو۔ یہ بھی ٹھیک ہے۔ تم ماں کے پاس رہو۔ میں غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر نیچے ڈرائنگ روم میں چلا جاؤں گا۔"

شانی وہاں سے اٹھ کر ان کا لباس' تولیا اور صابن وغیرہ لے جا کر غسل خانے میں رکھنے لگی۔ لیڈی ڈاکٹر نے کہا۔ "جناب! اب تشویش کی کوئی بات نہیں ہے۔ انہیں



آرام سے سونے دیں۔ بخار آہستہ آہستہ اترتا جائے گا۔ آپ یہ دوائیں منگوالیں۔ میں جارہی ہوں۔ جب بھی ضرورت پڑے بلا لیجئے گا۔"

وہ نسخہ دے کر چلی گئی۔ انہوں نے نسخہ ایک طرف سرہانے کے میز پر رکھا پھر باتھ روم میں چلے گئے۔ شانی ماں کے پاس آ کر لیٹ گئی۔ سونے والی کو بڑے پیار سے دیکھنے لگی۔ اس نے اپنے نانا سے تحریر کے ذریعے یونہی پوچھ لیا تھا' کیا کسی نے ممی پر ٹارچر کیا ہے؟

پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ وہ گونگی بہری سمندر سے زیادہ گہری تھی۔ یہ جانتی تھی کہ ماں کہاں خیریت سے تھی اور اب کہاں سے آئی ہے؟ ماں اگر اس کے نانا جان کی رازدار تھی تو وہ گونگی اپنے باپ کی رازدار بن کر رہا کرتی تھی۔ اکثر خاندانوں میں محبتیں اور مخالفتیں ہوتی ہیں۔ رشتے ایک دوسرے کی مخالفت کرنے کے باوجود ایک دوسرے سے بے انتہا محبت کرتے رہتے ہیں۔

شانی نے جھک کر خوابیدہ ماں کی پیشانی کو چوم لیا پھر ہولے ہولے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

پیر شاہ سلطانی آدھے گھنٹے بعد غسل خانے سے نکل کر کمرے میں آئے تو دیکھا شانی ماں سے لپٹ کر سو رہی تھی۔ وہ مسکرانے لگے۔ تھوڑی دیر تک بڑی محبت سے بیٹی اور نواسی کو دیکھتے رہے پھر ڈرائنگ روم کی طرف جانا چاہتے تھے کہ بیٹی کی ہلکی سی آواز سن کر رک گئے۔

اس کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ نیند میں بڑبڑا کر چپ ہو گئی تھی۔ پیر شاہ سلطانی بیٹی کے قریب آئے۔ اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر دیکھا۔ بخار اتر چکا تھا برائے نام حرارت تھی۔

اس کے ہونٹوں میں لرزش پیدا ہوئی۔ انہوں نے جھک کر کان لگا کر سنا۔ وہ پھر بڑبڑا رہی تھی۔ "کچھ نہیں۔ کچھ بھی نہیں ہوں میں........ پانی........ ہوں پانی........ باپ کے برتن میں........ وفاداری........ شوہر کے برتن میں........ دیانت داری........ میں برتنوں سے گرتی بھی نہیں ہوں میں بہتی بھی نہیں ہوں۔ خدا

خدا نہ کرے........ کسی برتن........ میں........ چھید ہو اور........ میں ٹپک کر مٹی میں مل جاؤں........ خدا........ اے خدا! میرے برتنوں........ کو........ سلامت رکھ........"

ہونٹ بند ہو گئے۔ انہوں نے کچھ دیر انتظار کیا۔ اب وہ نہیں بڑبڑا رہی تھی۔ وہ سیدھے کھڑے ہو گئے۔ ان کے چہرے پر گہری سنجیدگی اور فکر کے آثار تھے۔ صحیح معنوں میں وفادار رہنے والی بیٹی نے باپ کے سامنے شوہر کی دیانت داری کے قصیدے پڑھے تھے اور یہ سمجھاتی بھی رہتی تھی کہ وہ اس بڑھاپے میں جرائم کی دنیا سے نکل آئیں۔ کوئی دوسرا انہیں سمجھانے کی جرأت کرتا تو اس کا منہ توڑ دیتے لیکن لاڈلی بیٹی کی باتوں کو ہنس کر ٹال دیتے تھے اور اسے یہ ایک بات کہہ کر چپ کرا دیتے تھے کہ شہناز کے لیے کئی اعلیٰ خاندانوں سے رشتے آ رہے ہیں۔ اپنی اسی بیٹی کو کسی چھوٹے سے مکان میں شرافت کی زندگی گزارنے کے لیے لے جاؤ تو کوئی اس گونگی بہری کا رشتہ مانگنے نہیں آئے گا۔ اپنی بیٹی پر شریفانہ غربت کا نہیں' شریفانہ دولت کا لیبل لگائے رکھو۔

انہوں نے خوابیدہ ماں بیٹی کو دیکھا۔ پھر کمرے سے موبائل اٹھا کر باہر کاریڈور میں آئے۔ کال بیل کے بٹن کو دبایا۔ کچن کا ملازم عبداللہ دوڑتا ہوا آیا۔ انہوں نے کہا۔ "ہمارا حقہ اٹھا کر باہر رکھو پھر حقہ برداروں کو باہر سے بلاؤ۔ وہ یہ سامان ڈرائنگ روم میں پہنچائیں گے' پھر ہمارے لیے ناشتا لاؤ۔" ملازم کے حقہ اٹھانے کے بعد انہوں نے اپنی خواب گاہ کا دروازہ بند کر دیا۔

انہوں نے کاریڈور اور بالکونی سے گزرتے ہوئے موبائل فون کے نمبر ڈائل کیے پھر رابطہ ہونے کے بعد زینے سے اترتے ہوئے کہا۔ "ہیلو! ہم بول رہے ہیں۔"

دوسری طرف سے دھنی بخش نے کہا۔ "یس سر! میں حاضر ہوں۔"

"تم تمام رات جاگتے رہے ہو۔ مجھے مکمل رپورٹ سنا کر آرام کرو۔"

"شکریہ سر! ہم نے آپ کے تمام فیملی ممبرز کے پیچھے اپنے آدمی لگا رکھے تھے۔ فوری اطلاع ملنے کے باعث آپ نے اپنے بڑے صاحب زادے کو حوالات سے نکال لیا لیکن فیکٹری اور ایکارڈ ہاتھ سے نکل گئی تھیں۔ حمزہ بیگ نے تیسرا زبردست حملہ روبی کو



پھانس کر کیا۔ اسے اس کے فراڈ بوائے فرینڈ کامران کے ساتھ لاہور بھیج دیا۔ اس کا ارادہ بڑا ہی شرمناک تھا۔ وہ مس روبی کی ویڈیو فلم تیار کرنے والا تھا جسے دیکھ کر ہم حمزہ بیگ کے ہاتھوں کٹھ پتلی بن جانے پر مجبور ہو جاتے۔ ہمارے دو آدمی مس روبی کا تعاقب کرتے ہوئے لاہور گئے تھے۔ ایسے وقت ہمارے سنی بابا نے فون پر مجھ سے رابطہ کیا۔ میں نے آپ کے خاص ماتحت چٹکی بادشاہ کو اطلاع دی۔ سر! اس چٹکی بادشاہ نے بڑا زبردست کام دکھایا ہے۔ اس نے حمزہ بیگ کی ایک بیٹی نازو کو اغوا کر لیا۔ حمزہ کے غنڈوں کو چاروں طرف سے گھیر کر دھمکی دی کہ اب ایسی ہی شرمناک فلم نازو کی تیار کی جائے گی۔"

پیر شاہ سلطانی نے ناشتے کی میز پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "ہمارا یہ لاہوری چٹکی بادشاہ خوب چٹکیاں بجاتا ہے' آگے بولو۔"

"چٹکی بادشاہ نے حمزہ بیگ سے کہا۔ بیٹی کی عزت و آبرو کی سلامتی چاہتے ہو تو بیگم برکت شاہ کی فیکٹری دوبارہ ان کے نام لکھ دو۔ جشید کی ایکارڈ واپس کر دو اور جرمانے کے طور پر پچیس لاکھ ڈالر ادا کرو۔ حمزہ بیگ نے گھٹنے ٹیک دیے ہیں۔ وہ آج دوپہر تک یہ تمام شرائط پوری کرے گا تو اس کی بیٹی اسے واپس کر دی جائے گی۔"

"چٹکی بادشاہ سے کہو۔ ہم اس سے بہت خوش ہیں۔ اس کے اکاؤنٹ میں دو لاکھ روپے جمع کرا دو۔ یہ روبی کہاں ہے؟"

"سنی بابا اسے اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔"

"چٹکی بادشاہ سے کہو۔ روبی اور سنی کی نگرانی اور حفاظت ہوتی رہے اور کوئی خاص بات؟"

"نو سر! ایوری تھنگ اِز آل رائٹ۔"

"ٹھیک ہے۔ اپنی ڈیوٹی اور موبائل فون گل خان کو دو اور اب تم آرام کرو۔"

"سر! ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔"

عبداللہ میز پر ناشتا لا کر رکھ رہا تھا۔ انہوں نے کہا۔ "پوچھو۔"

"آپ دو گھنٹے پہلے ہاجرہ بی بی کے لیے پریشان تھے۔ کیا ان کا سراغ مل گیا ہے؟"

"وہ خلاف توقع خود ہمارے پاس آ گئی ہے۔ ہم حیران ہیں کہ جو اسے اغوا کر کے

لے گیا تھا' اس نے کس مقصد سے' اسے رہائی دے دی۔ وہ بیمار ہے اور سو رہی ہے۔ جب بیدار ہو گی تو اس سے صحیح حالات معلوم ہوں گے۔"

انہوں نے فون بند کیا پھر ناشتہ کرتے ہوئے عبداللہ سے کہا۔ "باہر جاؤ اور سیکیورٹی افسر سے پچھلی رات کی رپورٹ لاؤ۔"

وہ چلا گیا۔ انہوں نے ناشتے کے دوران سوچا۔ ایک گڑبڑ ہو گئی۔ شانی نے ہاجرہ کو ہمارے پاس دیکھ لیا ہے۔ وہ اپنے باپ کو ضرور اپنی ماں کی واپسی کے بارے میں بتائے گی۔ پھر صداقت کو معلوم ہو گا تو وہ لندن نہیں جائے گا۔ ہمارا بڑا نقصان ہو گا۔

نقصان اس طرح ہو رہا تھا کہ رئیس ہمدانی جیسے قرض نادہندگان سے ساڑھے تین کروڑ روپے وصول کیے تھے۔ اس کے عوض قرضوں کی فائلیں غائب کرا دی تھیں لیکن ان کا اپنا داماد لوہے کا چنا تھا جسے وہ چبا نہیں سکتے تھے۔ اس نے ثابت کر دیا کہ جو فائلیں غائب کی گئی ہیں' وہ اصلی نہیں ہیں۔ بڑے بڑے قرضوں کی ادائیگی سے بچنے کے لیے جن تین بڑوں نے گاڈفادر پیر شاہ سلطانی کو ساڑھے تین کروڑ روپے فائلیں چرانے کے لیے دیے تھے۔ اب انہیں صداقت نے وارننگ دی تھی کہ گاڈفادر کو دیے ہوئے ساڑھے تین کروڑ روپے قومی خزانے میں پہلی قسط کے طور پر جمع کیے جائیں ورنہ ان تینوں کے نام اخبارات اور عدالت میں اچھالے جائیں گے۔ اس طرح ان کا سیاسی کیریئر تباہ ہو جائے گا۔

پیر عظمت اللہ شاہ سلطانی ایک بار نقلی فائلوں سے دھوکا کھا گئے تھے۔ دوسری بار اپنے وسیع ذرائع استعمال کر کے اصلی فائلیں حاصل کر سکتے تھے۔ اس طرح تین بڑوں سے لی ہوئی ساڑھے تین کروڑ روپے کی رقم واپس نہ کرنی پڑتی لیکن اس کے لیے لازمی تھا کہ پہلے صداقت علی انٹیلی جنس کا شعبہ اور یہ ملک چھوڑ کر چلا جائے۔ اس کی موجودگی سے پھر کوئی گڑبڑ ہو سکتی تھی۔

باپ کو نقصان اور پریشانیوں سے بچانے کے لیے بیٹی ہاجرہ اغوا کے ڈرامے کا ایک کردار بن گئی تھی۔ دوسری طرف گونگی بیٹی اپنے باپ کے لیے مخبر بنی ہوئی تھی۔ اس نے صداقت علی کو آئرن سیف کا راز بتایا تھا اور نانا جان کی ڈائری سے وہ تمام ٹیلی فون نمبر



نوٹ کیے تھے جن کا تعلق نانا کی مختلف کوٹھیوں سے تھا۔ ان میں سے ایک فون نمبر اس کوٹھی کا بھی تھا جہاں ہاجرہ روپوش رہتی تھی۔

یعنی بیٹی کے ذریعے صداقت کو پہلے ہی ہاجرہ کی اس کوٹھی کا علم ہو چکا تھا لیکن اس نے کوٹھی میں کسی عورت کی جھلک نہیں دیکھی تھی۔ پہلے وہ تصدیق کرنا چاہتا تھا۔ اس نے انجان بن کر ہاجرہ سے فون پر باتیں کیں۔ اس سے اذان کے حوالے سے بھی معلوم کرنا چاہا۔ وہ کوٹھی کا فون استعمال نہیں کرتی تھی۔ موبائل فون کے ذریعے فریب دیتی رہی۔ اذان کے سلسلے میں بھی دھوکا دیا لیکن باپ بیٹی بمقابلہ باپ بیٹی کے اس گیم میں صداقت نے بازی جیت لی تھی۔

★============★============★

سچل کی آنکھ کھلی تو دن کے بارہ بج رہے تھے۔ آنکھ کھلتے ہی شانی یاد آئی۔ وہ اسے تصور میں دیکھ کر مسکرانے لگا۔ ایک وارڈ بوائے نے آ کر اسے منہ ہاتھ دھونے میں مدد دی۔ دوسرا اس کے لیے دودھ' پھلوں کا جوس' مکھن' توس اور ہاف بوائل انڈے لے آیا۔ سچل نے کہا۔ "ناشتا تو ایسے آیا ہے جیسے میں مریض بن کر نہیں داماد بن کر آیا ہوں۔"

وارڈ بوائے نے کہا۔ "جناب! آپ کے لیے کسی چیز کی کمی ہو گی تو ڈائریکٹر جنرل صاحب کی صاحب زادی ہسپتال میں زلزلہ پیدا کر دیں گی۔"

وارڈ بوائے چلا گیا۔ سچل نے جوس کا بھرا ہوا گلاس اٹھا کر کہا۔ "واہ میرے مالک! تو نے چھپر پھاڑ کر محبوبہ دی ہے۔"

وہ جوس پینے کے بعد ناشتا کرنے لگا۔ سائیں رب راکھن نے دروازے پر آ کر کہا۔ "کیا بات ہے۔ میں نے حوالات میں پہنچایا تھا۔ صاحب زادے یہاں عیش کر رہے ہیں۔"

"بابا سائیں! آپ نے نمرود کی طرح آگ میں ڈالا تھا۔ میں گلزار میں پہنچ گیا ہوں۔"

وہ اندر آ کر بولا۔ "کب تک یہاں رہو گے؟ تھانے میں تمہارے خلاف پرچہ کٹ

چکا ہے۔ یہ زخم بھرتے ہی سیدھے جیل میں جاؤ گے۔ میرے سچے اور پکے جانشین بنو گے۔ دیکھو بیٹے! میری سختی اور سنگ دلی کو سمجھو اس کے پیچھے ایک باپ کی کتنی محبتیں چھپی ہوئی ہیں۔"

وہ لقمہ چباتے ہوئے بولا۔ "میری ماں جی کی محبتوں کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"ذرا عقل سے سوچو۔ پیر عظمت اللہ شاہ سلطانی کی نواسی کسی ریاست کی شہزادی سے کم نہیں ہو گی۔ پیر شاہ صاحب کی نظر کرم جس پر پڑ جائے' وہ سونے کا ہو جاتا ہے اور وہ تمہیں صرف اس لیے پسند کریں گے کہ تم میرے جیسے دولت مند کے بیٹے ہو۔"

"آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ وہ مجھے پسند کرنے سے پہلے میری ماں جی سے معافی مانگیں گے۔"

"تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ کیا تم جانتے ہو کہ وہ زیر زمین دنیا کا کتنا خطرناک آدمی ہے۔ اس کے سامنے بڑے بڑے سیاست داں گھٹنے ٹیکتے ہیں۔ کیا وہ تمہاری دو ٹکے کی ماں سے........."

بات پوری ہونے سے پہلے وہ دھاڑ کر بولا۔ "یو شٹ اپ۔ ماں دو ٹکے کی ہے تو باپ کتنے ٹکے کا ہے؟ آپ میرے بابا سائیں ہیں۔ میری ماں جی کے مجازی خدا ہیں اس لیے میں پہلی بار ماں جی کی شان میں یہ بدتہذیبی برداشت کر رہا ہوں۔ اس گاڈ فادر نے بھی یہی حماقت کی تھی۔ وہ تھانے میں میرے ہاتھوں سے بچ گیا لیکن آئندہ سامنا ہونے پر وہ ماں جی سے معافی نہیں مانگے گا تو میرے ہاتھوں سے مرے گا۔"

سائیں رب راکھن ٹہلنے کے انداز میں ایک طرف گیا پھر بیٹے کو دیکھ کر بولا۔ "اگر وہ گاڈ فادر تمہارے ہاتھوں سے قتل ہو گا تو جرائم کی دنیا میں تمہارے نام کی دہشت طاری ہو جائے گی۔ میرے خواب پورے ہو جائیں گے۔ ایک بہت بڑے مجرم کو قتل کر کے تم قانون کے محافظ کہلاؤ گے۔ میں تمہارا مقدمہ لڑوں گا۔ ہماری جیت ہو گی تو اچھی بات ہے۔ ہارنے کی نوبت آئے گی تو میں تمہیں جیل سے فرار کرا کے تھر کے علاقے کا سب سے بڑا ڈاکو بنا دوں گا۔"

وہ بولتے بولتے بیٹے کے زخمی بازو کو دیکھ کر سوچ میں پڑ گیا پھر پلنگ کے قریب آ کر



بولا۔ "تم اناڑی ہو۔ اسے قتل کرنے میں ناکام ہو سکتے ہو پھر اس کے محافظ کتے تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ نہیں......... ایسے میں گڑبڑ ہو جائے گی۔ اس کی نواسی بھی میری بہو بن کر نہیں آ سکے گی اور ایسے خطرناک گاڈ فادر سے کھل کر دشمنی کرنا ایسا ہی ہے جیسے ہم خودکشی کرنے والے ہوں۔ میں کوئی دوسری چال چلوں گا۔"

سچل دودھ کا گلاس اٹھا کر ایک گھونٹ پیتے ہوئے بولا۔ "آپ خواہ مخواہ کھچڑی پکا رہے ہیں۔ میں نے اس پہلو پر غور نہیں کیا تھا کہ جوش اور جنون میں آ کر انتقامی کارروائی کروں گا تو جرائم کی راہ پر چل پڑوں گا۔ آپ کا شکریہ' آپ نے یہ بات سمجھا دی۔ اب میں انتقامی کارروائی نہیں کروں گا۔"

"کیا بکتے ہو۔ ابھی تو تم اپنی ماں کی شان میں گستاخی برداشت نہیں کر رہے تھے۔ اب تمہاری غیرت کیا ہوئی؟"

"میں ماں جی کی یہ بات بھول گیا تھا کہ ایسا کوئی قدم نہ اٹھاؤ جو برائی کی طرف لے جاتا ہو۔ میں اپنے کسی دوسرے طرز عمل سے شانی کے نانا کو ان کی غلطی کا احساس دلاؤں گا۔"

سائیں رب راکھن نے بیٹے کو بے بسی سے دیکھا پھر کہا۔ "میں نے تمہیں امریکہ بھیجا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ تم وہاں سے پاگل خانے کی ڈگری حاصل کر کے آؤ گے۔ ویسے یہ بھی درست ہے کہ دشمنی کی راہ اختیار نہ کی جائے اور ان کی نواسی میری بہو بن جائے۔"

"اسے اپنی شریک حیات بنانا' میری زندگی کی پہلی اور آخری آرزو ہے۔ جب بھی یہ آرزو پوری ہو گی تو وہ بہو بن کر ماں جی کے پاس رہے گی۔"

وہ ایک قدم پیچھے ہٹ کر بولا۔ "کیا تم نے ماں کی خاطر باپ سے عداوت رکھنے کی قسم کھا رکھی ہے؟"

"میری پیدائش سے لے کر اب تک آپ ماں جی سے عداوت کر رہے ہیں۔ اس عداوت کے جواب میں اس ماں نے آپ کے بیٹے کی پرورش اور تربیت محبت سے کی ہے۔ یہی محبت میں نے سیکھی ہے لیکن جس باپ کی نیت یہ ہو کہ اس کا بیٹا اس

معاشرے میں شریف اور عزت دار ڈاکو بنے' وہ محبت کو بھی عداوت سمجھتا ہے۔"

وہ اِدھر سے اُدھر ٹہلنے لگا۔ "بہت مشکل ہے۔ تمہاری ماں نے تمہیں میرے لیے ایک مسئلہ بنا دیا ہے۔ میں چور دروازے سے بہت بڑا رئیس وڈیرا بنتا جا رہا ہوں مگر تمہاری ماں جتنی سیدھی ہے اتنی ہی مکار ہے۔ اس نے تمہیں میرا جوان اکلوتا بیٹا نہیں بلکہ چوردروازہ بنا دیا ہے۔ میری زندگی بھر کی کمائی' تمام دولت اور جائیداد تمہاری ذہانت کے چور دروازے سے قومی خزانے میں چلی جائے گی۔"

وہ بیٹے کو گھونسا دکھا کر بولا۔ "بیٹا' بیٹا ہی رہتا ہے۔ تم اپنے باپ کے باپ نہیں بن سکو گے۔ میں نے صحیح راستے کا انتخاب کیا ہے۔ تم امریکہ سے پاگل کہلانے والی ڈگری لائے ہو۔ میں یہاں کے جیل خانوں سے تمہیں جرائم کی بڑی بڑی ڈگریاں دلاؤں گا۔"

"جو آپ کہہ رہے ہیں' وہ کر رہے ہیں۔ آپ کی پلاننگ کے مطابق میں اسپتال سے جیل جاؤں گا۔ آپ جیل کو جرائم کی یونیورسٹی کہتے ہیں مگر ایک بات بھول رہے ہیں' بعض طلباء یونیورسٹی سے فیل ہو کر آتے ہیں۔ اگر میں فیل ہو جاؤں گا تو مجھ پر ماں جی کی تربیت ہی مسلط رہے گی۔"

دو مسلح گارڈز اچانک کمرے میں آ کر دروازے کے دونوں طرف کھڑے ہو گئے۔ ان میں سے ایک نے کہا۔ "جناب پیر عظمت اللہ شاہ سلطانی تشریف لا رہے ہیں.........."

سچل نے مسکرا کر کہا۔ "صرف اتنی سی پیشگی اطلاع دی ہے۔ جب ایسے شاہانہ انداز ہیں تو پہلے کہنا چاہیے۔ باادب باملاحظہ ہوشیار' نگاہ روبرو' سرنگوں رہے.........."

اس کی بات مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ اسے اپنی ماں جی نورن سہاگی نظر آئی۔ وہ خوشی سے کھل اٹھا۔ بستر سے اٹھنا چاہتا تھا' ماں نے جلدی سے کمرے کے اندر آ کر کہا۔ "بیٹھا رہ' تجھے اٹھنا نہیں چاہیے۔"

وہ قریب آئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ وہ بیٹے کے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر سینے سے لگاتے ہوئے بولی۔ "میرے بچے! میرے لال! مجھے معلوم نہیں تھا کہ تجھے گولی لگی ہے۔ میں تجھے رہائی دلانے کے لیے بڑے افسران کے پاس گئی تھی۔"



رب راکھن نے کہا۔ "مگر کسی افسر نے گھاس نہیں ڈالی۔"

نورن سہاگی نے بیٹے سے الگ ہو کر شوہر کو دیکھا پھر اپنے گریبان سے دو تہہ کیے ہوئے کاغذ نکال کر دکھاتے ہوئے بولی۔ "یہ عدالت سے جاری کیا ہوا حکم نامہ ہے۔ میرے بیٹے کی ضمانت ہو چکی ہے۔ یہ دوسرا کاغذ اسٹیٹ بنک کے گورنر نے لکھا ہے کہ سچل نواز ولد رب راکھن نے اپنے نیویارک کے بینک اکاؤنٹ سے بیس کروڑ روپے پاکستان کے قومی خزانے میں وقفے وقفے سے جمع کیے ہیں۔ جو نوجوان قومی خزانے میں بیس کروڑ روپے جمع کر سکتا ہے وہ کبھی اَسی لاکھ روپے کا سونا اسمگل نہیں کرے گا۔ ایک محب وطن نوجوان کے خلاف سازش کی جا رہی ہے۔ عدالت سے درخواست ہے کہ اسٹیٹ بنک کے گورنر کی ضمانت قبول کی جائے اور سچل نواز کو رہا کیا جائے۔"

رب راکھن نے کہا۔ "تم نے دھاندلی کی ہے۔ میں نیویارک میں بیٹے کو لاکھوں روپے بھیجتا رہا۔ یہ رقم بیس کروڑ تک پہنچ گئی اور تم نے اسی رقم کے بل پر بیٹے کی ضمانت کرائی ہے۔"

وہ بولی۔ "رقم میری تھی نہ تمہاری اور نہ تمہارے بیٹے کی تھی۔ وہ پاکستانی عوام کی امانت تھی جسے میرے بیٹے نے صحیح جگہ پہنچا دیا۔ میرے بیٹے کی ضمانت بیس کروڑ روپے سے نہیں ہوئی ہے بلکہ وطن کی محبت اور فرض شناسی کے باعث ہوئی ہے۔ میں نے اسے ایمانداری کا صلہ دلایا ہے۔"

سچل نے کہا۔ "ماں جی! تجھے ان کاغذات کو تھانے پہنچانا چاہیے۔ یہ قانونی کارروائی جتنی جلدی مکمل ہو جائے بہتر ہے۔"

"میں تھانے گئی تھی مگر انسپکٹر نے کسی پیر شاہ سلطانی کو وہاں بلایا۔ انہوں نے یہ کاغذات پڑھے پھر مجھ سے کہا کہ تمہارے بیٹے کو سزا نہیں ہو گی۔ وہ باعزت طور پر بری کر دیا جائے گا لیکن ان کاغذات کو یہاں تھانے میں پیش کرنے سے پہلے اپنے بیٹے سے ملاقات کرو۔ کیا تم نہیں جانتیں کہ اسے گولی لگ گئی ہے اور وہ اسپتال میں ہے۔"

ماں نے بیٹے کے قریب آ کر کہا۔ "تمہیں گولی لگی ہے' یہ سنتے ہی میرا کلیجا پھٹنے لگا۔ وہ پیر شاہ صاحب بڑے شریف انسان ہیں۔ وہ مجھے اپنی گاڑی میں بٹھا کر یہاں لائے

ہیں۔"

پیر عظمت اللہ شاہ سلطانی دروازے پر نظر آئے۔ انہوں نے کمرے میں آکر دونوں مسلح گارڈز کو باہر جانے کا حکم دیا۔ رب راکھن نے جلدی سے آگے بڑھ کر دونوں ہاتھ بڑھا کر مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "پیر شاہ صاحب! آپ سلامت رہیں ہزار برس۔ ان میں سے چند برس مجھے بھی سلامتی کے لیے عنایت فرمائیں۔ میرا اکلوتا بیٹا ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔"

انہوں نے کہا۔ "گرفت مضبوط ہو تو گیلا صابن بھی ہاتھ سے نہیں پھسلتا۔ ہمیں تمہارے بیٹے سے کوئی دلچسپی نہ ہوتی مگر ہماری نواسی نے اس کی جان بچالی۔ آج صبح ہمیں رپورٹ ملی کہ وہ تمام رات یہاں تمہارے بیٹے کی تیمارداری کرتی رہی۔ ابھی وہ اپنی ماں کے پاس سو رہی ہے۔ اس گونگی اور بہری کے انداز نے بتا دیا ہے کہ وہ اس سرپھرے نوجوان سے محبت کرتی ہے۔"

رب راکھن نے کہا۔ "اس کی ماں نے اس کا سر پھرا دیا ہے۔"

"ہاں۔ ہم اسٹیٹ بنک کے گورنر کا وہ خط پڑھ کر حیران رہ گئے۔ بیس کروڑ کوئی بیس پیسے نہیں ہوتے۔ تم نے کتنی ہیرا پھیری سے یہ کالا دھن جمع کیا پھر بیٹے پر اعتماد کرتے ہوئے اس کے اکاؤنٹ میں اسے جمع کرایا مگر اس نے تو پاگل پن اور حماقت کی انتہا کر دی۔ اتنی بڑی رقم یہاں کے قومی خزانے میں بھیج دی۔"

سچل نے کہا۔ "یہ آپ کی نظروں میں حماقت ہے لیکن میری نظروں میں ذہانت ہے۔"

"تمہاری یہ ذہانت ہماری نواسی کو لے ڈوبے گی۔ تم خاصے گبھرو جوان ہو۔ اپنے باپ کے حوالے سے بے انتہا دولت مند ہو۔ ہماری نواسی چاندی کی پلیٹ میں سونے کے نوالے کھاتی ہے۔ کیا تم کھلا سکو گے؟"

ماں نے پوچھا۔ "بیٹے! کیا تم ان کی نواسی کو میری بہو بنانا چاہتے ہو؟"

رب راکھن نے کہا۔ "یہ تمہاری نہیں، میری بہو بنا سکتے ہیں۔"

سچل نے کہا۔ "میری دلہن جب بھی آئے گی، ماں کی دہلیز پر قدم رکھے گی۔ اگر



اسے محبت ہوگی تو وہ سونے کا نوالہ پھینک کر ہمارے ساتھ دال روٹی کھائے گی۔"

پیر شاہ سلطانی نے کہا۔ "تمہارے جیسے سرپھرے جوان سے ایسے ہی جواب کی توقع تھی۔ اب ہم تمہاری ماں سے آخری بات کہتے ہیں کہ ہماری نواسی بڑی ضدی ہے۔ اسے ضد سے باز رکھنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ تمہارا وجود نہ رہے۔ تم نہیں رہو گے۔ کوئی اندھی گولی کہیں سے آکر تمہارا کام تمام کر دے گی اور تمہاری لاش بھی اسے نظر نہیں آئے گی تو وہ تمہیں تلاش کرتے کرتے تھک جائے گی پھر صبر کر لے گی۔"

ماں نے تڑپ کر کہا۔ "خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کریں۔ ابھی تو میرے بیٹے کو ایک گولی لگی ہے۔ خدا نہ کرے کہ دوسری لگے۔"

رب راکھن نے کہا۔ "اس کے زندہ رہنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ یہ جیل میں چند برس گزارے۔ باہر اس کے لیے موت ہے جب کہ جیل میں اس کی سانسیں برقرار رہیں گی۔"

ماں حواس باختہ ہو رہی تھی۔ کبھی پیر شاہ سلطانی کو، کبھی اپنے شوہر اور کبھی اپنے بیٹے کو دیکھ رہی تھی۔ بہت کچھ بولنا چاہتی تھی مگر بول نہیں پا رہی تھی۔ سچل نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ "ماں جی! موت برحق ہے۔ ایک دن سب کو مرنا ہے۔ تُو دل سے یہ خوف نکال دے۔ یہ کاغذات لے جا کر تھانے میں جمع کرا دے۔ میرے بابا سائیں اور شانی کے نانا جان بہت طاقتور ہیں لیکن مقدر سے زیادہ طاقتور نہیں ہیں۔ اگر ایک چیونٹی کے مقدر میں بھی زندگی ہو تو بڑے سے بڑا شہ زور بھی اسے چٹکی میں مسل نہیں سکتا۔"

وہ بیٹے سے ہاتھ چھڑا کر پیچھے ہٹ گئی پھر بولی۔ "نہیں۔ تُو فریب دینے والی بات نہ کر۔ کیا مجھے اور تجھے پتہ نہیں ہے کہ ہمارا مقدر کمزور ہے۔ یہ تیرے بازو پر جو پٹی بندھی ہے، یہ پٹی نہیں میرا کفن ہے۔ اس کفن کے اندر سے گولی نکالی گئی ہو گی مگر اب میری جان نکل رہی ہے۔ کیا تُو میری جان لینا چاہتا ہے۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہے۔ ان کاغذات کو دیکھ، ہمیں ایمانداری اور فرض شناسی کا کتنا بڑا صلہ ملا ہے۔ اصل زندگی یہ ہے جو نام دیتی ہے انعام دیتی ہے۔"

"نہیں۔ سلامتی ہے تو زندگی ہے۔ جب سلامتی نہیں رہے گی تو نام اور انعام اور

ان کاغذ کے پرزوں کو لے کر کیا کرنا ہے۔ یہاں تیرے وجود کو مٹانے کی بات ہو رہی ہے۔ خدا نہ کرے اگر تُو نہ رہا تو کیا میں ان کاغذات کو فریم کرا کے دیوار پر لٹکاؤں گی؟؟"

"ماں جی! آخر تُو چاہتی کیا ہے؟؟"

"وہی جو تیرا باپ چاہتا ہے۔"

"نہیں ماں جی! تُو خوفزدہ ہو کر یہ فیصلہ کر رہی ہے۔"

"میں صرف اور صرف ایک ماں بن کر پوچھ رہی ہوں' کیا میں ان کاغذات کو تھانے میں پہنچا کر تجھے رہائی دلاؤں یا انہیں پھاڑ کر پھینک دوں تاکہ تُو اپنے باپ کے نقش قدم پر چل سکے؟"

"ان کاغذات کو تھانے میں پہنچا دے۔ میں باعزت طور پر رہائی چاہتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں یہی کروں گی مگر جب رہا ہو کر آئے گا تو گھر میں تجھے میری لاش ملے گی۔"

"ماں جی! ایسی احمقانہ باتیں نہ کر۔"

"میں احمق ہوں۔ تجھے بچپن سے لے کر اب تک احمقانہ تربیت دیتی رہی۔ یہ کتنی بڑی دشمنی ہے کہ ماں ہو کر تجھے تیرے باپ کی دولت اور جائیداد سے محروم کرتی رہی۔ اب ایسا نہیں کروں گی۔"

اس نے کاغذات سچل کے ہاتھوں پر رکھ کر کہا۔ "یہ لے۔ فیصلہ خود کر لے۔ انہیں تھانے پہنچائے گا تو مجھے مُردہ پائے گا۔ انہیں پھاڑ کر پھینک دے گا تو مجھے خوف اور دہشت سے آزاد رکھے گا اور مجھے نئی زندگی دے گا۔"

اس نے کاغذات کو تہہ کر کے جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ "یہ کاغذات تھانے تک نہیں پہنچیں گے۔ مجھے رہائی نہیں چاہیے۔ باپ کی غلامی اور تیری زندگی چاہیے۔"

پیر شاہ سلطانی نے کہا۔ "تم ابھی اناڑی ہو۔ ہماری طرح پختگی حاصل کرنے کے لیے اپنے بابا سائیں کے طریقہ کار پر چلو اور دو چار برس جیل میں رہو۔ اس کے دو فائدے ہیں۔ ایک تو تم اپنے بابا سائیں کے صحیح جانشین بن کر وہاں سے نکلو گے۔ دوسرے یہ کہ اس عرصے میں ہماری نواسی نے تمہیں نہیں بھلایا تو ہم اسے تمہاری شریک



حیات بنا دیں گے۔"

رب راکھن نے خوش ہو کر دونوں ہاتھ مصافحے کے لیے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "پیر شاہ صاحب! آپ واقعی پہنچے ہوئے پیر ہیں............"

اس کے مصافحے کے لیے دونوں ہاتھ بڑھے رہ گئے' پیر شاہ سلطانی نے کہا۔ "ہم ابھی ہاتھ نہیں ملائیں گے۔ جب تمہارا بیٹا پوری طرح تمہارے نقش قدم پر چلنے لگے گا تو پھر ہم تم سے دوستی بھی کریں گے اور رشتے داری بھی............"

یہ کہہ کر انہوں نے سچل پر ایک گہری نظر ڈالی پھر کمرے سے چلے گئے۔ رب راکھن نے کہا۔ "بیٹے! تم نے ماں کی خاطر صحیح فیصلہ کیا ہے۔ یقین کرو' تم بہت بڑے آدمی بننے والے ہو۔ میں ابھی جا رہا ہوں۔ اب جیل میں ملاقات ہو گی۔"

وہ بھی کمرے سے باہر چلا گیا۔ سچل نے ماں کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بستر پر بٹھایا پھر کہا۔ "ہم نہیں جانتے' ہمارے مقدر میں کیا لکھا ہے لیکن جب تک تیری زندگی ہے' میں تجھے زندہ دیکھنا چاہتا ہوں۔ میرے اندر یقین پختہ ہے کہ تُو نے مجھے ہیرے کی طرح تراشا ہے۔ اب کوئی ہیرے کو کتنی ہی کیچڑ میں پھینک دے' وہ ہیرا ہی رہے گا۔"

ماں نے بڑی دکھ بھری نظروں سے دیکھا۔ دکھ یہ تھا کہ ہیرے اور بیٹے میں فرق ہوتا ہے۔ ہیرا کیچڑ میں جاتا ہے تو جائے بیٹا کیوں جائے؟

★===========★===========★

شانی کی آنکھ کھلی تو عین نگاہوں کے سامنے ماں کا چہرہ تھا۔ بیٹی کی نیند پوری ہو چکی تھی۔ ماں ابھی تک سو رہی تھی۔ وہ تھوڑی دیر تک بڑی محبت سے ماں کو دیکھتی رہی پھر آہستگی سے اٹھ کر پلنگ سے اتر کر اس کمرے سے نکلی۔ اس کمرے کے سامنے کاریڈور کی دوسری طرف اس کی خواب گاہ تھی۔ وہ اپنی خواب گاہ میں چلی گئی۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد اپنے کمرے سے نکلی تو غسل وغیرہ کر کے لباس تبدیل کر چکی تھی۔ وہ نیچے ڈرائنگ روم میں آئی۔ وہاں سینٹر ٹیبل پر ایک لیٹر پیڈ رکھا ہوا تھا۔ اس کے ایک کاغذ پر پیر شاہ سلطانی نے ہاجرہ کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا۔ "بیٹی! ہم ایک ضروری کام سے جا رہے ہیں۔ شام سے پہلے واپس آ جائیں گے پھر تم سے تفصیلی گفتگو ہو گی۔ دوائیں وقت پر ضرور کھا لینا۔ کوئی پرابلم ہو تو فوراً ڈاکٹر سعیدہ کو بلا لینا۔"

وہ تحریر پڑھنے کے بعد کچن میں آئی۔ وہاں باورچی عبداللہ نہیں تھا۔ اس نے کچن کے پچھلے دروازے کو دیکھا۔ وہ باہر سے بند تھا جس کا مطلب تھا وہ کہیں گیا ہوا تھا۔ جب یہ اطمینان ہو گیا کہ کوٹھی کے اندر کوئی نہیں ہے تو وہ تیزی سے چلتی ہوئی ڈرائنگ روم میں آئی۔ ٹیلی فون کو اٹھا کر پیانو کی ریڈز کے پاس رکھا پھر ریسیور کو کان سے لگا کر نمبر ڈائل کیے۔ ڈائلنگ کے بعد وہ ریسیور کے ماؤتھ پیس پر ایک انگلی سے دستک دینے لگی۔

دوسری طرف سے باپ نے جیب سے سیٹی نکال کر اپنے ریسیور کے ماؤتھ پیس کے قریب بجائی۔ شانی نے اپنے کان کی جلد کے آس پاس آواز کی لہروں کی تھرتھراہٹ محسوس کی پھر اپنے ریسیور کو پیانو کی ریڈز کے پاس رکھ کر ان ریڈز پر یکے بعد دیگرے اپنی انگلیاں اس ترتیب سے رکھنے لگی کہ دوسری طرف میوزیکل سگنل میسج (موسیقی کے



ارتی پیغام) کے مطابق صداقت علی ایک کاغذ پر لکھنے لگا۔

گونگی بیٹی کہہ رہی تھی۔ "ممی نانا کے پاس پہنچ گئی ہیں۔ وہ بیمار تھیں اب بخار اتر ا ہے۔ آپ کو ممی کے پاس آنا چاہیے۔ اس سے پہلے میں ممی سے کہوں گی کہ آپ کو ن کریں۔ میرا ایک کام ہے۔ پولیس اسپتال کے کمرا نمبر سات میں جا کر اس کی عیادت ریں۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ وہ کون ہے.........."

ہاجرہ کی آنکھ کھل گئی۔ اسے پیانو بجنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اس کوٹھی ں کوئی ساز بجانا نہیں جانتا تھا۔ وہ بڑا سا قیمتی پیانو محض ڈیکوریشن پیس کے طور پر رکھا گیا ا۔ لہٰذا یہ حیرانی کی بات تھی کہ اس کوٹھی میں کون پیانو بجانے والا آ گیا ہے۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ذرا سی کمزوری محسوس ہو رہی تھی۔ وہ بستر سے اتر کر آہستہ ہستہ چلتی ہوئی کمرے سے باہر آئی پھر کاریڈور سے گزر کر بالکونی میں پہنچی۔ وہاں سے چے دیکھا تو حیران رہ گئی۔ آنکھوں سے دیکھ کر بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کی بیٹی جو ل سکتی تھی، نہ سن سکتی تھی وہ پیانو بجا رہی تھی۔ بھلا کیا بجا رہی ہو گی اور کیا سن رہی ہو ی؟

ہاجرہ کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ اگرچہ وہ سُر سنگیت کو نہیں سمجھتی تھی لیکن بیٹی کا داز بتا رہا تھا کہ وہ سمجھتی ہے۔ تمام بولنے اور سننے والوں سے زیادہ سمجھتی ہے اور کسی یے گیت کی دھن بجا رہی ہے جو ہاجرہ نے کبھی نہیں سنا تھا اور ہاجرہ کے دماغ میں یہی وال چبھ رہا تھا کہ اس بہری نے ایسا کون سا گیت کسی معجزے سے سن لیا ہے جس کی ھن بجا رہی ہے؟

اب وہ بجا رہی تھی۔ "پاپا! میں نے چور نظروں سے دیکھا ہے ممی بالکونی میں ہیں۔ رے پاس آنے والی ہیں۔ لہٰذا پھر کبھی.........."

اس نے ایک ہاتھ سے پیانو بجاتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے ریسیور کریڈل پر رکھ ا۔ پیانو کی پشت ہاجرہ کی طرف تھی اس لیے ٹیلی فون اسے نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ ڑھیاں اترتی ہوئی بیٹی کی طرف آئی۔ بیٹی اِدھر اُدھر ہلتی ہوئی جیسے لہک لہک کر دونوں ھوں سے سُر بکھیر رہی تھی پھر وہ ماں کو دیکھ کر رک گئی، فوراً ہی اٹھ کر اس کے گلے

سے لگ گئی۔

بہت دنوں بعد ماں بیٹی کی ملاقات ہوئی تھی اس لیے وہ دیر تک ایک دوسرے کی دھڑکنوں سے لگی رہیں پھر شانی اس کا ہاتھ پکڑ کر سینٹر ٹیبل کے پاس لے گئی۔ اس کے نانا نے لیٹر پیڈ پر جو لکھا تھا' وہ ماں کے سامنے پیش کر دیا۔ ماں نے اسے پڑھ کر سر ہلایا پھر صوفے پر بیٹھ کر لکھا۔ "میری بیٹی! میری جان! کیسی ہو؟ چند دنوں کے بعد تمہیں دیکھ رہی ہوں مگر ایسا لگتا ہے جیسے برسوں بیت گئے ہیں۔ تمہارے پاپا کیسے ہیں؟ کیا اپنے پاپا سے ملتی رہتی ہو؟"

ماں بیٹی' باپ (گاڈ فادر) بیٹی' نانا نواسی اور میاں (صداقت) بیوی کے رشتوں میں محبت' خلوص اور استحکام بہت تھا۔ اس کے باوجود وہ سب بڑے خلوص سے ایک دوسرے کو فریب دیتے تھے۔ ہاجرہ صبح صداقت علی کے پاس سے آئی تھی مگر جان سے زیادہ عزیز بیٹی سے یہ بات چھپا کر پوچھ رہی تھی کہ اس کے پاپا کیسے ہیں؟

بیٹی بھی کم نہیں تھی۔ اس نے انجان بن کر لکھا۔ "پاپا! آپ کے لیے بہت پریشان ہیں۔ آپ کو دن رات تلاش کرتے رہتے ہیں۔ آپ ابھی انہیں فون پر اپنی آمد کی اطلاع دیں۔"

"ہاں۔ میں ابھی فون کروں گی۔"

"کروں گی نہیں' ابھی فوراً فون کریں۔"

"میری جان! میرا حلق خشک ہو رہا ہے۔ پہلے مجھے پانی پی لینے دو۔"

"آپ کو پانی نہیں' پھلوں کا جوس بنا کر دے رہی ہوں۔ آپ فون پر باتیں کریں' تب تک جوس تیار ہو جائے گا۔"

وہ پیانو کے پاس آئی پھر وہاں سے ٹیلی فون اٹھا کر لے آئی۔ ہاجرہ نے یہ نہیں دیکھا کہ فون پیانو کے پاس رکھا ہوا تھا اس لیے نہیں دیکھا کہ وہ سر جھکائے لکھ رہی تھی۔ جب اس نے فون لا کر رکھا تو اس نے بیٹی کو اپنی تحریر پڑھنے دی۔ اس نے لکھا تھا۔ "میں حیران ہوں کہ تم پیانو بجا رہی تھیں۔ تمہیں کیا سنائی دے رہا تھا؟ ظاہر ہے تم سننے کے قابل نہیں ہو اور یہ کھلونا نہیں ہے کہ تم مزے لے لے کر دل بہلا رہی تھیں۔"



شانی نے وہ تحریر پڑھی۔ مسکرا کر اپنی ممی کو دیکھا پھر لکھا۔ "جب میں نے آپ کو نیند کی حالت میں دیکھا تو آپ اتنی پیاری لگ رہی تھیں جیسے کوئی ملکہ عالیہ محو خواب ہو۔ آدھا دن گزر چکا تھا۔ میں آپ کو جگانا چاہتی تھی اس لیے میں نے سوچا کسی بھی ملک کی ملکہ کو سُر چھیڑ کر جگایا جاتا ہے۔ میں نے بھی اپنے لیے نہیں' آپ کے لیے ساز چھیڑا تھا۔ اپنی ملکہ ممی حضور کے لیے........."

یہ لکھ کر وہ جوس تیار کرنے کے لیے کچن کی طرف چلی گئی۔ ہاجرہ مسکرا کر بڑے پیار سے بیٹی کو دیکھتی رہی۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی تو وہ ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگی۔ جلد ہی رابطہ ہو گیا۔ صداقت کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو کون؟"

"میں ہاجرہ بول رہی ہوں۔ آپ سے وعدہ کیا تھا کہ یہاں پہنچنے کے بعد فون کروں گی مگر یہاں پہنچنے تک بخار میں تپنے لگی تھی۔ جب ابا حضور کا سامنا ہوا تو اچانک ہی میرا سر چکرا گیا۔ بس اتنا یاد ہے کہ میں کھڑے کھڑے گر پڑی تھی۔"

"خود کو سنبھالو۔ کیا تمہارے لیے یہ کافی نہیں کہ میں تم سے فریب کھا کر بھی محبت کرتا ہوں۔ تمہاری نفسیات سمجھتا ہوں۔ تمہارے ابا حضور بچپن سے تمہارے حواس پر چھائے ہوئے ہیں۔ ہوش و حواس میں رہ کر محبت کی جاتی ہے مگر تم سحرزدہ ہو کر باپ سے محبت کرتی ہو۔ کوئی بات نہیں ہاجرہ! خود کو خطاوار نہ سمجھو۔ میں تمہیں چکّی کے دو پاٹوں کے درمیان پسنے نہیں دوں گا۔"

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ روتے ہوئے بولی۔ "آپ بہت اچھے ہیں۔ ابا حضور نے مجھے دور کر کے آپ کو پریشان کیا لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا۔ ایک بیٹی کے جذبات کو سمجھتے ہوئے مجھے یہاں آنے کی اجازت دے دی۔"

"ہاں۔ ہم تمام رشتے دار ایک دوسرے کے احساسات اور جذبات کو دل سے سمجھیں تو پھر تمام رشتے داروں کے درمیان جو محبت بھری منافقت یا منافقت بھری محبت ہوتی ہے وہ ختم ہو جائے گی۔ تمہاری سسکیاں سنا دے رہی ہیں۔ چلو آنسو پونچھو۔"

وہ اپنے آنچل سے آنسو پونچھنے لگی۔ صداقت نے پوچھا۔ "تمہارے ابا حضور نے پوچھا تو ہو گا کہ اچانک کہاں گم ہو گئی تھیں؟ پھر اچانک کیسے چلی آئیں؟"

"کسی سوال جواب کا موقع ہی نہ ملا۔ بے ہوشی کے بعد اب ہوش میں آئی ہوں۔ اتنی دیر تک سوتی رہی۔ ہماری بیٹی بھی خوب ہے۔ پتہ ہے اس نے مجھے نیند سے کیسے جگایا ہے؟"

"کیسے جگایا؟"

"پیانو بجا کر۔" ہاجرہ ہنسنے لگی۔

صداقت نے انجان بن کر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔ "کیا کہہ رہی ہو۔ ہماری بیٹی پیانو بجا رہی تھی؟"

"ہاں۔ میں نے تحریر کے ذریعے پوچھا کہ وہ سن نہیں سکتی ہے سُروں کو سمجھ نہیں سکتی ہے پھر پیانو سے کیوں کھیل رہی تھی؟ پتا ہے اس نے کیا جواب دیا؟"

"بھئی میری بیٹی ہے۔ ضرور کوئی بھرپور جواب دیا ہوگا۔"

"اس نے لکھ کر جواب دیا کہ میں نیند کی حالت میں ملکہ عالیہ لگ رہی تھی۔ چونکہ کسی بھی ملک کی ملکہ کو ساز چھیڑ کر جگایا جاتا ہے لہٰذا وہ میرے لیے پیانو بجا رہی تھی۔"

صداقت نے ایک بھرپور قہقہہ لگایا پھر بولا۔ "کہاں ہے ہماری شریر بیٹی؟"

"میرے لیے جوس تیار کر رہی ہے۔ آپ بتائیں' یہاں مجھ سے ملنے آ رہے ہیں؟ انکار کرنے سے پہلے یہ سن لیں کہ یہ آپ کی بیٹی کی بھی فرمائش ہے۔"

"مجھے انکار نہیں ہے۔ میں تمہاری بھلائی کے لیے نہیں آنا چاہتا۔ ہمارے درمیان تلخ باتیں ہوں گی تو تم دل پر اثر لو گی۔ نہ باپ کو قائل کر سکو گی اور نہ شوہر کو جائز باتیں کرنے سے باز رکھ سکو گی۔"

"صداقت! ایسا کب تک ہوگا؟ یہ کشیدگی کسی طرح ختم کرو۔"

"جب تک دولت' شان و شوکت اور بے انتہا اختیارات حاصل کرنے کی ہوس رہے گی اور ان سب کے خلاف قانون کی صداقت رہے گی' یہ کشیدگی ختم نہیں ہوگی۔"

"مجھے فخر ہے کہ آپ صادق ہیں' فرض شناس ہیں مگر ایک ابا حضور کو نظرانداز کرتے رہیں گے تو فرض کی ادائیگی میں کیا فرق پڑے گا۔ ہمارے ملک میں ان کے علاوہ بھی بے شمار خطرناک مجرم ہیں' آپ ان کا محاسبہ کریں۔"



"تم مجھ پر جتنا فخر کرتی ہو' میں اتنا ہی تم پر افسوس کرتا ہوں۔ تم چور دروازوں سے دولت مند بننے والوں کی حمایت کرتی ہو۔ میں تمہارے باپ کے علاوہ کیا تمہارے دونوں بھائیوں کو بھی نظرانداز کر دوں؟ میں کراچی' لاہور' اسلام آباد اور پشاور جہاں بھی کسی بہت بڑے مجرم کی گردن پکڑوں گا تو انکشاف ہوگا کہ وہ تمہارے ابا حضور کے زرخرید ہیں۔ ملک کا خزانہ خالی کرنے والے کسی بھی بڑے جاگیردار اور سیاست دان کے خلاف رپورٹ تیار کرتا ہوں تو پتہ چلتا ہے' تمہارے ابا حضور ریکارڈ روم میں آگ لگوا رہے ہیں۔ ٹھوس ثبوت رکھنے والی فائلیں جلا رہے ہیں اور کروڑوں روپے قرض لینے والوں کو قرض کی ادائیگی سے باز رکھ کر وہ محل خرید رہے ہیں' جہاں تم ابھی بیٹھی مجھ سے باتیں کر رہی ہو۔ وہ لباس خرید رہے ہیں' جسے تم نے ابھی پہن رکھا ہے۔ وہ زبان خرید رہے ہیں جس سے تم محض باپ کی نہیں ایک گاڈ فادر کی حمایت میں بول رہی ہو۔ کچھ اور سنو گی؟"

صداقت کو فون پر سسکیاں سنائی دیں' وہ بولا۔ "سچائی خون کے آنسو رلاتی ہے اس لیے کہہ رہا تھا۔ مجھے اپنے میکے میں نہ بلاؤ۔ میں نے ابھی جو کہا ہے اس پر غور کرو گی تو معلوم ہوگا کہ میں تمہارے باپ کے خلاف براہ راست قدم نہیں اٹھاتا ہوں۔ میں تو قرض نادہندگان کی گردن پکڑتا ہوں تو ان کے پیچھے گاڈ فادر کا گریبان ہاتھ آ جاتا ہے۔"

"فار گاڈ سیک۔ گستاخی نہ کریں۔ ابا حضور کا گریبان پکڑنے کی بات نہ کریں۔"

"مجھے گستاخ سمجھتی ہو؟ جبکہ تم ایک تازہ مثال ہو۔ انہوں نے شوہر سے بیوی کو جدا کر دیا۔ اغوا کا ڈھونگ رچایا۔ کیا میں نے ان کا گریبان پکڑا؟ میں تو اب بھی بہت کچھ کر سکتا ہوں لیکن میں نے فی الوقت اپنے قانونی حقوق محفوظ رکھے ہیں۔ قانون ہمیں سکھاتا ہے کہ عورتوں کے معاملات میں تہذیب اور شرافت کے دائرے کے اندر رہا کرو۔ میں نے یہی کیا ہے۔ جس نے میری بیوی چھینی' میں نے اس کی بیٹی لوٹا دی۔"

وہ شکست خوردہ سی ہو کر بولی۔ "آپ سچے ہیں۔ میں آپ سے جیت نہیں سکتی۔ آپ سے التجا کرتی ہوں۔ آج فرصت ملتے ہی آ جائیں۔ آپ کوشش کریں گے تو اپنی ذہانت اور فراست سے یہاں کے ماحول کو خوشگوار رکھ سکیں گے۔"

"اچھی بات ہے۔ شام تک آؤں گا۔ اپنی صحت کا خیال رکھو اور وقت پر دوائیں

کھایا کرو۔ میں آؤں تو تمہیں مسکراتا ہوا دیکھوں۔ اچھا خدا حافظ۔"

صداقت نے ریسیور رکھ دیا۔ ہاجرہ کے متعلق سنجیدگی سے سوچنے لگا۔ انسان کو جتنی زیادہ محبتیں ملیں، وہ اتنا ہی خوش نصیب ہوتا ہے مگر بے چاری دو محبتوں کے درمیان گھائل ہوتی جارہی ہے۔

اس کے خاص ماتحت سکندر نے آکر کہا۔ "سر! رپورٹ تیار ہے۔"

وہ سکندر کے ساتھ سرکاری بنگلے کے باہر آیا۔ ایک لینڈ کروزر کی درمیانی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ آگے پیچھے مسلح گارڈز بیٹھ گئے۔ اس نے ڈرائیور سے کہا۔ "پولیس اسپتال چلو۔"

گاڑی چل پڑی۔ سکندر نے ایک ڈائری کھول کر دیکھتے ہوئے کہا۔ "سر! اس جوان کا نام سچل نواز ہے۔ اس کا باپ رب راکھن ہماری بلیک لسٹ میں ہے۔ اس کی بیوی نورن سہاگی نے حرام کی کمائی پر لعنت بھیج کر تقریباً اٹھائیس برس پہلے شوہر سے علیحدگی اختیار کرلی تھی۔ اس نے بیٹے کی پرورش بھی اپنے طور پر کی۔ اسے رزق حلال حاصل کرنے کا درس دیتی رہی لیکن یہ حیرانی کی بات ہے کہ سچل نے نیویارک میں رہ کر رزق حلال کیسے حاصل کیا۔ اس کے متعلق یہ رپورٹ ہے کہ باپ اس کے اکاؤنٹ میں لاکھوں روپے بھیجا کرتا تھا اور بیٹا اس میں سے ایک پیسہ بھی نہیں لیتا تھا۔"

صداقت نے پوچھا۔ "یہ بات یقین سے کیسے کہی جاسکتی ہے؟ نیویارک کے رنگین ماحول میں جوان لڑکا دولت نہیں لٹاتا ہوگا؟"

"سر! میں تھانے گیا تھا۔ انسپکٹر نے بتایا کہ نورن سہاگی اسٹیٹ بنک کے گورنر سے اپنے بیٹے کا کیریکٹر سرٹیفکیٹ لائی تھی۔ عدالت سے سچل کی ضمانت بھی منظور ہوگئی تھی۔ سر! آج میں اس بات کا قائل ہوگیا ہوں کہ شیطان کے گھر میں ولی پیدا ہوسکتا ہے۔ رب راکھن جو لاکھوں روپے بیٹے کے نام بھیجا کرتا تھا، بیٹا نیویارک کے بینک سے ڈرافٹ بنوا کر ہمارے ملک کے قومی خزانے کے لیے بھیج دیا کرتا تھا۔ اس طرح اس نے یہاں بیس کروڑ روپے ارسال کیے ہیں۔"

صداقت نے کہا۔ "آفرین ہے ایسے جوان پر۔ کون کہتا ہے کہ ہمارے بے روزگار



نوجوان ہتھیار اٹھا کر دہشت گرد بن جاتے ہیں۔ کرپشن ہماری بوڑھی سیاست میں ہے۔ جوان ہاتھوں میں ہتھیار دینے والی سیاست نہ ہو تو ہمارے ملک کا ہر نوجوان سچل نواز ہوگا۔"

"لیکن سر! سچل کو بھی بری طرح ٹریپ کیا گیا ہے۔ اس کی ماں نے ضمانت نامہ داخل نہیں کرایا ہے۔ اسٹیٹ بنک کے گورنر کا جاری کردہ کیریکٹر سرٹیفکیٹ بھی کہیں چھپا دیا ہے یا ضائع کردیا ہے۔ پہلے ماں اپنے بیٹے کو بے قصور کہتی تھی۔ اب ماں بیٹے دونوں کا بیان ہے کہ انہوں نے سونا اسمگل کیا ہے۔ سارا محلہ کہتا ہے کہ نورن سہاگی کبھی جھوٹ نہیں بولتی مگر وہ ماں کہہ رہی ہے کہ بیٹا اسمگلر ہے اور اسے سزا ملنی چاہیے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے، ایک ماں سفید کو سیاہ کیوں بنا رہی ہے؟ یہ کیوں چاہتی ہے کہ اس کا راہ راست پر رہنے والا بیٹا مجرم کہلائے، سزا پائے اور جیل جائے؟"

"ہمارے ایک مخبر نے بتایا ہے کہ پیر عظمت اللہ شاہ سلطانی اور رب راکھن اسپتال میں سچل سے ملنے آئے تھے۔ اس وقت نورن سہاگی بھی بیٹے کے پاس تھی۔"

"اچھا تو گاڈ فادر آیا تھا پھر تو زلزلہ آنا ہی تھا۔ میرا سسر کمال کا بندہ ہے، جہاں پہنچتا ہے بازی پلٹ دیتا ہے۔ اب میں دیکھوں گا کہ بازی پلٹنے کے پیچھے مقصد کیا ہے۔"

وہ اسپتال پہنچ گئے۔ سچل اپنے کمرے میں بستر کے سرہانے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ ایک نرس اسے انجکشن لگانے کے بعد انجکشن اور دواؤں کی ٹرے اٹھا کر جانے لگی۔ اس نے پوچھا۔ "سسٹر! وقت کیا ہوا ہے؟"

نرس نے پلٹ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ "لوگ اپنی ضرورت سے بار بار گھڑی دیکھتے ہیں، آپ بار بار دروازے کو دیکھتے رہیں۔"

وہ ذرا جھینپ کر بولا۔ "میں......... میں سمجھا نہیں، آپ کیا کہہ رہی ہیں؟"

"میں کہہ رہی ہوں کسی کی ڈے ڈیوٹی ہوتی ہے، کسی کی نائٹ ڈیوٹی۔ وہ نیند پوری کرنے کے بعد ڈیوٹی کے وقت آجائے گی۔ ایسی بھی کیا بے چینی ہے۔"

وہ پلٹ کر چلی گئی۔ سچل زیر لب مسکرانے لگا۔ شانی نے پچھلی رات اس کے لیے جاگ کر اور اسپتال کے پورے عملے کو جگا کر یہ تاثر عام کردیا تھا کہ وہ زخمی جوان کو دیوانہ

وار چاہتی ہے۔

سچل یہی سوچ کر بار بار دروازے کی طرف دیکھتا رہا تھا کہ وہ دیوانی کیوں نہیں آئی؟ اگر آنے والی کے پیروں میں مجبوری کی مہندی لگی ہو تو کوئی نامہ آتا ہے یا قاصد آتا ہے۔

صداقت آ رہا تھا۔ ایک کاریڈور سے گزرتے ہوئے آپریشن کرنے والے ڈاکٹر سے کہہ رہا تھا۔ "آپریشن کرنے والی ٹیم کے سروس ریکارڈز میرے پاس پہنچ گئے ہیں۔ میری بیٹی کے کیے ہوئے وعدے کے مطابق اڑتالیس گھنٹوں کے اندر آپ تمام کے جائز حقوق ادا کیے جائیں گے۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "تھینک یو سر! ہم نے آپ کے بارے میں سنا ہے کہ جس کام میں ہاتھ ڈالتے ہیں' اسے پورا کر کے چھوڑتے ہیں۔ وہ دیکھیے سامنے کمرا نمبر سات ہے۔ آئیے میں اس جوان سے آپ کو ملواتا ہوں۔"

"پلیز آپ زحمت نہ کریں۔ میں اس سے تنہائی میں ملاقات کرنے آیا ہوں۔"

ڈاکٹر مصافحہ کر کے رخصت ہو گیا۔ صداقت آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کمرے کے دروازے پر آیا۔ سچل نے چونک کر دیکھا جیسے وہ آئی ہو پھر اس نے پوچھا۔ "فرمائیے' آپ کس سے ملنا چاہتے ہیں؟"

صداقت نے کمرے میں داخل ہو کر کہا۔ "میں اس جوان سے ملنا چاہتا ہوں' جس نے قومی خزانے سے لوٹا ہوا مال واپس کیا تھا۔ کیا اس کا پتہ بتا سکتے ہو؟"

"سوری۔ میں ایسے کسی جوان سے واقف نہیں ہوں۔"

صداقت نے پریشانی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ "بڑی مشکل ہے۔ ایک گونگی کا پیغام اسے پہنچانا تھا۔ اس بے زبان نے کمرے کا نمبر سات بتایا تھا یا سترہ یا ستائیس' مجھے یاد نہیں ہے۔ بہرحال میں سترہ یا ستائیس نمبر کمرے میں جا کر معلوم کرتا ہوں۔"

وہ پلٹ کر جانے لگا۔ سچل نے جلدی سے کہا۔ "ٹھہریے' آپ کون ہیں؟ اس محسنہ نے کیا پیغام دیا ہے؟"

"کس محسنہ نے؟"



"وہی جسے آپ گونگی کہہ رہے ہیں۔"

صداقت نے کہا۔ "اس نے جو بھی پیغام دیا ہے' تم پوچھنے والے کون ہوتے ہو؟"

"جسے آپ پیغام دینا چاہتے ہیں' وہ میں ہی ہوں۔"

"مجھے دھوکا دینے کی کوشش نہ کرو۔ ابھی تم نے کہا ہے کہ تم اس جوان سے واقف نہیں ہو۔"

"لیکن آپ نے یہاں آتے ہی قومی خزانے اور لوٹ کا مال واپس کرنے والے نوجوان کے بارے میں پوچھا تھا۔"

"ہاں پوچھا تھا۔ وہ بے چاری منہ سے بول نہیں سکتی ہے۔ میرے سامنے یہ لکھا تھا کہ جس جوان کو پیغام پہنچانا ہے' اس کی دو پہچان ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس کا بایاں بازو زخمی ہے۔"

"جی ہاں۔ آپ یہ دیکھیں' میرا بایاں بازو زخمی ہے۔ اس نے میری دوسری پہچان کیا لکھی ہے؟"

"یہی کہ اس جوان نے ہمارے ملک کے قومی خزانے میں بیس کروڑ روپے جمع کرائے ہیں۔"

"یہ نہ سمجھ میں آنے والی بات ہے۔ وہ کیسے کہہ سکتی ہے کہ میں نے اتنی بڑی رقم جمع کرائی ہو گی؟"

"اس نے یہ بات اپنے نانا سے سنی ہے۔"

"وہ سن نہیں سکتی ہے۔"

"اس کا باپ تو سن سکتا ہے اور سن کر تحریر کے ذریعے یہ بات بتا سکتا ہے۔"

سچل نے قائل ہو کر کہا۔ "ہاں۔ ایسا ہوا ہو گا۔ اس کے نانا اس کے باپ سے رقم کے بارے میں کیا کہہ رہے تھے؟"

"میاں صاحب زادے۔ مجھے سترہ یا ستائیس نمبر کمروں میں جانے دو۔ ہو سکتا ہے' وہاں بھی کسی جوان کا بایاں بازو زخمی ہو اور اس نے حب الوطنی کا مظاہرہ کیا ہو۔"

"وہ میں ہی ہوں۔ میں نے حب الوطنی کا مظاہرہ نہیں کیا ہے' خاموشی سے فرض

ادا کیا ہے۔"

صداقت نے کہا۔ "تم بہت چالاک ہو۔ پہلے جس بات سے انکار کر رہے تھے اب اسی بات کا اقرار کر رہے ہو۔"

"میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ............"

صداقت نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "جھوٹ بولنے والے جھوٹی قسمیں بھی کھاتے ہیں۔ مجھے اپنی سچائی کا ثبوت دو۔"

سچل نے سوچتی ہوئی نظروں سے صداقت کو دیکھا۔ "میں ٹھوس ثبوت دوں گا۔ پہلے یہ بتائیں کہ آپ کون ہیں؟"

"میں مس شہناز کی کوٹھی کا منتظم اعلیٰ ہوں۔ آج شہناز بی بی نے مجھے اپنا رازدار بنایا ہے اور اس زخمی محب وطن جوان کے نام ایک خفیہ پیغام بھیجا ہے لیکن میں ٹھوس ثبوت کے بغیر تم پر بھروسا نہیں کروں گا۔"

اس نے جیب سے دو تہہ کیے ہوئے کاغذ نکال کر کہا۔ "میں شانی سے ملاقات کرنے کے بعد خود انہیں جلا ڈالنا چاہتا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ خود نہیں آسکے گی اور کوئی پیغام بھیجے گی۔ یہ لیں اور انہیں پڑھ کر اپنی تسلی کر لیں۔"

صداقت نے کاغذات پڑھنے کے بعد کہا۔ "واقعی تمہارے جیسے جوانوں پر پوری قوم کو ناز کرنا چاہیے۔ جب شانی یہ پڑھے گی تو تمام عمر تم پر فخر کرے گی۔"

یہ کہہ کر صداقت نے ان کاغذات کو تہہ کر کے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ سچل نے پوچھا۔ "آپ نے انہیں کیوں رکھ لیا۔ یہ میرے کاغذات ہیں، مجھے واپس کریں۔"

"شانی کا خفیہ پیغام یہی ہے کہ وہ خود ان کاغذات کو پڑھنا چاہتی ہے لیکن تم انہیں کیوں جلانے والے ہو؟؟"

"میں نہیں چاہتا کہ شانی انہیں پڑھے اور مجھے ضمانت پر رہائی کے لیے مجبور کرے۔"

"تم رہائی کیوں نہیں چاہتے؟"

"یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔"



"تم خود کو اسمگلر کہو گے اور جیل جاؤ گے تو کیا شانی کا دل نہیں ٹوٹے گا؟"

"اسی لیے تو یہ کاغذات نہیں پڑھوانا چاہتا۔ وہ یہی سمجھے گی کہ مجھ پر جھوٹا الزام لگا کر سزا دلائی گئی ہے۔"

"سزا دلانے والے اس کے نانا ہیں؟"

"نانا بھی اور میرے بابا سائیں بھی۔"

"مجھے اس بات پر حیران ہونا چاہیے لیکن ہم جس زر پرستی کے دور سے گزر رہے ہیں اس میں باپ اپنی بیٹی کو اغوا کر کے اپنے ہی گھر میں چھپا کر رکھتا ہے اور باپ اپنے بیٹے پر جھوٹا الزام لگوا کر اسے جیل بھیجنا چاہتا ہے لیکن تمہیں جیل بھیجنے کا کوئی مقصد تو ہو گا؟"

"سوری۔ اس بات کا آپ سے یا شانی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کے نانا نے وعدہ کیا ہے کہ میں جیل سے آؤں گا تو وہ شانی کو میری شریک حیات بنا دیں گے۔"

صداقت نے کہا۔ "یہ گاڈ فادر تو بڑا زبردست ہے۔ تمہارے بابا سائیں بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ دونوں کی جو فطرت ہے اس سے یہ ارادہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تمہیں اپنی پٹڑی پر چلانا چاہتے ہیں۔ بیس کروڑ کے نقصان پر تمہارے بابا سائیں بے ہوش ہو گئے ہوں گے۔"

"وہ بے ہوش نہیں ہوئے۔ انہوں نے میرے ہوش اڑانے کی تدبیر پہلے ہی کر لی تھی۔ ان کا تجربہ ہے کہ جیل جرائم سکھانے کی یونیورسٹی ہے۔ جب میں چند برس گزار کر آؤں گا تو ان کی بے انتہا دولت کا صحیح وارث بن جاؤں گا اور پھر کبھی قومی خزانے کے خالی ہونے کا غم نہیں کروں گا۔"

"ساری باتیں واضح ہو رہی ہیں لیکن ایک بات ناقابل فہم ہے۔"

"وہ کیا؟"

"جیسا کہ مجھے معلوم ہوا ہے، تمہاری ماں نے تمہیں رزق حلال حاصل کرنے کا درس دیا ہے اور رزق حلال کی خاطر نہ جانے تم نے نیویارک میں کیسی کیسی مزدوری کی ہے پھر اس ماں نے بھی اچانک اپنا بیان کیوں بدل دیا؟ کیوں ضمانت نامہ پیش نہیں کرتی؟ کیوں تمہاری رہائی نہیں چاہتی؟ ایک مہذب اور شریف بیٹے کو مجرم بنانے پر کیوں آمادہ

ہو گئی ہے؟"

سچل نے حیرانی سے کہا۔ "آپ تو پولیس والوں کی طرح سوالوں کی بوچھاڑ کر رہے ہیں۔ سچ سچ بتائیں' آپ کون ہیں؟"

صداقت علی نے جیب سے اپنا آئیڈنٹی کارڈ نکال کر دکھایا۔ سچل نے بوکھلا کر کہا۔

"آ.......... آپ.......... ڈا.......... ڈائریکٹر جنرل ہیں.........."

وہ بستر سے اٹھنا چاہتا تھا۔ صداقت نے اس کا بازو تھام کر کہا۔ "بیٹھے رہو۔ میں شانی کا باپ ہوں۔ مجھے شانی کے انتخاب پر فخر ہے لیکن مجھ سے کچھ نہ چھپاؤ۔ تمہاری ماں نے بیان کیوں بدل دیا؟"

"مائیں صرف اپنی اولاد کی سلامتی چاہتی ہیں۔ گاڈفادر نے دھمکی دی ہے کہ ابھی ان کے گارڈ نے مجھے صرف زخمی کیا ہے اگر میں اپنے بابا سائیں کا صحیح جانشین نہیں بنوں گا تو مجھے گولی مار دی جائے گی۔ یہ سن کر ماں جی کا کلیجہ دہل گیا۔ آئندہ مجھے کوئی گولی چھو کر بھی جائے گی تو ماں جی کا دم نکل جائے گا۔ وہ کہہ چکی ہیں کہ میں ضمانت کا وہ کاغذ تھانے پہنچاؤں گا اور رہائی حاصل کروں گا تو مجھے گھر میں ان کی لاش ملے گی۔"

"ہوں۔ تو وہ ماں کی ممتا سے کھیل رہے ہیں۔"

"میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ مجھے میری ماں کی زندگی دے دیجئے۔ ان کی زندگی ان کاغذات میں ہے جنہیں آپ نے جیب میں رکھ لیا ہے۔ وہ کاغذات تھانے پہنچیں گے اور مجھے رہائی ملے گی تو ماں جی میری لاش دیکھنے سے پہلے مرجائے گی۔"

صداقت علی نے جیب سے وہ کاغذات نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔ "تمہاری ماں زندہ رہے گی۔ انہیں پھاڑ ڈالو۔ ان کے پرزے پرزے کر دو۔"

وہ شکریہ ادا کرتے ہوئے انہیں پھاڑنے لگا۔ ان کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرنے لگا۔ صداقت نے ردی کی ٹوکری اٹھا کر اس کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ "تمہیں نیک چلنی کا بہت بڑا سرٹیفکیٹ ملا۔ اس نیک چلنی کی لاش اس ٹوکری میں ڈال دو۔ اسے اپنے بابا سائیں کو دکھا دینا۔ ان سب کو یقین آجائے گا کہ تمہارے اندر کی شرافت نے دم توڑ دیا ہے۔"



سچل نے ان کاغذات کے تمام پرزے ردی کی ٹوکری میں ڈال دیے۔ صداقت نے ٹوکری کو پلنگ کے نیچے رکھ دیا پھر کہا۔ "ہم دونوں کی کہانی کسی حد تک یکساں ہے۔ گاڈفادر پیر عظمت اللہ شاہ سلطانی نے مجھے اپنا داماد بنانے سے پہلے ہر ممکن کوشش کی تھی کہ میں ایک کرپٹ افسر بن جاؤں۔ میں کشمکش میں مبتلا ہو گیا تھا کیونکہ ہاجرہ میری زندگی میں بہار کا جھونکا بن کر آئی تھی۔ ہم ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے۔ تقریباً پچیس برس گزر جانے کے بعد بھی ہم میاں بیوی طرح طرح کی آزمائشوں سے گزر رہے ہیں لیکن ہمارے درمیان جو محبت اور اعتماد ہے اس میں کبھی لغزش نہیں آئی۔"

صداقت علی نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "دراصل میں یہ کہہ رہا تھا کہ تمہارے بابا سائیں کی طرح پیر شاہ سلطانی میرے اندر سے بھی شرافت اور فرض شناسی کا جنازہ نکالنا چاہتے تھے۔ ایسے وقت میرے لیے دو باتیں اہم تھیں۔ ایک تو یہ کہ ہاجرہ کو ہر حال میں اپنی دلہن بناؤں۔ دوسری اہم بات یہ کہ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔ میں کرپٹ اور بدعنوان افسر بن کر گاڈفادر کے کرپشن اور ان کے زیرزمین جرائم کے بہت سے ہتھکنڈوں کو سمجھ سکتا تھا۔"

سچل نے پوچھا۔ "اور آپ نے یہی کیا' جو میرے ساتھ ہونے والا ہے؟"

"ہاں۔ میں نے ان کا داماد بننے سے پہلے اور بعد میں ان کے کئی جرائم پر پردہ ڈالا۔ کئی بار قانون شکنی کی پھر شادی کے چند ماہ بعد ہاجرہ نے مجھے خوش خبری سنائی کہ میں باپ بننے والا ہوں۔ اسی دن سے میں نے پٹری بدل دی۔ میں نے جرائم میں ان کا ساتھ دینے کے دوران ان کے خلاف کئی ٹھوس ثبوت جمع کیے تھے۔ میں نے ان ثبوتوں کا حوالہ دیتے ہوئے کہا۔ "آپ جرائم کی دنیا سے نکل آئیں۔ خود کو قانون کے حوالے کر دیں۔ میں کوشش کروں گا کہ آپ کو کم سے کم سزا ہو۔"

انہوں نے ناگواری سے کہا۔ "ابھی بچے ہو۔ بچے ہی رہو۔ میں نے تمہیں داماد بنانے سے پہلے ہی سوچ لیا تھا کہ پر نکالو گے تو پر کتر ڈالوں گا۔ میرے خلاف ثبوت ہے تو اسے تعویذ بنا کر گلے میں پہن لو۔ ثبوت اور گواہ' پولیس اور عدالت صرف ڈاکوؤں' قاتلوں' دہشت گردوں اور اسمگلروں کے لیے ہوتی ہے۔ کسی زیرزمین دنیا کا گاڈفادر نہ

کبھی عدالت کے دروازے پر جاتا ہے اور نہ ہی کبھی قانون کی گولی سے مرتا ہے۔"

"میں نے سمجھا' وہ ڈینگیں مار رہے ہیں۔ ہاجرہ نے مجھے سمجھایا کہ میں اس کے ابا حضور کی مخالفت نہ کروں لیکن میں نے ان کے خلاف تمام ٹھوس ثبوت اپنے اعلیٰ افسران تک پہنچا دیے اور ان کے خلاف ہونے والی کارروائیوں کا انتظار کرنے لگا۔ ایک ہفتے بعد ہی میرا اسلام آباد سے ٹرانسفر کر دیا گیا۔ ایک چھوٹے سے شہر میں بھیج دیا گیا۔ میں نے اس وقت کے ڈائریکٹر جنرل سے کہا۔ "سر! میں نے سسر کے رشتے کا لحاظ نہ کرتے ہوئے ان کے جرائم کے ٹھوس ثبوت پیش کیے تھے۔ اس سلسلے میں ابھی تک ایکشن کیوں نہیں لیا جا رہا ہے؟"

ڈی جی نے کہا۔ "تمہارا ٹرانسفر ہو چکا ہے۔ یہاں جو نیا افسر آیا ہے' اب وہ تمہارے سسر کا کیس ہینڈل کرے گا۔" میں ہاجرہ کو اپنے ساتھ لے جانے کے لیے ان کی کوٹھی میں گیا تو وہ ایک صوفے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ملازم حقے کی آگ تازہ کر رہا تھا۔ ان دنوں وہ دیسی حقے سے شغل کرتے تھے۔ انہوں نے سینٹر ٹیبل سے چند کاغذات اور تصاویر اٹھائیں' پھر مجھ سے کہا۔ "یہ وہی ٹھوس ثبوت اور میرے خلاف تصاویر ہیں' جنہیں تم نے اوپر پہنچایا تھا۔ کیا کشش ثقل کو نہیں سمجھتے؟ جو چیز اوپر پھینکو گے' وہ پلٹ کر نیچے آئے گی۔ اچھی طرح دیکھ لو یہ تمام چیزیں آ گئی ہیں۔"

پھر انہوں نے ملازم سے کہا۔ "آگ تازہ نہیں ہو رہی ہے تو انہیں جلاؤ۔ ابھی شعلے بھڑکنے لگیں گے۔"

ملازم ان تمام ثبوتوں کو حقے کی آگ میں جلانے لگا۔ میں خاموشی اور بے بسی سے دیکھتا رہا۔ انہوں نے کہا۔ "جب تک زندہ رہو' ہماری بیٹی کے احسان مند رہو۔ اگر ہاجرہ بیٹی کی آنکھوں سے تمہارے لیے آنسو نہ نکلتے تو ان ثبوتوں کے تم بھی زندہ جلتے رہتے۔"

میں نے کہا۔ "میں اپنی شریک حیات کو لینے آیا ہوں۔"

"وہ کسی چھوٹے شہر میں رہنے نہیں جائے گی۔ تم وہاں سزا کے طور پر چند ماہ رہو پھر کسی بڑے شہر میں تمہارا ٹرانسفر ہو جائے گا۔"

"میں ان دنوں ایک جونیئر افسر تھا۔ محکوم اور مجبور۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہاجرہ



میرے لیے ڈھال بن گئی تھی۔ وہ گاڈفادر مجھے جانی نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا۔ جب شانی پیدا ہوئی تو میرا ٹرانسفر دوبارہ اسلام آباد ہو گیا۔ میں نے وہاں ایک بہت بڑے اسمگلر کو گرفتار کیا۔ میرے سسر کی سفارش آئی کہ وہ اسمگلر جو سوسائٹی میں بڑا نیک نام تھا' اسے رہا کر دوں اور وہ کیس آگے نہ بڑھاؤں۔

"میں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ معاملہ ایک ایسے جج کے پاس براہ راست پہنچایا جو گاڈفادر کے دباؤ میں نہیں تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس بڑے اور عزت دار اسمگلر کو سزا ہو گئی۔ میرے سسر نے پہلی بار شکست کھائی تھی۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ مجھے پولیس یا انٹیلی جنس کے شعبے میں نہیں رہنے دیں گے۔ انہوں نے میرا تبادلہ لندن کے پاکستانی سفارت خانے میں کرا دیا۔ انہوں نے یہ بہت بڑی غلطی کی تھی۔ انہوں نے اپنی دانست میں مجھے ہزاروں میل دور بھگایا تھا لیکن اسکاٹ لینڈ یارڈ کے بہت قریب پہنچا دیا تھا۔ میں نے اس ادارے میں داخل ہو کر اتنی محنت اور لگن سے کامیابیاں حاصل کیں اور چند ایسے خطرناک بین الاقوامی مجرموں کو گرفتار کیا کہ مجھے اے کلاس سراغ رساں کی حیثیت سے اسکاٹ لینڈ یارڈ کی مستقل رکنیت حاصل ہو گئی۔ آج بھی میں پاکستانی ہوں لیکن اسکاٹ لینڈ یارڈ کا رکن ہوں۔ اس ادارے نے میری خواہش اور حکومت پاکستان کی رضامندی سے یہاں موجودہ عہدے پر فرائض ادا کرنے کی اجازت دے دی ہے۔ میں نے ان شرائط پر یہ عہدہ قبول کیا ہے کہ کسی سیاسی دباؤ میں رہ کر کام نہیں کروں گا۔"

صداقت علی سچل کے سامنے ٹہلتا جا رہا تھا اور بولتا جا رہا تھا۔ پھر وہ ایک جگہ رک گیا۔ وہاں سے پلٹ کر سچل کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں ماضی کے کچھ حالات مختصر طور پر اس لیے بتا رہا ہوں کہ تمہارے ساتھ بھی کچھ ایسے ہی حالات ہیں۔ شانی میری بیٹی ہے۔ کسی کو اپنے جیون ساتھی بنانے کے لیے خود اپنے دل و دماغ سے فیصلہ کرے گی یا پھر میرے انتخاب پر بھروسا کرے گی۔ میں اس کا باپ ہوں لیکن میرا حق اس کے نانا استعمال کر رہے ہیں۔ جس طرح مجھے داماد بنانے سے پہلے اپنی راہ پر چلا رہے تھے اسی طرح میری بیٹی کو تمہاری شریک حیات بنانے سے پہلے تمہارے بابا سائیں کی راہ پر تمہیں چلانا چاہتے ہیں۔"

سچل نے کہا۔ "اور میں ان کی راہ پر چلوں گا لیکن آپ کے نقش قدم پر چلوں گا۔ آپ کی طرح ان کے راستے پر چلتے چلتے اسی راستے پر آ جاؤں گا جہاں ابھی آپ کھڑے ہیں۔"

"میں یہی چاہتا ہوں۔ جیل جاؤ' ماں کو اطمینان رہے گا کہ کسی دشمن کی گولی تمہاری طرف نہیں آئے گی۔ تمہارے بابا سائیں سکھ کا سانس لیں گے کہ ان کا وارث جیل سے دولت میں اضافہ کرنے کی ڈگری لے کر آیا ہے اور میرے سسر گاڈ فادر جب یہ دیکھیں گے کہ تم باپ کی بے انتہا دولت کے مالک بن گئے ہو اور مزید دولت چور دروازوں سے حاصل کرنے لگے ہو تو وہ تمہیں اپنا رشتے دار ضرور بنائیں گے۔"

"پتہ نہیں گاڈ فادر اور بابا سائیں مجھے ٹریننگ دینے کے لیے کیسے کیسے ذرائع اختیار کریں گے۔"

صداقت نے مسکرا کر کہا۔ "وہ دونوں بڑے پہنچے ہوئے ہیں۔ جیل کے اندر بھی ان کے چھٹے ہوئے بدمعاش' پروفیسر اور پرنسپل کے فرائض ادا کرنے پہنچ جائیں گے۔ فکر نہ کرو۔ میرے بھی کچھ تربیت یافتہ بندے ہوں گے۔ تماشا دونوں طرف سے ہو گا۔"

صداقت نے ہاتھ بڑھایا۔ سچل نے مسکرا کر اس سے ہاتھ ملایا پھر صداقت نے کہا۔ "وش یو گڈ لک..........."

★============★============★

روبی ایک کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں بیٹھی ہوئی تھی۔ سنی یہ کہہ کر گیا تھا کہ یہ محفوظ جگہ ہے۔ اسے کچھ دیر تنہا رہنا چاہیے اور جو کچھ اس نے اپنے طور پر کیا ہے اور اس کے جو نتائج سامنے آئے ہیں اس پر غور کرنا چاہیے۔

وہ اسے تنہا چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اپنے فراڈ محبوب کامران اور اس کے عیاش دوستوں سے نجات حاصل کرتے وقت سنی اسے ایک فرشتہ نظر آیا تھا۔ اگر وہ عین وقت پر نہ آتا تو ایک ایسی شرمناک ویڈیو فلم تیار ہو جاتی کہ پھر وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتی۔

وہ سنی کے ساتھ اس جہنم سے اس کوٹھی تک آئی تھی۔ لیکن اس سے کوئی بات



نہیں کی تھی۔ ایک کار میں اس کے ساتھ رہی مگر سر جھکائے بیٹھی رہی۔

اب بھی سنی سے یہ نہیں پوچھا کہ تنہا چھوڑ کر کہاں جا رہے ہو؟ آخر کس منہ سے پوچھتی؟ تمام رشتوں' تمام محبتوں کو چھوڑ کر تنہا آئی تھی۔ اگر اپنوں کو چھوڑ کر پرائے کو اپنا سمجھا تھا تو وہ ایک سراب تھا۔ ایک اندھا کنواں تھا جس میں وہ گری ہوئی تھی۔

اس نے نظریں اٹھا کر ڈرائنگ روم کو دیکھا۔ پتہ نہیں' وہ کس کی کوٹھی تھی۔ وہ صوفے سے اٹھ کر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی کوٹھی کے دوسرے حصوں میں جا کر دیکھنے لگی۔ شاید وہاں کوئی ہو لیکن کوئی ایک ملازم بھی نہیں تھا۔ وہ پوری کوٹھی کا چکر لگا کر پھر ڈرائنگ روم میں آ گئی۔

ہر لڑکی اپنا ایک شاندار مستقبل بنانا چاہتی ہے۔ اسے کامران اس لیے پسند آیا تھا کہ اس نے خود کو دولت مند ظاہر کیا تھا۔ اسے یہ بتایا تھا کہ امریکہ سے صرف ایک پاکستانی لڑکی سے شادی کرنے آیا ہے۔ وہ ہونے والی دلہن کے لیے گرین کارڈ بھی لایا تھا۔ روبی آسانی سے فریب میں نہ آتی لیکن اس کی ممی جس گاڈ فادر حمزہ بیگ کی ہدایات پر عمل کرتی تھیں اسی حمزہ بیگ نے تصدیق کی تھی اور کہا تھا کہ کامران امریکہ میں لاکھوں ڈالر کماتا ہے۔ اگر وہ کنوئیں سے نکل کر سمندر کی طرف نہیں جائے گی تو بچپن کے طے شدہ رشتے کے مطابق اسے سنی جیسے ایک صحافی کے ساتھ زندگی گزارنی ہو گی۔

اس نے جس خاندان اور ماحول میں پرورش پائی تھی' وہاں کمائی اسے کہا جاتا تھا جو دست غیب سے آیا کرتی ہے اور اپنی آمد کے لیے نئے نئے چور دروازے کھولتی رہتی ہے۔ جس ماحول میں جھوٹ بولنا لازمی ہوتا تھا' وہاں سنی سچی اور کھری باتیں کیا کرتا تھا اس لیے اس نے کامران کو سنی پر ترجیح دی تھی۔

اب اس کا جو نتیجہ سامنے آیا تھا وہ ایک بھیانک خواب جیسا لگ رہا تھا۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایک بہت بڑے گاڈ فادر کی پوتی بازاری عورت بننے والی تھی۔ اسے شدت سے اپنی توہین کا احساس ہو رہا تھا۔ خصوصاً سنی سے بولنا بھی کیا نظریں بھی نہیں ملانا چاہتی تھی۔ جسے زیرو سمجھتی تھی اس نے ہیرو بن کر اس پر ایسا احسان کیا تھا کہ اب ہمیشہ اس کے سامنے سر جھکا رہتا۔

وہ سنی کے احسان کا بوجھ اٹھانا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے دوسرے پہلو سے سوچا۔ سنی کوئی فلمی ہیرو تو نہیں ہے جو تنہا آیا اور ان تمام بدمعاشوں سے اسے بچا کر لے آیا۔ اس کے ساتھ اور بھی کئی گن مین تھے اور وہ یقیناً دادا جان کے کارندے ہوں گے۔ اسے سنی نے نہیں اس کے گاڈفادر دادا جان کی طاقت اور وسیع ذرائع نے اس جہنم سے نکالا ہے۔

اسے آہٹ سنائی دی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ایک نوجوان لڑکی ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول کر اندر آئی تھی اور روبی کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ روبی کی نظریں بھی سوالیہ تھیں۔ وہ صوفے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

آنے والی نے کہا۔ "سوری۔ میں مجبوراً یہاں آئی ہوں۔ اس نے کہا ہے کہ میں یہاں محفوظ رہوں گی۔ باہر نکلوں گی تو درندے میری بوٹیاں نوچ لیں گے۔ کیا میں یہاں کچھ وقت گزار سکتی ہوں؟"

بڑی عجیب بات تھی۔ سنی بھی روبی سے یہی کہہ گیا تھا کہ وہ اس کوٹھی میں محفوظ رہے گی۔ اسے تنہا رہ کر اپنے حالات پر غور کرنا چاہیے۔

اس نے اجنبی لڑکی سے کہا۔ "یہ میری کوٹھی نہیں ہے۔ مجھے بھی کوئی حفاظت کی خاطر یہاں چھوڑ گیا ہے۔ تمہیں یہاں کس نے پہنچایا ہے؟"

"چٹکی بادشاہ نے۔ کیا تم چٹکی بادشاہ کو جانتی ہو؟"

"میں نہیں جانتی۔ اس کا نام عجیب سا ہے۔ چٹکی بادشاہ' یہ بھی کوئی نام ہے۔"

"جیسا نام ہے' ویسا ہی بادشاہ آدمی ہے۔ ایک چٹکی بجاتا ہے اور ناممکن کو ممکن بنا دیتا ہے۔"

وہ روبی کے ساتھ آ کر ایک صوفے پر بیٹھ گئی پھر بولی۔ "وہ عجیب شخص ہے۔ بدمعاش بھی ہے اور شریف بھی۔ وہ مجھے اغوا کر کے ایسی جگہ لے گیا جہاں پہلے سے چند بدمعاش تھے۔ ویڈیو کیمرا مین اور لائٹ مین بھی تھے۔ وہ میری عزت کی دھجیاں اڑا کر ایک شرمناک فلم شوٹ کرنا چاہتے تھے۔"

روبی کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ وہ بولی۔ "یہ تو تم میری روداد سنا رہی ہو۔ مجھے



کامران نامی ایک نوجوان دھوکے سے وہاں لے گیا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ لوگ بے حیائی سے میری فلم تیار کرتے' میرا کزن سنی وہاں مسلح افراد کے ساتھ آ گیا پھر مجھے وہاں سے یہاں لے آیا۔"

وہ بولی۔ "ہاں۔ ایک کامران نامی نوجوان وہاں تھا۔ وہاں فون پر سنی کا بھی ذکر ہوا تھا۔ کیا تمہارا نام روبی ہے؟"

"ہاں۔ کیا تم نے وہاں میرا نام سنا تھا؟"

اس نے گھبرا کر پوچھا۔ "کیا تم پیر عظمت اللہ شاہ سلطانی کی پوتی ہو؟"

"ہاں۔ مگر تم کون ہو؟"

وہ صوفے سے اچھل کر کھڑی ہو گئی پھر بھاگتی ہوئی دروازے کے پاس آئی۔ وہاں سے بھاگ کر باہر جانے کے لیے دروازہ کھولا تو ایک دم سے ٹھٹک گئی۔ سامنے جو کھڑا ہوا تھا' اس نے چٹکی بجائی۔ پھر ایک انگلی کے اشارے سے واپس اندر جانے کے لیے کہا۔

وہ پیچھے ہٹ کر بولی۔ "تم نے کہا تھا' میں یہاں محفوظ رہوں گی مگر یہاں میرے بابا جانی کے مخالف گاڈفادر کی پوتی ہے۔"

روبی نے قریب آ کر کہا۔ "اچھا تو تم اس شیطان حمزہ بیگ کی بیٹی ہو۔ میں اسے باپ اور بزرگ سمجھتی تھی۔ اس کی باتوں پر بھروسہ کر کے کامران کے ساتھ آئی تو پتہ چلا کہ تمہارے باپ نے مجھے ایک بازاری عورت بنانے کے تمام انتظامات کر رکھے تھے۔ اب میں تمہارے ساتھ وہ سلوک کروں گی کہ.........."

چٹکی بادشاہ نے اس کی بات پوری نہیں ہونے دی۔ ایک چٹکی بجا کر اندر آیا پھر کہا۔ "میری بات ایک چٹکی میں سمجھ لو۔ ویڈیو فلم تیار کرنے کا تمام سامان یہاں بھی آ سکتا ہے اور چرسی نوجوانوں کی فوج بھی بلائی جا سکتی ہے۔"

وہ دونوں سہم کر اسے دیکھنے لگیں۔ وہ بولا۔ "جاؤ آرام سے بیٹھو۔"

وہ سہمے ہوئے انداز میں الگ الگ صوفوں پر آ کر بیٹھ گئیں۔ وہ ایک صوفے کے پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا پھر اس صوفے کی پشت پر ہاتھ ٹیک کر کہا۔ "انسان ہو یا جانور' اسے ضرورت سے زیادہ طاقت مل جائے تو وہ غرور سے اچھلتا ہے۔ اس چار دیواری میں تم

دونوں کی کوئی طاقت نہیں ہے۔ نازو! تم کسی گاڈ فادر کی بیٹی نہیں ہو اور روبی! تم کسی گاڈفادر کی پوتی نہیں ہو۔ تم دونوں عام سی لڑکیاں ہو۔ ایسی لڑکیاں جن پر برا وقت آئے تو اپنی آبرو بچانے کے بھی قابل نہیں رہتیں۔"

وہ دونوں ایک دوسرے کو سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگیں۔ وہ بولا۔ "نازو! فون پر ہونے والی باتیں سن چکی ہے۔ ایک تخریب کار ایجنسی کا گاڈفادر حمزہ بیگ اپنی تمام تر طاقت اور ذرائع کے باوجود مجبور ہو گیا۔ اس نے اپنی بیٹی یرغمال کے طور پر میرے پاس چھوڑ دی ہے اور روبی جانتی ہے کہ اس کے گاڈفادر دادا جان ایسے وقت تمام فون بند کر کے سوتے ہیں۔ یہاں پوتی کی عزت دو کوڑی کی ہو جاتی اور دادا جان کو کل صبح سے پہلے خبر نہ ہوتی۔ ایسے میں سوچو' غور کرو کہ تم دونوں کی اوقات کیا ہے؟"

دونوں کے سر جھک گئے۔ اس وقت وہ دونوں مجبور اور بے بس تھیں۔ وہ بولا۔ "جب کبھی بے بسی کا دور گزر جاتا ہے اور طاقت پھر سے بحال ہو جاتی ہے تو آدمی بے بسی کو عارضی سمجھ کر اور طاقت کو دائمی سمجھ کر اترانے لگتا ہے۔ جب تم اپنے باپ اور دادا کے پاس پہنچ جاؤ گی تو تمہارے پھر وہی پُرغرور تیور ہوں گے۔ بہرحال رات زیادہ ہو چکی ہے۔ جا کر سو جاؤ۔ اپنی اپنی خواب گاہوں کو اندر سے بند کر لو۔ کل جب آنکھ کھلے تو آنکھ کے ساتھ دل اور دماغ کی بیداری بھی ہو اور یہ نکتہ ذہن میں رہے کہ میرے پاس طاقت ہے لیکن میں نے تمہیں بے آبرو نہیں کیا۔ جہاں شرافت ہوتی ہے وہاں طاقت کا بے جا استعمال نہیں ہوتا۔"

یہ کہہ کر وہ پلٹ گیا۔ وہاں سے چلتا ہوا دروازے تک گیا۔ پھر ان کی طرف دیکھے بغیر ہاتھ اٹھا کر ایک چٹکی بجائی اور کہا۔ "دروازہ اندر سے بند کر لو۔"

وہ دہلیز پار کر کے باہر گیا پھر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ وہ دونوں دیر تک کھلے ہوئے دروازے کو دیکھتی رہیں اور سنجیدگی سے سوچتی رہیں پھر نازو نے اٹھ کر دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔

وہ ڈرائنگ روم اندر سے بند ہو گیا بلکہ وہ پوری کوٹھی اندر سے بند ہو گئی تھی۔ باہر سے کوئی آ نہیں سکتا تھا۔ اندر دو پہاڑ جیسے دشمنوں کی اولادیں مقید ہو گئی تھیں۔ ندی



کے دو کنارے کبھی نہیں ملتے لیکن قدرت ملا دیتی ہے۔ ندی آگے جا کر خشک ہو جائے تو ایک کنارے کا مسافر پیدل چلتے ہوئے دوسری طرف کسی پل کے بغیر پہنچ جاتا ہے۔ کناروں کی تعداد دو نہیں رہتی ایک ہو جاتی ہے۔

وہ ایک دوسرے کی طرف نہیں دیکھ رہی تھیں۔ روبی کی انگلی میں سونے کی ایک نازک سی انگوٹھی میں بہت قیمتی موتی جڑا ہوا تھا۔ وہ سر جھکائے اس انگوٹھی کے موتی کو سہلاتے ہوئے بولی۔ "میں نے اس کوٹھی کو اندر سے دیکھ لیا ہے۔ اس ڈرائنگ روم کے سامنے والا بیڈ روم اپنے لیے پسند کر لیا ہے۔ تم کوئی دوسرا بیڈ روم دیکھ لو۔"

نازو نے جب دیکھا کہ وہ اس سے مخاطب ہو کر نہیں بول رہی ہے تو اس نے اپنے نیکلس کو یوں تھام لیا جیسے اس نیکلس میں جڑے ہوئے قیمتی ہیروں سے کھیل رہی ہو پھر وہ بولی۔ "میں تو کسی بھی بیڈ روم میں سو جاؤں گی مگر سوچتی ہوں کہ یہ کوٹھی کس حد تک محفوظ ہے؟ کہیں چور ڈاکو نہ آ جائیں۔ میرا یہ نیکلس ڈھائی لاکھ روپے کا ہے۔"

روبی نے اسے چونک کر دیکھا۔ اسے نہیں' اس کے نیکلس کو دیکھا پھر ناگواری سے بولی۔ "میں تو کسی کو چرانے کا موقع ہی نہیں دیتی۔ چوری سے پہلے ہی ایسے ڈھائی لاکھ خیرات کر دیتی ہوں۔"

"آج ایک شریف آدمی نہ آتا تو کیا اپنی آبرو بھی خیرات کر دیتیں؟"

"یو شٹ اپ۔ میں تم سے نہیں بول رہی ہوں۔"

"کسی کی موجودگی میں صرف اپنے آپ سے بولنے والے ایب نارمل ہوتے ہیں۔"

"یہ نہ سمجھو کہ مقدر نے ہمیں ایک چھت کے نیچے پہنچا دیا ہے تو تم میرے برابر ہو جاؤ گی اور تمہارا باپ میرے دادا جان کی طرح ہائی لیول کا گاڈفادر بن جائے گا۔"

"ہائی لیول؟" نازو قہقہہ لگانے لگی۔ "اونچی سطح' اونچا اسٹیٹس مجرموں اور ملک دشمن عناصر میں بھی ہوتا ہے۔"

روبی نے گھور پوچھا۔ "اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟"

نازو نے کہا۔ "آج سے پہلے میں ہنسنے والوں پر ہنستی تھی کہ وہ ہماری امارت اور

شان و شوکت سے جلتے ہیں۔ ہم پر ہنسنے کے سوا ہمارا کچھ بگاڑ نہیں سکتے مگر آج ہمارا اتنا کچھ بگڑنے والا تھا کہ ہمارے باپ دادا کی طاقت اور دولت بھی ہمیں ہائی لیول سے نیچے گرنے سے نہ بچا سکیں۔ بچایا تو ایک انسان کی شرافت نے............"

وہ اس کے صوفے کے قریب آ کر بولی۔ "اس شخص نے ہمیں ایک نکتے پر غور کرنے کے لیے کہا ہے۔ طاقت اور دولت یوں تو بہت کچھ کر سکتی ہیں لیکن عورت کی آبرو کو صرف مرد کی شرافت ہی بچا سکتی ہے۔ جہاں مرد شیطان ہوتا ہے وہاں صرف میرے نیکلس کا ہیرا اور تمہاری انگوٹھی کا موتی ہائی لیول پر رہ جاتا ہے۔ ہم کہیں کے نہیں رہتے۔"

روبی پر اس بات کا اثر ہو رہا تھا مگر نازو سے متاثر ہونے میں کمتری محسوس کر رہی تھی۔ وہ صوفے سے اٹھ کر بولی۔ "مجھے نیند آ رہی ہے۔"

وہ اٹھی مگر آگے نہ بڑھ سکی۔ ہلکی سی چیخ مار کر پھر صوفے پر بیٹھ گئی۔ بات کچھ نہیں تھی۔ صرف بجلی گئی تھی۔ اچانک تاریکی چھا گئی تھی اور روبی کو تاریکی سے خوف آتا تھا۔ وہ اپنی خواب گاہ میں ہمیشہ لائٹ آن کر کے سوتی تھی۔ اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "یا.......... یہاں.......... کک.......... کوئی ہے۔ کسی نے ان.......... اندھیرا کیا ہے۔"

اسے یاد آیا کہ اس نے کوٹھی کے اندر گھوم کر ہر حصے کو دیکھا تھا۔ کوئی نہیں تھا۔ تمام دروازے اور کھڑکیاں بھی اندر سے بند تھیں۔ یہ سمجھ میں آ گیا کہ بجلی کا بریک ڈاؤن ہوا ہے یا لوڈ شیڈنگ ہو رہی ہے۔

وہ ذرا دیر سہمی سی سوچتی رہی' پھر بولی۔ "ایسے میں کوئی دروازہ یا کھڑکی توڑ کر آ سکتا ہے۔ مجھے بڑا ڈر لگ رہا ہے۔"

اس کے چاروں طرف تاریکی اور خاموشی مسلط رہی۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی۔ الو کی نسل سے ہوتی تو دکھائی دیتا۔ اسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ "تم کہاں ہو؟"

اسے جواب نہیں ملا۔ اس نے دوبارہ پوچھا۔ "تمہارا نام نازو ہے نا؟"



بدستور خاموشی رہی تو وہ اور زیادہ سہم کر بولی۔ "تم خاموش کیوں ہو؟ کہاں چلی گئی ہو؟"

اسے اندھیرے نے کھا لیا تھا۔ کیا اندھیرا حوا خور ہوتا ہے۔ نازو کو چبا کر نگلنے کے بعد اسے بھی نگل لے گا۔ اب وہ مارے خوف کے رونے والی تھی۔ ابھی آنکھوں میں آنسو نہیں آئے تھے مگر روہانسی ہو کر بولی۔ "تم نے جواب نہ دیا تو میرا دم نکل جائے گا۔ کیا تمہیں کوئی پکڑ کر لے گیا ہے؟"

اتنی دیر کی خاموشی کے بعد نازو کی آواز آئی۔ "تقدیر نے ہمیں ایک چھت کے نیچے پہنچایا تھا۔ تاریکی نے ہمیں الگ کر دیا ہے۔ دو بڑے دشمنوں کے خاندانوں سے تعلق رکھنے والے یکجا نہیں رہ سکتے۔ ذرا تاریکی میں ہائی لیول کی بلندی ناپ کر دیکھو کہ تم مجھ سے کتنی اونچائی پر ہو۔"

روبی رو پڑی۔ سسکیاں لیتے ہوئے بولی۔ "مجھے طعنے نہ دو۔ فار گاڈ سیک میرے پاس آؤ۔ میں نے اپنا ہاتھ بڑھایا ہوا ہے میرا ہاتھ پکڑ لو۔"

نازو نے تاریکی میں اِدھر اُدھر ٹٹول کر اس کا ہاتھ چھو لیا پھر پکڑ لیا۔ اس نے ایک ہاتھ سے پکڑا تھا۔ روبی نے سہارا ملتے ہی اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ نازو اس کے پاس آ کر صوفے پر بیٹھ گئی پھر بولی۔ "کیا تمہیں تاریکی میں ڈر لگتا ہے؟"

روبی نے جواب نہیں دیا۔ وہ نازو سے ایسے لپٹ گئی تھی جیسے اسے کوئی پکڑنے آ رہا ہو۔ وہ اسے تھپک کر بولی۔ "اندھیرا ہے مگر ہم اس کوٹھی میں ہیں جہاں تھوڑی دیر پہلے روشنی تھی۔ اس کے علاوہ یہ کوٹھی چاروں طرف سے بند ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہاں تمہیں کس کا خوف ہے؟ کیا تم جنوں بھوتوں کی کہانیاں سنتی ہو؟"

"پلیز' ان کا نام نہ لو۔"

نازو ہنسنے لگی۔ ہنستے ہنستے بولی۔ "ہم انسانوں سے بڑا کوئی بھوت نہیں ہوتا۔ تم ڈرتے ڈرتے صبح کر دو گی تب بھی یہاں کوئی بھوت نہیں آئے گا۔"

روبی نے جواباً کچھ نہیں کہا۔ تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد نازو نے کہا۔ "یہ کیسی بات ہے۔ روشنی میں ہم دشمن تھے۔ تاریکی میں ہم نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لیا۔

اب تم مجھ سے لپٹی ہوئی ہو۔ میری بات کو طعنہ نہ سمجھنا۔ سمجھنے کی بات یہ ہے کہ اگر ساری دنیا میں تاریکی ہو تو آدمی آدمی کا ہاتھ تھام کر رہے گا کیونکہ اسے دشمنی کی نہیں، سہارے کی ضرورت ہو گی۔ ہم کیسے انسان ہیں۔ روشنی میں ساتھ چھوڑ دیتے ہیں اور تاریکی میں ایک دوسرے کو تھام لیتے ہیں۔ آؤ روبی! خدا سے دعا کریں۔ یا خدا! ہماری دنیا میں سورج طلوع نہ ہو۔ اگر تاریکی میں محبت اور دوستی پروان چڑھتی ہے تو ہمیں روشنی کا عذاب نہ دے۔ اگر روشنی لازمی ہے تو پہلے محبت اور دوستی کو مستحکم کر دے۔ اس کے بعد سورج کو طلوع ہونے کی اجازت دے۔"

روبی نے ٹٹول کر نازو کے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا پھر اس کے ایک رخسار کو چوم کر بولی۔ "یہ میری دعا ہے۔"

وہ دوسرے رخسار کو چوم کر بولی۔ "یہ سورج ہے میرے اندر طلوع ہو رہا ہے۔"

وہ اس کی پیشانی کو چوم کر بولی۔ "یہ روشنی ہے، جو تم نے مجھے دی۔ میں تمہیں دے رہی ہوں۔"

نازو نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا پھر اس کے سر کو اپنے سینے سے لگا کر ممتا بھرے انداز میں تھپکنے لگی۔ اگرچہ وہ بھی روبی کی ہم عمر تھی لیکن ذہانت میں بڑی تھی۔ اسے ممتا بھرا انداز دے کر گویا بچی کو ماں کی گود میں پہنچا کر اس کے اندر کا خوف نکال رہی تھی بلکہ خوف کی جگہ محبت کو مسلط کر چکی تھی۔

وہ بڑی دیر تک اسی طرح ایک دوسرے سے لگی بیٹھی رہیں۔ پھر دروازے پر دستک سنائی دی۔ اگر روشنی ہوتی تو وہ الگ ہو کر بیٹھ جاتیں۔ تاریکی میں کسی اجنبی کی آمد کا خوف ہوتا ہے اس لیے وہ ایک دوسرے سے چمٹ گئیں۔

دوسری دستک پر سنی کی آواز سنائی دی۔ "روبی! میں سنی ہوں۔"

پھر دوسری آواز سنائی دی۔ "اور میں ہوں............"

بات ادھوری تھی مگر چٹکی کی آواز نے سمجھا دیا کہ دوسرا کون ہے۔ نازو صوفے سے اٹھ گئی۔ روبی تاریکی میں تنہا نہیں رہ سکتی تھی۔ اس نے نازو کا ہاتھ پکڑ لیا پھر دونوں تاریکی میں سنبھل کر چلتی ہوئی دروازے تک پہنچیں۔ روبی نے اپنے اطمینان کے لیے



پوچھا۔ "سنی! تم ہی ہو نا؟"

دوسری طرف سے اس نے کہا۔ "اس وقت پکے کاغذ پر لکھ کر نہیں دے سکتا۔ یقین کر لو کہ سنی ہوں۔ کیا آواز نہیں پہچانتی ہو؟"

نازو نے کہا۔ "میں چٹکی پہچانتی ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے دروازہ کھول دیا۔ باہر سنی اور چٹکی بادشاہ ایک بڑی سی موم بتی روشن کیے کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں کچھ سامان بھی تھا۔ وہ اندر آئے، سنی نے کہا۔ "پورے علاقے میں اندھیرا ہے۔ پتہ نہیں کب بجلی آئے گی۔ ہم نے سوچا، تم دونوں کو ڈر لگ رہا ہو گا۔"

وہ باتیں کرتے ہوئے صوفوں کے پاس آئے۔ روبی نے کہا۔ "مجھے ڈر لگ رہا تھا مگر نازو بڑی ہمت والی ہے۔"

چٹکی بادشاہ نے چند پیکٹس سینٹر ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔ "میں یہ پوچھنا بھول گیا تھا کہ تم دونوں نے کچھ کھایا ہے یا نہیں؟ اس لیے کچھ کھانے کو لے آیا ہوں۔ چائے کا سامان کچن میں ہے اور یہاں چارجر لائٹ بھی ہے، ابھی لاتا ہوں۔"

وہ اٹھ کر ٹی وی ٹرالی کے پاس گیا پھر ٹرالی کے پٹ کھول کر چارجر لائٹ نکال کر آن کیا۔ ڈرائنگ روم کافی حد تک روشن ہو گیا۔ اس نے لائٹ کو سینٹر ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔ "اب یہ لڑکیوں کا کام ہے کہ وہ کچن سے پلیٹیں اور پانی کی بوتلیں لے کر آئیں۔"

وہ دونوں چارجر لائٹ اٹھا کر چلی گئیں۔ سنی نے کہا۔ "میرا خیال تھا کہ نازو دشمن کی بیٹی ہے۔ وہ یہاں سہمی ہوئی ہو گی۔ موقع ملنے پر یہاں سے بھاگ سکتی ہے لیکن اس کے برعکس روبی سہمی ہوئی تھی اور نازو تو ایسے ہے جیسے اپنے گھر میں ہو۔"

چٹکی بادشاہ نے کہا۔ "یہ میرا گھر ہے۔ میں عورتوں سے دس قدم دور رہتا ہوں۔ پہلی بار یہ دو لڑکیاں میرے گھر میں آئی ہیں۔ نازو کا باپ ہماری شرائط پوری کر دے گا تو میں اسے اس کے گھر پہنچا دوں گا۔ تب تک تم روبی کو یہیں رہنے دو ورنہ نازو تنہا رہے گی تو خواہ مخواہ میری بدنامی ہو گی۔"

سنی نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تم گاڈفادر جیسے دشمن کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیتے ہو مگر عورتوں سے ڈرتے ہو۔"

"میں عورتوں سے نہیں ڈرتا۔ خواہ مخواہ کی بدنامی مول لینا نہیں چاہتا۔ کل شام تک نازو کو اس کے چچا کے گھر تک پہنچا دوں گا۔"

دونوں پلیٹیں اور پانی وغیرہ لے آئیں۔ نازو نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"ابھی تم کیا کہہ رہے تھے۔ کیا مجھے چچا کے گھر چھوڑ آؤ گے؟"

وہ کھانے کے پیکٹس کھولتے ہوئے بولا۔ "ابھی نہیں، کل جب تمہارے بابا جانی تمام شرائط پوری کر دیں گے تو..........."

وہ بات کاٹ کر بولی۔ "تو بھی نہیں جاؤں گی۔"

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیوں نہیں جاؤ گی؟"

"مجھ سے سوال نہ کرو۔ میرے سوال کا جواب دو۔ یہاں سے نہیں جاؤں گی تو کون سی قیامت آ جائے گی؟"

"یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے؟ میں یہاں تنہا رہتا ہوں۔ تم رہو گی تو بدنامی ہو گی۔ اس علاقے کے لوگ مجھے عورتوں کے معاملے میں شریف سمجھتے ہیں۔ یہاں کی عورتیں مجھے بھائی اور بیٹا سمجھتی ہیں۔"

"میرے چچا کے محلے میں لوگ مجھے بہن اور بیٹی سمجھتے تھے۔ تم ہتھیار کے زور پر مجھے وہاں سے اٹھا لائے۔ میں ایک رات یہاں رہ کر جاؤں گی تو کسی سے نظریں نہیں ملا سکوں گی۔ تمہیں اپنی بدنامی کا خیال ہے اور میری بدنامی تمہیں منظور ہے۔"

وہ اسے دیکھتا رہ گیا۔ روبی نے کہا۔ "انصاف کا تقاضا ہے کہ نازو کی نیک نامی واپس کی جائے تاکہ یہ اپنی سوسائٹی میں بدنام نہ ہو۔"

وہ بولا۔ "مس روبی! تم ہمارے گاڈفادر کی پوتی ہو اس لیے میں تم سے بحث نہیں کروں گا مگر نازو سے کہتا ہوں کہ اس کے باپ نے جو بویا ہے، وہی کاٹے گا۔"

نازو نے کہا۔ "میرے باپ کو سزا ملنی چاہیے۔ کیا تمہارا ضمیر کہتا ہے کہ باپ کی سزا بیٹی کو ملے؟ پھر یہ کہ میں تمہارے مخالف گاڈفادر کی بیٹی نہیں ہوں۔"



"مجھے دھوکا دینے کی کوشش نہ کرو۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم حمزہ بیگ کی بیٹی ہو۔"

"تھی.......... جب تم نے اغوا کیا تو میں گاڈفادر حمزہ بیگ کی بیٹی تھی مگر جس لمحے میں مجھے تمہارے پاس بطور یرغمال رہنے کے لیے چھوڑ دیا گیا اس لمحے سے گاڈفادر حمزہ بیگ کی بیٹی مر گئی۔ پھر تم نے مجھ سے اور روبی سے کہا کہ تمہارے پاس طاقت ہے لیکن تم نے ہمیں بے آبرو ہونے نہیں دیا کیونکہ جہاں شرافت ہوتی ہے، وہاں طاقت کا بے جا استعمال نہیں ہوتا۔ تمہاری اس بات سے یہ نکتہ سمجھ میں آیا کہ دولت اور طاقت یوں تو سب کچھ کر سکتی ہے لیکن عورت کی آبرو کو صرف مرد کی شرافت ہی بچا سکتی ہے۔ میں تمہاری ہی بات کو دوسرے لفظوں میں کہہ رہی ہوں۔ تم نے اپنی شرافت کے باعث طاقت کا بے جا استعمال نہیں کیا۔ اس شرافت کے حوالے سے میرے محلے میں میری نیک نامی واپس کرو۔"

روبی نے کہا۔ "ابھی نازو نے فیصلہ سنایا ہے کہ گاڈفادر حمزہ بیگ کی بیٹی مر چکی ہے۔ میں بھی یہ فیصلہ سناتی ہوں کہ گاڈفادر دادا جان کی پوتی بھی مر چکی ہے۔"

سنی نے چونک کر روبی کو دیکھا۔ وہ بولی۔ "میں اپنی مرضی سے کامران کے ساتھ یہاں آ گئی۔ نازو کو زبردستی اٹھا کر لایا گیا لیکن ہم دونوں کا نہایت شرمناک انجام ہونے والا تھا۔ تم دونوں نے ہماری عزت رکھ لی۔ ایک ٹھوکر نے ہمارے ذہن کو بیدار کر دیا ہے۔ ہمارے باپ دادا کے وسیع ذرائع اور بے جا اختیارات کے باعث صرف ملک کھوکھلا نہیں ہو رہا ہے، نوجوان نسل بھی کرپٹ ہو رہی ہے۔ دو بااختیار گاڈفادرز کی لڑائی میں ہمارے ساتھ آج زیادتی ہو جاتی تو ہم صرف جرائم کی طرف نہیں، جنسی جرائم کی طرف بھی مائل ہو جاتے۔ برائی کو فروغ دینے کا عمل ہمارے بزرگوں سے چلا آ رہا ہے۔ اسے آگے نہیں چلنا چاہیے۔ تم دونوں نے ہمارے خون کو گناہ کی آلودگی سے بچایا ہے تو پھر نئی نسل اور تمام نئے خون کو آلودگی سے پاک رکھنے کا عزم کرنا چاہیے۔"

نازو نے کہا۔ "ہو سکتا ہے، ہمیں زیادہ کامیابی نہ ہو لیکن آج دو کو بچایا گیا ہے۔ آئندہ ہم سب مل کر دس کو بچا سکیں گے۔"

سنی نے کہا۔ "میں حیران ہوں کہ تم دونوں ایسی انقلابی باتیں کر رہی ہو' جس کی توقع اونچے محلوں میں رہنے والیوں سے نہیں کی جا سکتی۔"

نازو نے اپنے گلے سے ہیروں کا نیکلس نوچ کر سینٹر ٹیبل پر پھینک دیا۔ روبی نے قیمتی موتی والی انگوٹھی اتار کر رکھ دی۔ نازو نے کہا۔ "یہ چیزیں ایسی دولت سے خریدی گئی ہیں جو کسی نہ کسی حوالے سے قوم کی امانت ہے۔"

روبی نے سنی سے کہا۔ "اب تو نہیں کہو گے ہم محلوں میں رہنے والیاں ہیں۔ جو بڑی بڑی بیگمات ہیں' وہ کہتی ہیں کہ اللہ دیتا ہے جبکہ وڈیرا شاہی اور نوکر شاہی دیتی ہے۔"

چٹکی بادشاہ نے کہا۔ "میں حیران ہوں کہ کیا دیکھ رہا ہوں اور کیا سن رہا ہوں۔ آخر تم دونوں کے ارادے کیا ہیں؟"

روبی نے کہا۔ "اس وقت ہم دو لاوارث لڑکیاں ہیں لیکن تعلیم یافتہ اور حوصلہ مند ہیں۔ اپنی صلاحیتوں سے رزق حلال حاصل کرنے کی کوشش کریں گی۔ مجھے جب تک کامیابی حاصل نہیں ہو گی تب تک میری ذمے داریاں میرا منگیتر پوری کرے گا۔"

سنی مسکرا کر بولا۔ "روبی! میں آج تم پر فخر کر رہا ہوں۔ میں صرف تمہیں ہی نہیں' نازو کو بھی سہارا دوں گا۔"

نازو نے کہا۔ "ہرگز نہیں۔ جب میرا گھر موجود ہے۔ میرا کمانے والا موجود ہے تو میں تم پر بوجھ نہیں بنوں گی۔"

"تمہارا کمانے والا کون ہے؟"

"ہے بھلا مانس' لیکن نام غنڈوں بادشوں جیسا ہے۔ بھلا چٹکی بادشاہ بھی کوئی نام ہے؟"

روبی اور سنی قہقہے لگانے لگے۔ چٹکی بادشاہ نے کہا۔ "اے یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ میں تمہارا کمانے والا کب سے بن گیا؟"

"جب سے ڈولی بارات کے بغیر اٹھا کر لائے ہو۔ مرد وہ ہے جو عورت کو نیک نامی دیتا ہے۔ بولو مرد ہو کہ نہیں؟"



وہ اپنے سینے پر ہاتھ مار کر بولا۔ "ایسا مرد ہوں کہ میرا نام سن کر دشمن کانپتے ہیں۔"

"ہم نے نیک ارادوں کی خاطر ہیرے موتی پھینک دیے۔ تم کیسے مرد ہو کہ گاڈفادر کے کارندے بن کر دشمن پیدا کرو گے اور دشمنوں میں کانپنے کی بیماریاں پیدا کرو گے۔ میں گاڈفادر سے باپ بیٹی کا تعلق توڑ رہی ہوں۔ تم مرد ہو تو گاڈفادر کے دھندوں سے توبہ کرو۔"

"ارے تم کیسی لڑکی ہو۔ زبردستی سر پر سوار ہو رہی ہو۔ یہ درست ہے کہ ہمیں رزق حلال حاصل کرنا چاہیے۔ جب میں روبی اور سنی کے دادا کے ناجائز احکام کی تعمیل سے انکار کروں گا تو وہ میرا جانی دشمن ہو جائے گا لیکن میں خطرات سے کھیلنے کا عادی ہوں۔ تعمیری مقاصد پر عمل کرنے کے دوران قربانیاں دینی پڑتی ہیں مگر تم مجھ پر کیوں قربان ہو رہی ہو؟"

سنی نے کہا۔ "اے بھائی! تم ابھی یہاں آتے وقت راستے میں کہہ رہے تھے بہت سوہنی کڑی ہے اور کہہ رہے تھے کہ............"

وہ سنی کے منہ پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "کیوں جھوٹ بول رہے ہو۔ تم کوئی قاعدے کی بات نہیں کر سکتے۔"

نازو نے کہا۔ "ہاتھ ہٹالو۔ سچ بولنے والوں کا منہ بند کیا جاتا ہے۔"

اس نے فوراً سنی کے منہ سے ہاتھ ہٹا لیا۔ سنی نے کہا۔ "یہ اوپر سے بدمعاش ہے۔ اندر سے شریف اور شرمیلا ہے۔ نازو! فکر نہ کرو۔ میں ایک قاضی کی زبان سے کہتا ہوں' اسے قبول ہے۔"

"سنی! کچھ سوچ سمجھ کر بولو۔ میں نے حمزہ بیگ سے وعدہ کیا ہے کہ شرائط پوری ہونے کے بعد اس کی بیٹی اسے واپس کر دی جائے گی۔"

نازو نے کہا۔ "میں تمہارے وعدے کے مطابق اس باپ کے پاس جاؤں گی جس کی بیٹی کہلانے سے انکار کر چکی ہوں پھر اپنی مرضی سے یہاں واپس آ جاؤں گی۔"

"یعنی تم چاہتی ہو کہ ہم بے موت مر جائیں؟"

"بے موت کیوں مریں گے؟"

"ایک گاڈفادر سے بغاوت کروں گا دوسرے گاڈفادر کی بیٹی کو شریک حیات بناؤں گا تو قدم قدم پر ہمارے لیے موت ہوگی۔ تمہارا باپ تمہیں بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

سنی نے کہا۔ "اب نازو جواب میں کہے گی کہ وہ تمہارے ساتھ جیئے گی اور تمہارے ساتھ مرے گی۔ میں کہوں گا کہ جان بوجھ کر موت کو دعوت دینا دانش مندی نہیں ہے۔ میرے مشورے پر عمل کرو گے تو محبت موت نہیں زندگی دے گی۔"

"جناب کا مشورہ کیا ہے؟"

"یہ کہ کچھ عرصے تک دور ہی دور سے عشق کرو۔ شادی نہ کرو۔ ٹھنڈی آہیں بھرتے رہو۔ میری بات کو مذاق نہ سمجھنا۔ کیا ضروری ہے کہ نازو اپنے باپ کی بیٹی کہلانے سے انکار کر دے۔ ابھی جس طرح گاڑی چل رہی ہے چلنے دو۔ تم ہمارے گاڈفادر دادا جان کے بہت سے خفیہ معاملات کو جانتے ہو۔ نازو بھی اپنے باپ کے بہتیرے معاملات میں دلچسپی لے کر بہت کچھ معلوم کر سکتی ہے۔"

"تم چاہتے ہو کہ ٹھوس ثبوت حاصل کر کے دونوں گاڈفادرز کو قانونی شکنجے میں لیا جائے گا؟"

"یہ نادانی ہوگی۔ ہم اپنے دادا جان کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ وہ کبھی قانونی شکنجے میں نہیں آئیں گے۔ میں چاہتا ہوں ہم سب اپنے انکل صداقت علی کا طریقہ کار اختیار کریں۔"

"ان کا طریقہ کار کیا ہے؟"

"وہ کسی گاڈفادر کے خلاف نہ کبھی اعلیٰ حکام کے پاس جاتے ہیں اور نہ ہی عدالتی کارروائی کرتے ہیں جبکہ ان کے پاس مکمل ثبوت اور گواہ بھی ہوتے ہیں۔ وہ سرکاری احکامات کے مطابق انکوائری مکمل کر کے متعلقہ حکام کو دے دیتے ہیں۔ اس کے بعد غیر سرکاری اقدامات کرتے ہیں۔ انہیں اچھی طرح علم ہے کہ جتنے بڑے مگرمچھ ہیں' ان کے خلاف نہ انتظامیہ کچھ کر سکے گی اور نہ کبھی عدالتی کارروائی ہو سکے گی۔ اگر ہم بھی خاموشی سے دونوں گاڈفادرز کے اہم معاملات اور اہم راز معلوم کرتے رہیں اور ان کی



نظروں میں آئے بغیر ان کی مجرمانہ کارروائیوں کو ناکام بناتے رہیں تو ہماری یہ فرض شناسی ہمارے ضمیر کو مطمئن کرتی رہے گی۔"

روبی نے کہا۔ "واقعی انکل صداقت کا طریقہ کار ایسا ہوتا ہے کہ ہمارے دادا جان کو کتنے ہی معاملات میں ناکامی ہوتی ہے لیکن وہ اوپر والوں پر اپنا دباؤ اور اثر و رسوخ رکھنے کے باوجود انکل کے خلاف کارروائی کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ وہ یہ ثابت نہیں کر سکتے کہ ان کے داماد ہی ان کے مخالف ہیں۔"

چٹکی بادشاہ نے کہا۔ "آئیڈیا بہت اچھا ہے لیکن ایسا کرنے سے پہلے دو اہم باتوں پر عمل کرنا ہوگا۔ ایک تو یہ کہ ہم تمہارے انکل صداقت سے خفیہ طور پر ملاقات کریں گے اور ان کے تجربات سے فائدہ اٹھانے کے لیے ان سے گائیڈ لائن حاصل کریں گے۔ پھر ہم اپنی ایک مضبوط ٹیم بنا کر شر کے خلاف خیر کے راستے پر قدم بڑھائیں گے۔"

روبی نے کہا۔ "بے شک یہ ضروری ہے کہ ہم اتنا بڑا قدم اٹھانے سے پہلے انکل سے ملاقات کریں۔ تم کیا کہتی ہو نازو؟"

نازو نے کہا۔ "میں اس ٹیم میں دو شرائط پر رہوں گی۔"

چٹکی بادشاہ نے پوچھا۔ "وہ شرائط کیا ہیں؟"

"پہلی شرط یہ ہے کہ اپنا نام تبدیل کرو۔ تمہارے ماں باپ نے تمہاری پیدائش پر ضرور کوئی شریفانہ نام رکھا ہوگا۔"

"میرا پیدائشی نام کمال احمد ہے لیکن چنگیز خان بننے کے لیے........."

وہ بات کاٹ کر بولی۔ "ہم چنگیز خان کے نہیں' علامہ اقبال اور قائداعظم کے راستوں پر چلنے والے ہیں۔"

"چلو مانتا ہوں۔ میں چٹکی بجا کر کوئی سا بھی کام کر جاتا ہوں۔ لہٰذا چٹکی بجاؤں گا لیکن چٹکی بادشاہ نہیں کہلاؤں گا۔ اب دوسری شرط بیان کرو۔"

وہ صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر بولی۔ "میری دوسری شرط حجام پوری کرے گا۔ یہ جو تم نے دو بڑے بڑے پنکھوں جیسی مونچھیں رکھی ہیں انہیں اتنا کتر دیا جائے کہ کترنے کے لیے پھر کچھ نہ رہے۔"

اس نے پریشان ہو کر فوراً ہی اپنی مونچھوں پر دونوں ہاتھ رکھ لیے۔ روبی اور سنی یہ شرط سنتے ہی دل کھول کر قہقہے لگانے لگے۔

سچل اسپتال کے بستر پر سر جھکائے گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اسے آہٹ سنائی دی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو آنکھیں روشن ہوگئیں۔ وہ خود سراپا پھول تھی۔ ہاتھوں میں گلدستہ اٹھائے دروازے پر کھڑی تھی۔ نظریں ملتے ہی مسکراتی ہوئی کمرے کے اندر آئی پھر قریب آکر اس نے سچل کو پھول پیش کیے۔ وہ پھول لیتے ہوئے بولا۔ "تھینک یو' اگرچہ تم سن نہیں سکتی ہو لیکن میرا مسرت بھرا شکریہ تمہارے دل کی دھڑکنیں سن رہی ہوں گی۔"

وہ پھول دینے کے بعد پلنگ کے پائنتی آئی۔ وہاں ڈاکٹر کی ڈیلی میڈیکل رپورٹ آویزاں رہتی تھی۔ اگر اس کی زبان بولنے کے قابل ہوتی تو آتے ہی سچل سے ہم کلام ہو جاتی۔ اس سے خیریت معلوم کرتی۔ اب وہ سچل سے نہیں اسپتال کی میڈیکل رپورٹ سے خیریت معلوم کر رہی تھی۔ وہ اسے مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔ خوش ہو رہا تھا کہ کوئی اس کی فکر کرنے والی اور اس کا خیال رکھنے والی اس کی زندگی میں آگئی ہے۔

ایک نرس دواؤں کی ٹرے لے کر آئی۔ اس نے مسکرا کر شانی کو دیکھا پھر پلنگ کے سرہانے والی میز پر ٹرے رکھ کر سچل سے بولی "میں نے کہا تھا نا کہ تمام رات جاگ کر ڈیوٹی دینے والی سو رہی ہوگی پھر اپنی ڈیوٹی پر آجائے گی لیکن یہ تو نائٹ ڈیوٹی شروع ہونے سے پہلے ہی آگئی ہیں۔"

"سسٹر! میں اسے دیکھ کر اپنوں اور غیروں سے کھائے زخم بھول جاتا ہوں۔"

"میں تو کہتی ہوں اب آپ کو دواؤں کی ضرورت نہیں رہی۔ چہرے پر ایسی رونق آگئی ہے کہ ڈاکٹر صاحب دیکھیں گے تو اسپتال سے چھٹی دے دیں گے۔"

وہ ایک انجکشن تیار کرنے لگی۔ نرس کی زبان سے چھٹی کی بات سن کر وہ اداس ہوگیا۔ اسپتال سے چھٹی ملنے کا مطلب یہ ہوتا کہ وہ جیل جاتا۔ یہاں تو شانی پھول لے کر آتی تھی۔ جیل میں شاید پتھر مارنے بھی نہ آئے۔

نرس نے اسے انجکشن لگایا کھانے کے لیے گولیاں اور پینے کے لیے دوا دی پھر



وش یو گڈ لک کہہ کر مسکراتی ہوئی چلی گئی۔

شانی نے لکھ کر پوچھا۔ "یہ بڑی ہنس کر باتیں کر رہی تھی اور مسکرا کر گئی ہے۔ کوئی خاص بات ہے کیا؟"

سچل نے لکھا "تم پچھلی رات میری خاطر جاگتی رہیں اور ڈاکٹروں اور نرسوں کو جگائے رکھا۔ اس سے ظاہر ہوگیا کہ تمہیں مریض کی محبت ستا رہی تھی اور تم دوسروں کو ستا رہی تھیں۔ ابھی نرس کہہ رہی تھی کہ مجھے دواؤں کی ضرورت نہیں رہی' میری دوا آگئی ہے۔"

وہ پڑھ کر مسکرانے لگی پھر اس نے لکھا "کیا اچھی طرح کھاتے پیتے ہو؟"

"تم سے ملنے اور تمہیں جی بھر کے دیکھتے رہنے کے لیے زندہ رہنا ضروری ہے اور زندہ رہنے کے لیے کھانا ضروری ہے اس لیے خوب کھاتا ہوں۔"

وہ ہنسنے لگی پھر اس نے لکھا "میرے نانا جان اور پاپا کی پہنچ بہت دور تک ہے۔ وہ تمہارا کیس ختم کرا دیں گے۔"

"کیا تم مجھے مجرم نہیں سمجھتی ہو؟"

"اگر سمجھ لوں تو کیا فرق پڑے گا؟ میرے پاپا اور میرے ایک کزن سنی کے سوا میرے خاندان کا ہر فرد مجرم ہے۔ اپنے خون کے رشتے اچھے ہوں یا برے' ان سے محبت نہ بھی ہو تب بھی اپنائیت ہوتی ہے۔"

"لیکن مجھ سے خون کا کوئی رشتہ نہیں ہے اور میں تمہارے خاندان کا فرد بھی نہیں ہوں۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ میں نے سونا اسمگل کیا ہے تو کیا مجھ سے اپنائیت باقی رہے گی؟"

"اس شرط پر کہ تم آئندہ کوئی جرم نہیں کرو گے اور میرے پاپا کی طرح قانون کی بالادستی قائم رکھو گے۔"

"میں نے نہ پہلے کوئی جرم کیا ہے اور نہ آئندہ کروں گا تمہارے پاپا کے نقش قدم پر چلوں گا لیکن بعض اوقات ناکردہ جرم کی بھی سزا بھگتنی پڑتی ہے۔ تقدیر کو منظور نہ ہو تو بڑی سے بڑی سفارش بھی کام نہیں آتی۔ اگر میں بدقسمتی سے جیل چلا جاؤں تو کیا کبھی

تمہارے صورت دیکھ سکوں گا؟“

”ایسی باتیں نہ کرو، تم جیل نہیں جاؤ گے۔“

”تم میرے مقدر سے نہیں لڑ سکو گی۔“

”میری لڑائی نہ کسی نے دیکھی ہے، نہ کوئی دیکھ سکے گا۔ اگر تم جیل چلے بھی گئے تو میں وہاں تم سے ملنے نہیں آؤں گی۔ ملاقات کے لیے تمہیں وہاں سے نکال لاؤں گی۔“

”اپنے نانا اور اپنے بابا کے بل پر ایسا کہہ رہی ہو؟“

”جب بزرگوں کی سفارش اور ذرائع ناکام ہو جائیں گے تو اپنی جنگ میں خود لڑوں گی۔“

سچل نے اسے بڑے پیار سے دیکھا پھر لکھا ”تم ایک بے زبان، کمزور سی لڑکی ہو۔ تم میرے لیے بڑے جذبوں سے لڑو گی مگر دیواروں سے سر ٹکرا کر رہ جاؤ گی۔“

وہ پڑھ کر مسکرانے لگی۔ اس کی مسکراہٹ سے سنجیدگی اور ارادوں کی پختگی جھلک رہی تھی۔ اس نے لکھا ”چھوڑو اس بحث کو۔ جب ایسا وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا۔ یہ بتاؤ اپنی ماں جی سے کب ملا رہے ہو؟“

سچل سوچ میں پڑ گیا۔ آج ماں اس سے ملنے آئی تھی لیکن بابا سائیں اور پیر عظمت اللہ شاہ سلطانی کے منفی فیصلے سن کر بیٹے کی سلامتی کی خاطر دل پر ایک بوجھ لے کر چلی گئی تھی۔ ابھی شام کو پھر ملنے آسکتی تھی مگر نہیں آئی تھی۔ پتا نہیں اس کے دل پر کیا گزر رہی ہوگی۔ ایک ماں دنیا کے سارے دکھ جھیل لیتی ہے مگر اولاد کا دکھ آخری ہوتا ہے۔ بیٹے کے بازو میں گولی لگی تو اس کی آدھی جان نکل گئی تھی۔ آئندہ جیل نہ جانے پر بیٹے کو قتل کی دھمکی دی گئی تھی۔ ایسی دھمکی سن کر کیا وہ گھر میں جا کر روٹی کھا رہی ہوگی؟ کیا وہ راتوں کو سو سکے گی یا اسے زندہ دیکھنے کے لیے جاگتے جاگتے مر جائے گی؟

شانی نے اس کے شانے کو جھنجوڑ کر اپنی تحریر دکھائی۔ اس نے پوچھا تھا ”کس سوچ میں گم ہو گئے ہو۔ کیا اپنی کوئی پریشانی مجھ سے چھپا رہے ہو؟“

اس نے لکھا ”نہیں کوئی پریشانی نہیں ہے۔ میں سوچ رہا تھا ماں جی صبح آئی تھیں، شام کو بھی آنا چاہیے تھا۔ پتا نہیں اب تک کیوں نہیں آئیں؟“



شانی نے لکھا ”تمہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ میں نے ابتدائی تعلیم لندن میں حاصل کی۔ اس کے بعد اسکاٹ لینڈ یارڈ میں تربیت حاصل کرتی رہی۔ میں انسان کا چہرہ اور اس کی آنکھوں پڑھ لیتی ہوں۔ مجھے سگنل کوڈز اور تحریر شناسی میں مہارت حاصل ہے۔ ابھی جو تم نے ماں جی کے نہ آنے کے سلسلے میں لکھا ہے تو اس تحریر میں حروف کے دائرے اور خطوط بگڑ گئے ہیں۔ تم اپنی پہلی تحریروں سے خود موازنہ کر کے دیکھ لو۔“

اس نے اپنی تحریروں کا موازنہ کیا پھر لکھا ”ہاں۔ میری خوش خطی میں فرق کچھ پیدا ہو گیا ہے۔ یہ میرے لیے حیران کن اطلاع ہے کہ تم نے لندن اور اسکاٹ لینڈ یارڈ میں تعلیم و تربیت حاصل کی ہے۔ بخدا تم بہت ہی باکمال ہو۔ کیا مجھے بتاؤ گی کہ تم نے میری تحریر سے میری پریشانی کو کیسے سمجھا ہے؟“

اس نے لکھا ”انگریزی زبان میں A.E.I.O.U کے بغیر کوئی لفظ نہیں بنتا ہے۔ ان پانچ حروف کو VOWELS کہتے ہیں۔ ان پانچوں میں سے کوئی نہ کوئی حرف ضرور کسی لفظ میں موجود ہوگا۔ VOWEL کی اہمیت کے پیش نظر اسکاٹ لینڈ یارڈ کے ماہرین تحریر نے ہمیں یہ سمجھایا ہے کہ کوئی لکھتے وقت ان پانچ حروف میں سے کوئی بھی حرف بگڑے ہوئے انداز میں لکھ جائے تو اس کے اندر کی نفسیاتی تبدیلی کا پتا چل جاتا ہے۔ اس کی وضاحت یوں ہے کہ A سے مراد ہے۔ ANGRY (ناراض) E سے LOOSING EASINESS (سکون کا فقدان)، I سے INTERNAL DISTURBANCE (اندرونی انتشار)، O سے OVER PRESSURE (بے حد دباؤ میں) اور U سے ULTIMATELY WORNG (فیصلہ کن غلطی پر)

”اس وضاحت کی روشنی میں اب اپنی تحریر پر غور کرو۔ تم نے جہاں کیپٹل حرف I لکھا ہے وہ ٹیڑھا یا ترچھا ہو گیا ہے اور اسمال i لکھا ہے تو اس پر نقطہ لگانا بھول گئے ہو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم انٹرنل ڈسٹربنس یعنی اندرونی انتشار میں مبتلا ہو۔ تم کسی بھی ماہر تحریر سے پوچھ لو۔ وہ یہی نتیجہ اخذ کرے گا۔ میں نے جو لکھا ہے، وہ پتھر کی لکیر ہے۔“

سچل نے لکھا ”ونڈر فل، میں سوچ بھی ہیں سکتا تھا کہ تم اتنی صلاحیتوں کی حامل

ہو اور میں کیا' جو بھی تمہیں دیکھتا ہو گا وہ تمہیں صرف گونگی بہری سمجھتا ہو گا۔"

"میری تعریفیں کرکے اپنی پریشانی نہ چھپاؤ' ٹالنے کا مطلب یہ ہو گا کہ مجھے اپنا نہیں سمجھتے ہو۔"

"تم اپنوں سے بھی زیادہ اپنی ہو۔ دراصل بات یہ ہے کہ..........." وہ تمام حقائق لکھنے لگا کہ باپ اسے اپنی طرح چور دروازوں سے دولت کمانے کے گر سکھانے کے لیے جیل بھیج رہا ہے۔ اس کے نانا بھی اس شرط پر اپنی نواسی سے اس کی شادی کریں گے جب وہ اپنے بابا سائیں کی گدی سنبھال لے گا ورنہ اسے اس لیے گولی مار دی جائے گی کہ اس نے تھانے میں گاڈفادر کو گولی مارنے کا ارادہ کیا تھا پھر شانی کے پاپا آئے تھے۔ انہیں یہ باتیں معلوم ہوئیں تو انہوں نے مشورہ دیا کہ سچل لوہے کو کاٹنے کے لیے لوہا بن جائے۔ دشمنوں کو خوش فہمی میں رکھنے کے لیے جیل جائے لیکن ماں کی تعلیم کے مطابق رزق حلال پر قائم رہے۔ اس نے پہلے بیس کروڑ روپے قومی خزانے میں جمع کرائے تھے۔ ایک دن باپ کی گدی سنبھال کر قوم سے لوٹے ہوئے کروڑوں اور اربوں روپے قومی خزانے میں پہنچا دے گا لہٰذا وہ شانی کے پاپا کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے ضرور جیل جائے گا۔ اس طرح ماں کے دل میں بھی یہ خوف نہیں رہے گا کہ گاڈفادر کے کارندے اسے گولی مار دیں گے۔

شانی نے وہ سب کچھ پڑھنے کے بعد لکھا "پاپا نے تمہیں فولاد بننے کا مشورہ دیا ہے۔ تمہیں اس مشورے پر ضرور عمل کرنا چاہیے۔ جب تک تم جیل میں مجرموں کے ساتھ رہ کر برائی کی جڑوں کو اور ان کے اسباب و ذرائع کو نہیں سمجھو گے' تب تک اچھائی کا بول بالا نہیں کرسکو گے۔"

ایسے ہی وقت نورن سہاگی کے محلے سے کچھ لوگ آئے۔ وہ سب دروازے کے باہر کھڑے رہے۔ ایک معمر شخص اندر آیا۔ سچل نے ان سب کے سنجیدہ اور اداس چہروں کو دیکھ کر پوچھا "ماں جی! کہاں ہیں؟"

معمر شخص نے قریب آکر تھرتھراتے ہوئے ہاتھ سے ایک تہہ کیا ہوا کاغذ اسے دیا۔ سچل نے اسے فوراً لے کر کھولا۔ وہ اس کی ماں کا خط تھا۔ اس نے لکھا تھا "میرے لال!



جگ جگ جیو۔ میں اسپتال میں تم سے مل کر آئی تو گھر پہنچنے تک تمام راستے انگاروں پر چلتی رہی۔ سوچتی رہی کہ میں نے تمہیں اس گاڈفادر اور تمہارے باپ کے رحم و کرم پر چھوڑ کر اچھا کیا ہے یا نہیں؟ میں اٹھائیس برسوں سے تمہیں اچھا بنانے کی جدوجہد کرتی رہی' آج ہار گئی۔ ایک اچھے کو بروں کے حوالے کرکے آگئی۔ میں نے ایسا کیوں کیا؟ میں نے اپنی ممتا کو ٹٹول کر دیکھا تو پتا چلا کہ سب سے کمزور جذبہ ممتا کا ہے۔ میں نے تمہیں جیل کی صعوبتوں میں دن رات گزارنے کے لیے پیدا نہیں کیا ہے۔ میں نے تمہارا زخمی بازو دیکھا ہے۔ میں نے تمہیں گاڈفادر کی گولیاں کھاکر مرنے کے لیے اٹھائیس برس کا گبھرو جوان نہیں بنایا ہے۔ جب میں نے دونوں طرف سے دھمکیاں سنیں تو میری آنکھوں نے تمہارے بدن پر کفن دیکھا اور میرا بڑھاپا تھرا کر رہ گیا۔ میں ہیرے جیسے بیٹے کو کیچڑ میں پھینک آئی کہ چلو کیچڑ میں ہی سہی' زندہ تو رہے گا۔

"گھر پہنچ کر ذرا دم لیا تو اس گھر کی چار دیواری نے یاد دلایا کہ میں نے رزق حلال کھانے کے لیے اور اپنے بیٹے کی اچھی تربیت کرنے کے جذبے کے تحت اپنے شوہر اور حویلی کی شان و شوکت کو چھوڑا تھا۔ میں عبادت کے طور پر بیٹے کو خدا اور رسولؐ کی ہدایات پر عمل کراتی رہی لیکن اٹھائیس برس کی عبادت کو آج مٹی میں ملا دیا ہے۔ میں شر کے سامنے کیوں جھک گئی؟ کیا قربانی دینے کا وقت آئے تو ایمان کے راستے سے ہٹ جانا چاہیے؟ یہ تو ایک ماں کی کمزوری ہے جو اولاد کو بے ایمان بنا رہی ہے۔

"جو ماں بچے کو دودھ پلاتی ہے' وہ اسے زہر پینے کے لیے سانپوں کے درمیان نہیں چھوڑ سکتی۔ یہ بات میری سمجھ میں آنے لگی کہ میں نے تمہیں زندہ سلامت رکھنے کے لیے ایسا کیا ہے۔ یعنی ایسی زندگی کے لیے چھوڑ آئی ہوں جو سانپوں کے زہر سے تمہیں ملا کرے گی۔

"جب میں نے سمجھنے کی کوشش کی تو یہ سمجھ میں آیا کہ میں تمہاری لاش نہیں دیکھ سکتی تھی۔ یہ ماں اتنی کمزور ہے کہ تمہارے بازو کا زخم دیکھ کر نیم مُردہ سی ہوگئی۔ خدا نہ کرے وہ تمہیں جان سے مار ڈالیں گے تو کن آنکھوں سے میں تمہارا جنازہ دیکھوں گی۔"

"کمزور تم نہیں' میں ہوں۔ تم اپنے بابا سائیں کے دباؤ میں نہیں آئے۔ تم حق

پرستی میں گاڈ فادر سے بھی ٹکرا گئے۔ اگر میں اب بھی اپنی آنکھیں بند کرلوں' تمہاری لاش نہ دیکھنے کے لیے اپنی آنکھیں پھوڑ لوں یا اپنی کمزور آنکھوں کو ہمیشہ کے لیے سلا دوں تو تم مردانہ وار شیطانی قوتوں کو منہ توڑ جواب دے سکتے ہو۔ خدانخواستہ موت آئی تو مر جاؤ گے لیکن مجھ جیسی کمزور ماں یہ دیکھنے کے لیے نہیں رہے گی۔

"بیٹے! میں رہوں گی تو تمہارا جہاد سرد خانے میں چلا جائے گا اور نہیں رہوں گی تو تم دونوں دشمنوں کے لیے دو دھاری تلوار بن کر رہو گے۔

"معاف کرنا بیٹے! میرا یہ فیصلہ تمہارے پاس پہنچنے تک دیر ہو چکی ہو گی اور میں دور جا چکی ہوں مگر میری دعائیں اور نیک تمنائیں تمہارے ساتھ رہیں گی۔ خدا حافظ بیٹے خدا حافظ........"

خط کے اختتام پر سچل نے تڑپ کر پوچھا "یہ کیا ہے؟ نہیں یہ ہو نہیں سکتا۔"

اس نے معمر شخص کو جھنجوڑ کر پوچھا "بابے دین محمد! یہ......... یہ میری ماں جی نے نہیں لکھا ہے نا؟ یہ جھوٹ ہے نا؟ بولو بابے؟ چپ کیوں ہو' بولو؟"

شانی نے سچل کے ہاتھ سے وہ خط اپنی طرف کھینچ لیا۔ خط سندھی زبان میں لکھا ہوا تھا۔ وہ سندھی' اردو' پنجابی اور پشتو وغیرہ نہیں جانتی تھی۔ اس نے صرف انگریزی اور فرانسیسی زبان سیکھی تھی۔ وہ سمجھنا چاہتی تھی کہ اس کاغذ پر کیا لکھا ہے جسے پڑھ کر سچل جنونی انداز میں کچھ کہہ رہا تھا۔

بابے نے روتے ہوئے کہا "بیٹے! حوصلے اور صبر سے سنو۔ تمہاری ماں جی اب ہماری دنیا میں نہیں رہی۔"

وہ پھر اسے جھنجوڑ کر بولا "یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ میرے پاس آئی تھی۔ زندہ آئی تھی اور تم کہہ رہے ہو' وہ زندہ نہیں ہے۔"

دروازے پر کچھ لوگ تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا "پتا نہیں ماں جی نے ایسا کیوں کیا؟ چھت کی بلی سے رسی باندھ کر گلے میں پھندا ڈال لیا۔"

"نہیں........" سچل نے چیخ کر کہا۔ تڑپ کر پلنگ سے اتر کر "نہیں' نہیں" کہتا ہوا دروازے کی طرف گیا۔ وہاں کھڑے ہوئے محلے کے لوگوں نے اسے پکڑ کر کہا "رک



جاؤ۔ ہم ٹیکسی لائے ہیں۔ آرام سے چلو' تم زخمی ہو۔"

شانی نے ایک ایک کو پکڑ کر اشاروں سے پوچھا "اسے کیا ہو گیا ہے؟"

"اس کی ماں مر گئی ہے۔"

ایک نے کہا۔ دوسرے نے بھی اسے یہی بتایا۔ تیسرے نے پوچھا "کیا تم بہری ہو۔ اتنے لوگ کہہ رہے ہیں اور تمہیں سنائی نہیں دیتا۔"

دروازے کے باہر دو پولیس والوں نے آکر گرجتے ہوئے کہا۔

"اسپتال کو مچھلی بازار کیوں بنا رکھا ہے؟ چلو بھاگو یہاں سے۔"

ایک جوان نے کہا "سچل بھائی کی ماں فوت ہو گئی ہے۔ ہم اسے تسلیاں دے کر لے جا رہے ہیں۔"

دونوں سپاہیوں نے اپنے شانوں پر سے رائفلیں اتاریں۔ ایک نے کہا "یہ تمہارے باپ کا گھر نہیں ہے۔ پولیس اسپتال ہے۔ یہ ہماری کسٹڈی میں ہے۔ یہاں سے گھر نہیں' جیل جائے گا۔"

سچل نے غصے سے سپاہی کو دیکھا۔ ان کی رائفلوں کے رخ اسی کی طرف تھے۔ شانی فوراً ڈھال بن کر اس کے سامنے آگئی۔ ڈائریکٹر جنرل کی بیٹی کو دیکھتے ہی دونوں سپاہیوں نے جلدی سے رائفلوں کو شانوں سے لٹکایا پھر پیشانی تک ہاتھ لے جا کر کہا۔

"سلام بی بی جی۔"

شانی نے کاغذ پر لکھ کر پوچھا "بات کیا ہے؟ تم کہاں جانا چاہتے ہو؟ اتنے جنونی کیوں ہو رہے ہو؟"

اس نے شانی کو ایسے دیکھا جیسے اب تک اس کی موجودگی کو بھولا ہوا تھا پھر اس نے کاغذ قلم لے کر لکھا "میری ماں جی نے خودکشی کر لی ہے۔"

شانی کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر سچل کو ہمدردی سے دیکھا۔ اس نے لکھا "پلیز' یہ قانون کی دیوار فوراً ہٹاؤ۔ مجھے اپنی ماں جی کے پاس جانے دو۔"

شانی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا پھر اس کے ساتھ کمرے سے باہر آئی۔ دونوں سپاہی

ایک طرف ہٹ گئے۔ سامنے سے انسپکٹر کہتا ہوا آرہا تھا "یہاں کیا تماشا ہو رہا ہے۔ چلو یہاں سے نکلو۔ یہ اسپتال ہے' میلہ نہ لگاؤ۔"

وہ سچل کا ہاتھ پکڑ کر کاریڈور سے گزر رہی تھی۔ لوگوں نے ان کے جانے کے لیے دو طرف تقسیم ہو کر راستہ دیا۔ سامنے انسپکٹر شانی کو دیکھتے ہی ٹھٹک گیا۔ ایک طرف ہو کر بولا "بی بی جی! آپ قیدی کو کہاں.........."

اسے یاد آگیا کہ وہ سنتی نہیں ہے۔ ایک سپاہی نے آکر کہا۔ "جناب عالی! قیدی کی ماں مرگئی ہے۔ یہ اس کے گھر لے جارہی ہے۔"

انسپکٹر نے کہا "کیا مصیبت ہے۔ ہم اسے روک نہیں سکتے اور قیدی بھاگ جائے گا تو ہماری وردی اتر جائے گی۔ جاؤ ایک گاڑی میں ان کا پیچھا کرو۔ میں ضروری فون کرکے تم لوگوں سے وائرلیس کے ذریعے رابطہ کروں گا۔"

وہ تیزی سے چلتا ہوا اسپتال کے کاؤنٹر کے پاس آیا پھر ایک فون کا ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کیے۔ پیر شاہ سلطانی سے رابطہ ہوتے ہی اس نے کہا "میں انسپکٹر حشمت بول رہا ہوں۔ زخمی سچل جو اسپتال میں تھا اس کی ماں مرگئی ہے۔ آپ کی نواسی ضابطے کی کارروائی کے بغیر اسے لے گئی ہے۔ محترم پیر صاحب' وہ بھاگ جائے گا تو ہماری تو چھٹی ہو جائے گی۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم قیدی کی ذمے داری لیتے ہیں۔ ویسے احتیاطاً ڈائریکٹر جنرل کو اطلاع دے دو۔ وہ اپنی بیٹی کی خاطر ضرور اس قیدی کی واپسی کی ذمے داری قبول کرے گا۔ اس کے بعد سمجھ لینا کہ ہماری ذمے داری ختم ہو چکی ہے۔ اس کا موبائل فون نمبر نوٹ کرو۔"

انسپکٹر نے نمبر نوٹ کیے پھر رابطہ کیا۔ صداقت علی کی آواز سن کر اس نے سچل اور شانی کے سلسلے میں وہی رپورٹ دی۔ صداقت نے بڑے دکھ سے کہا "مجھے اس نیک خاتون کی موت کا افسوس ہے۔ سچل کا مکان کہاں ہے۔ وہاں کسی سے دریافت کرو اور مجھے بتاؤ۔ کوئی پولیس والا وہاں نہ جائے۔ میں غیر سرکاری طور پر جاؤں گا۔"

اس نے محلے والوں سے مکان کا پتا پوچھا پھر صداقت علی کو بتا دیا' اس نے کہا



"ٹھیک ہے۔ تم اطمینان رکھو۔ وہ ماں کی آخری رسومات ادا کر کے اسپتال واپس پہنچ جائے گا۔"

ادھر سے فون بند ہوگیا۔ انسپکٹر نے ریسیور رکھتے ہوئے اطمینان کی سانس لی پھر اسپتال کے باہر آیا۔ احاطے میں پولیس کی دو گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ جن دو سپاہیوں کو اس نے شانی اور سچل کے پیچھے جانے کا حکم دیا تھا وہ دونوں ایک پولیس کار کا پہیہ بدل رہے تھے۔ انسپکٹر نے بے بسی سے انہیں دیکھا۔ وہ ان پر اپنی افسری نہیں جھاڑ سکتا تھا۔ خوب سمجھتا تھا کہ اکثر ایسے موقعوں پر قانون کے محافظ پنکچر ہو جایا کرتے ہیں۔

★------------★------------★

بیگم ریحانہ برکت' برکت شاہ سلطانی' بیگم سلمیٰ رحمت' رحمت شاہ سلطانی اور جمشید کو صبح ہونے سے پہلے یہ خوشخبری سنا دی گئی تھی کہ روبی لاہور میں خیریت سے ہے۔ پیر عظمت اللہ شاہ سلطانی کے خاص ماتحت دھنی بخش نے وعدہ کیا تھا کہ کامران نامی اجنبی روبی کو جہاں بھی لے گیا ہے' وہاں روبی کے دادا جان کے کارندے پہنچ جائیں گے۔

پچھلی رات روبی نے اپنے والدین سے کامران کے سلسلے میں جو بات کی تھی اور گاڈ فادر حمزہ بیگ کا حوالہ دیا تھا' اس سے یہ واضح ہوگیا تھا کہ اس مخالف گاڈ فادر نے پہلے ماں باپ کی فیکٹری مفت میں حاصل کرلی۔ بیٹے جمشید کی ہنڈا ایکارڈ ہتھیالی اب وہ روبی کے ذریعے ان کے پورے خاندان کو رسوا کرنا چاہتا ہے۔

وہ سب پیر عظمت اللہ سلطانی سے منہ موڑ کر ان کی کوٹھی چھوڑ کر اپنی ذاتی کوٹھیوں میں آباد ہونے آئے تھے۔ اس وقت وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ایک گاڈ فادر کی محبت بھری پناہ گاہ سے نکلیں گے تو دوسرا گاڈ فادر انہیں ایک ہی رات میں کنگال بنانے میں کامیاب ہوتا رہے گا۔

صرف اتنا ہی نہیں' اس خاندان کی ایک جوان بیٹی کی آبرو کو تماشا بنا کر اتنے اونچی اسٹیٹس کی فیملی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑے گا۔ اس فکر و پریشانی میں وہ رات بھر جاگتے رہے۔ وہ پیر شاہ سلطانی کی کوٹھی کے سامنے پہنچے تھے۔ برکت اور رحمت اپنے ابا حضور سے معافی مانگنا چاہتے تھے۔ سب سے بڑی مغرور بہو ان کے قدموں میں گر کر

التجا کرنی چاہتی تھی کہ کسی طرح روبی کی عزت بچائی جائے لیکن کوٹھی کے گارڈز نے انہیں احاطے میں بھی قدم رکھنے کی اجازت نہیں دی تھی کیونکہ وہ جب تک کوٹھی میں رہا کرتے تھے، اپنے ابا حضور کے خون کے رشتے تھے۔ ان سے منہ موڑنے کے بعد اب وہ گاڈ فادر کی کوٹھی تھی۔ وہاں کوئی ان کی اجازت کے بغیر قدم نہیں رکھ سکتا تھا۔

پھر یہ کہ وہ رات کو سوتے وقت تمام ٹیلی فون بند رکھتے تھے۔ کسی سے صبح تک نہ ملاقات کرتے تھے، نہ گفتگو۔ وہ گہری نیند سونے کے عادی تھے۔ بڑے بیٹے برکت شاہ سلطانی نے ان کے خاص ماتحت دھنی بخش کو اپنا اہم مسئلہ بتایا تھا پھر دھنی بخش نے اپنے وعدے کے مطابق دو گھنٹے کے اندر انہیں اطمینان دلایا کہ روبی خیریت سے ہے اور ان سے فون پر رابطہ کرنے والی ہے۔

انہیں اطمینان تو ہوا لیکن وہ روبی سے سننا چاہتے تھے کہ اس نے دوسرے گاڈ فادر حمزہ بیگ کے فراڈ کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے یا نہیں؟ ایسا نہ ہو کہ وہ نادان لڑکی پھر اس کے فریب میں آجائے۔ برکت نے صبح پانچ بجے پھر دھنی بخش کو فون پر مخاطب کیا۔ اس سے کہا "روبی نے ابھی تک ہم سے رابطہ نہیں کیا ہے۔ کہیں تم ہمیں جھوٹی تسلیاں تو نہیں دے رہے ہو؟"

"آپ سب میرے آقا کے عزیز از جان ہیں۔ آقا سے علیحدگی کے باوجود آپ میرے لیے محترم ہیں۔ مجھے لاہور سے مس روبی کی خیریت کی اطلاع ملی تھی جو میں نے آپ تک پہنچادی۔"

"میں مانتا ہوں تم نے جھوٹی تسلیاں نہیں دیں مگر تمہیں اطلاع دینے والے تو جھوٹ بول سکتے ہیں۔"

"جناب! سنی بابا تو کبھی جھوٹ نہیں بولتے۔"

"یہ سنی بیچ میں کہاں سے آگیا؟"

"جناب! ہم سے پہلے سنی بابا نے مس روبی کا پتا ٹھکانا معلوم کرلیا تھا۔ اگر سنی بابا نہ ہوتے اور ہم مس روبی کو تلاش کرنے میں ذرا بھی دیر کرتے تو آپ کے خاندان کی عزت خاک میں مل جاتی۔ یہ کریڈٹ سنی بابا کا ہے۔ انہوں نے مس روبی کو حمزہ بیگ کے شیطانی



پنجوں سے رہائی دلائی ہے۔"

ٹیلی فون سیٹ کا اسپیکر آن تھا۔ سب ہی یہ باتیں سن رہے تھے۔ سلمٰی نے خوش ہو کر کہا "میرے بیٹے نے اتنا بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔"

رحمت شاہ سلطانی نے اپنے سینے پر ہاتھ مار کر کہا "آخر میرا بیٹا ہے۔ روبی اس کی امانت ہے۔ اس نے اپنی امانت کی حفاظت کی ہے۔"

روبی کی ماں ریحانہ اپنے صوفے سے اٹھ کر سلمٰی کے پاس آئی پھر اس سے لپٹ کر مارے خوشی کے رونے لگی۔ جمشید نے کہا۔ "میں حیران ہوں۔ میں تو اسے مسخرا اور مکھی مار کر سمجھتا تھا، اس نے تو گاڈ فادر جیسا شیر مارا ہے۔"

برکت شاہ سلطانی نے کہا "اب باتیں ختم کرو۔ دن نکل رہا ہے۔ ہمیں تھوڑی دیر سونا چاہیے۔"

ریحانہ نے کہا "آپ سو جائیں، پتا نہیں کب ہماری بیٹی کا فون آجائے۔"

"بھئی ٹیلی فون سرہانے رکھ کر سو جاؤ۔ بیٹی تمہارے کان میں گھنٹی بجائے گی مگر سونا ضروری ہے۔"

رحمت شاہ سلطانی نے کہا "بھائی جان! ہم بھی تو اپنی بیٹی اور بیٹے کی باتیں سننا چاہتے ہیں۔ بھابی جان فون اپنے بیڈ روم میں لے جائیں گی۔"

"نہیں لے جاؤں گی۔ آج ہم سب یہیں ڈرائنگ روم میں قالین پر سوئیں گے اور ٹیلی فون ہمارے درمیان رہے گا۔"

انہوں نے یہی کیا۔ جس طرح شادی کے گھر میں تمام باراتی ایک ہی بڑے کمرے میں آڑے ترچھے سو جاتے ہیں اسی طرح وہ بھی لیٹ گئے۔

اس رات حالات نے انہیں بڑی ٹھوکریں ماری تھیں۔ وہ تھک کر نڈھال ہوگئے تھے۔ لیٹتے ہی سو گئے۔ کوئی گھوڑے بیچ کر سوتا ہے، وہ تلخ تجربات حاصل کرنے کے بعد جیسے بہت کچھ حاصل کرکے سو گئے۔

کوئی کوٹھی کے اندر انہیں جھانک کر دیکھتا تو سب کے سب مُردہ نظر آتے۔ یوں بھی گہری نیند سونے والے نیم مُردہ ہی ہوتے ہیں۔ انہیں اپنی خبر نہیں ہوتی کہ وہ کہاں

ہیں؟ ان کا کوئی وجود بھی ہے یا نہیں؟ ان کے لیے وقت ٹھہر جاتا ہے مگر جاگنے والوں کے لیے نہیں ٹھہرتا۔ سہ پہر تین بجے گھنٹی سنائی دی۔

لاشعور میں گھنٹی سمائی ہوئی تھی۔ ریحانہ چونک کر اٹھی۔ اِدھر سے اس نے اُدھر سے سلمیٰ نے ریسیور اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ سلمیٰ کے ہاتھ میں ریسیور آیا۔ اس نے کان سے لگا کر کہا۔ "ہیلو' ہیلو۔ بیٹی روبی' ہیلو سنی.........."

ریحانہ نے اس سے ریسیور چھین کر کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ "ہیلو کون ہے؟"

پھر گھنٹی کی آواز سنائی دی۔ برکت شاہ نے کہا "وہاٹ نان سینس۔ ارے بھئی فون کی گھنٹی نہیں' دروازے کی کال بیل ہے۔ دیکھو جمشید کون ہے۔"

جمشید اٹھ کر گیا۔ ریحانہ نے ریسیور کو کریڈل پر پٹخ دیا۔ جمشید نے دروازہ کھولتے ہی خوشی سے "یاہو" کہا۔ سب اس کی بڑھک سن کر قالین سے اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ اسی وقت نگاہوں کے سامنے روبی اور سنی دکھائی دیے۔ سب ہی کے حلق سے خوشی کی چیخیں نکل گئیں۔ تمام بزرگ ان دونوں سے لپٹ کر پیار کرنے لگے اور پوچھنے لگے "یہ تم دونوں اچانک کیسے چلے آئے؟"

سنی نے کہا "اور کیسے آتے؟ ہوائی جہاز سے ڈیڑھ گھنٹے میں لاہور سے کراچی۔"

روبی نے کہا "ممی! میں فون کرنا چاہتی تھی مگر سنی نے کہا۔ نہیں' ہم سرپرائز دیں گے۔"

ریحانہ نے کہا "لڑکے! تیری شرارتیں کرنے کی عادت نہیں جائے گی۔ ہم ٹیلی فون سرہانے رکھ کر سو رہے تھے۔"

سنی نے ریحانہ کے سامنے جھک کر ایک فائل پیش کرتے ہوئے کہا "یہ ہے دوسرا سرپرائز۔ حمزہ بیگ نے فراڈ سے جو فیکٹری ہتھیالی تھی اسے ہم نے پھر آپ کے نام کرا دیا ہے۔"

وہ تمام بزرگ حیرانی سے فائل کے اوراق الٹ پلٹ کر دیکھ رہے تھے۔ وہاں فیکٹری کی پرانی اور نئی ملکیت کے کاغذات بیگم ریحانہ برکت کے نام تھے۔

ریحانہ نے فائل ایک طرف پھینک کر سنی کے گلے میں بانہیں ڈال کر اپنی طرف



جھکایا پھر اسے چومتے ہوئے بولی "تم سونا اگلنے والی فیکٹری کے ساتھ میری بیٹی کو عزت و آبرو سے لائے ہو۔ میں اپنے ہونے والے داماد پر جتنا بھی فخر کروں کم ہے۔"

روبی نے جمشید سے پوچھا "بھائی جان! آپ بتائیں کہ ہم ائرپورٹ سے یہاں تک کیسے آئے ہیں؟"

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ تم دونوں ٹیکسی میں آئے ہو۔"

وہ ایک کی چین کو چٹکی میں دبا کر ہلاتے ہوئے بولی "ہم آپ کی ایکارڈ لے کر آئے ہیں۔"

جمشید نے چابی کو جھپٹ کر لیتے ہوئے پوچھا "یہ کیا سرپرائز ہے۔ اس کمبخت گاڈفادر سے میری گاڑی کیسے لائی ہو؟"

برکت شاہ نے کہا "ہاں سنی! وہ گاڈفادر بھی تمہارے دادا جان کی طرح فولاد ہے۔ تم دونوں نے یہ سب کچھ کیسے حاصل کرلیا؟"

روبی بولی "میں نے نہیں' صرف سنی نے۔ یہ بڑا چالباز ہے۔ اس نے حمزہ بیگ کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ ہمارے دادا جان کے کارندوں کے ذریعے گاڈفادر کی بیٹی کو اغوا کرکے یرغمال بنایا اور شرائط پیش کردیں کہ ہماری تمام چھینی ہوئی چیزیں واپس کرو اور بیٹی لے جاؤ۔ آپ دیکھ لیں کہ ہم شرائط جیت کر آئے ہیں۔"

برکت شاہ نے اس کے سامنے آکر حیرت اور مسرت سے پوچھا "تم ایک شریر اور بے پروا سے نوجوان تھے۔ اتنا بڑا کام کیسے کر گئے؟"

"انکل! بچوں کی کامیابیوں کے پیچھے بزرگوں کے تجربات ہوتے ہیں۔ ان کے تعاون سے بچے آگے بڑھتے ہیں۔ ہم نے بھی یہ کامیابی اپنے دادا جان کے چند جاں نثاروں کے ذریعے حاصل کی ہے۔"

برکت شاہ نے اپنی بیگم ریحانہ کو دیکھا۔ دونوں میاں بیوی کی آنکھوں سے ندامت ظاہر تھی۔ رحمت شاہ نے سر جھکا کر سنی سے کہا "بیٹے! کل رات ہی ہمیں اپنی غلطیوں کا احساس ہوگیا تھا۔ ہم روبی کو دشمن کے فریب سے بچانے کے لیے ابا حضور کے دروازے پر جانا چاہتے تھے مگر وہاں کے گارڈز نے ہمیں احاطے میں بھی قدم رکھنے نہیں دیا۔"

ریحانہ نے کہا "دروازے پر آنے والے بھکاریوں کو بھی کوئی اس طرح نہیں لوٹاتا۔ ہمیں تو جیسے دھتکار دیا گیا مگر ہم اپنے بزرگوں کی سنگ دلی اور سخت رویے کو سمجھ نہیں پاتے۔ انہوں نے ایک اسکول ماسٹر کی طرح جمشید کو ایک ٹانگ پر کھڑا رہنے کی سزا دی۔ ہم نے انہیں دشمن سمجھ لیا۔ اسی دشمن بزرگ نے اپنے پوتے کے ذریعے اپنی پوتی کو حمزہ بیگ کے شیطانی پنجے سے بچایا۔ ہمارے ہاتھوں سے نکلی ہوئی منافع بخش فیکٹری اور لاکھوں روپے کی ہنڈا ایکارڈ ہم خطاواروں تک پہنچادی۔"

برکت شاہ نے کہا "دراصل جب ہمارے بزرگ ہمیں ڈانٹتے ہیں اور کسی غلطی کی سزا دیتے ہیں تو ہمیں بہت برے لگتے ہیں۔ اتنی سی بات سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ ہمیں برائیوں سے باز رکھنا چاہتے ہیں۔"

جمشید نے مسکراتے ہوئے کہا "دادا جان خود برائیوں کی دلدل کے جاگیردار ہیں۔ جسے چاہتے ہیں، اس دلدل میں پھینک دیتے ہیں۔ انہوں نے اپنے بیٹوں اور پوتوں کو کون سے اچھے راستے پر چلایا ہے۔ ہمیں ہمیشہ دو نمبر کے دھندوں میں لگایا ہے۔"

ریحانہ نے بیٹے سے کہا "فضول باتیں نہ کرو۔ انہوں نے تم سب کو لاکھوں روپے کمانے کے راستے دکھائے ہیں۔ ہماری اونچی سوسائٹی میں غربت اور محتاجی کے راستے کو حماقت کا راستہ کہا جاتا ہے۔ دولت کہیں سے بھی ہاتھ لگے کسی بھی دلدل سے آئے ہمیں اونچا اسٹیٹس اور دوسروں پر برتری دیتی ہے اس لیے تمہارے دادا جان کے بتائے ہوئے راستے عزت اور شہرت حاصل کرنے کے راستے ہیں۔"

سنی نے کہا "اچھا آئیڈیا ہے۔ ہم سب جلوس کی شکل میں جائیں گے اور کچھ ایسا سیاسی انداز اختیار کریں گے کہ وہ ہم سے ملنے پر مجبور ہو جائیں گے۔"

سب نے سنی کی تائید کی۔ یہ طے پایا کہ شام پانچ بجے تک سب نہادھو کر کچھ کھاپی کر اپنے بزرگ پیر عظمت اللہ شاہ سلطانی کی کوٹھی کے سامنے جلوس کی صورت میں جائیں گے۔

وہ سب وہاں سے مختلف کمروں میں چلے گئے۔ روبی اور سنی کو کسی تیاری کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ فریش ہوکر لاہور سے چلے تھے۔ وہیں ڈرائنگ روم کے ایک



صوفے پر بیٹھ گئے۔ سنی نے کہا۔ "تم نے اپنی ممی کی باتیں سنیں، وہ کہہ رہی تھیں کہ ہمارے دادا جان کے بتائے ہوئے راستے عزت، شہرت اور دولت حاصل کرنے کے راستے ہیں۔"

"ہاں کل تک میں بھی یہی سمجھتی تھی۔ افسوس یہ ہمارے خاندان کی روایت بن چکی ہے۔ دولت کسی بھی دلدل سے آئے، وہ یہاں کے ہر فرد کو اعلیٰ مرتبے پر فائز رکھتی ہے اس لیے جمشید بھائی جان اور ہمارے والدین اس خاندانی روایت کو نہیں بدلیں گے۔"

"لیکن ہم نے عزم کیا ہے کہ تبدیلی لائیں گے اور اس سے پہلے انکل صداقت سے ملیں گے۔ تم یہاں ٹھہرو، میں باہر جاکر ان سے فون پر باتیں کروں گا اور ملاقات کا وقت مقرر کرنے کے بعد ہم دونوں ان سے ملنے جائیں گے۔"

سنی نے کہا "آج ہم اعلیٰ خاندان کے چشم وچراغ کہلاتے ہیں تو صرف دادا جان کی مہربانیوں سے۔ بڑے لوگ اس وقت بدمعاش اور ملک دشمن کہلائیں گے جب قانون کی گرفت میں آئیں گے۔ پچھلی رات انکل تھوڑی دیر کے لیے حوالات میں گئے تھے۔ اگر دادا جان فوری رہائی نہ دلاتے تو یہ بہت بڑے مجرم کہلاتے مگر اب مجرم نہیں ہیں۔ شریف خاندان کے فرد ہیں۔"

روبی نے جمشید سے کہا "بھائی جان! ہم دادا جان کے بغیر اونچے مقام پر نہیں رہ سکتے۔ کیا آپ یہ چار ہزار گز کی کوٹھی چھوڑ کر کسی چھوٹے سے کچے مکان میں رہ سکتے ہیں؟"

جمشید نے کان پکڑ کر کہا "غریبی کی زندگی بھی کوئی زندگی ہے؟ نہیں ہرگز نہیں۔ دادا جان زندہ باد۔"

بیگم سلمیٰ رحمت نے کہا "ہمیں ابا حضور سے معافی مانگنی چاہیے۔"

رحمت شاہ نے کہا "کیسے مانگیں؟ ہمیں تو احاطے کے باہر سے ہی بھگا دیا جائے گا۔"

روبی نے کہا "دادا جان ہمیں احاطے کے اندر نہیں آنے دیں گے لیکن ہم باہر

سے انہیں آواز دے سکتے ہیں۔"

"اتنی جلدی کیا ہے؟ ابھی تو ہم آئے ہیں' آج رات کو کسی وقت ان سے رابطہ کریں گے۔"

"ہم ان سے ملنے لاہور سے یہاں آئے ہیں۔ اگر وہ اسلام آباد چلے جائیں گے تو ہمیں یہاں سے اسلام آباد تک دوڑ لگانی ہو گی۔"

"ہوں۔ ٹھیک کہتے ہو۔ وہ کراچی کبھی کبھی ایک یا دو دن کے لیے آتے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ واپس چلے جائیں لیکن بڑی احتیاط سے ایسی جگہ چھپ کر فون کرو کہ ہمارے بزرگ نہ دیکھ سکیں ورنہ طرح طرح کے سوالات کیے جائیں گے۔"

وہ روبی کے پاس سے اٹھ گیا۔ ڈرائنگ روم سے نکل کر کوٹھی سے باہر آیا۔ احاطے کا باغیچہ اجڑا ہوا تھا۔ کوئی بڑا درخت یا ایسی جھاڑیاں نہیں تھیں جن کے پیچھے بیٹھ کر وہ فون کرتا۔ سامنے ایک پارک تھا۔ سہ پہر کی دھوپ کے باعث وہاں ویرانی تھی۔ وہ پارک میں ایک گھنے درخت کے سائے تلے آکر بیٹھ گیا۔ موبائل فون کے ذریعے رابطہ کرنے لگا۔ دوبارہ دوسری طرف فون انگیج تھا۔ تیسری بار صداقت کی آواز سنائی دی۔ وہ بولا "انکل! میں سنی بول رہا ہوں۔ آپ سے بہت ضروری کام ہے اس لیے کراچی واپس آگیا ہوں۔"

صداقت نے کہا "بات مختصر ہو تو فون پر بتا دو۔"

"مختصر طور پر یہی کہہ سکتا ہوں کہ دادا جان سے الگ ہونے کے بعد میرے اور روبی کے والدین نے گاڈ فادر حمزہ بیگ سے بہت دھوکا کھایا ہے۔"

"حمزہ بیگ نے دھوکا دیا ہے' کیسے؟"

"جیسا کہ مجھے معلوم ہوا ہے۔ اس نے پولیس کو انکل برکت کی فیکٹری پر چھاپا مارنے کو کہا۔ وہاں سے دو نمبر دواؤں اور نشیلی دواؤں کا ذخیرہ برآمد ہوا۔ انکل کو حوالات پہنچایا گیا۔ اس کے بعد حمزہ بیگ نے آنٹی سے کہا کہ فیکٹری اگر دوسرے کے نام ہو تو وہ دوسرا مجرم کہلائے گا اور انکل برکت کو رہائی مل جائے گی۔ آنٹی نے انکل کی رہائی کے لیے اور بدنامی سے بچنے کے لیے چھ ماہ پہلے کی تاریخ پر وہ فیکٹری کسی احمد علی کے نام لکھ



دی۔ اس طرح حمزہ بیگ نے فراڈ کر کے آنٹی اور انکل برکت کو ایک منافع بخش فیکٹری سے محروم کر دیا پھر دوسرے فراڈ کے ذریعے جمشید سے لاکھوں روپے کی ہنڈا ایکارڈ ہتھیالی۔ اس کے بعد ہمارے خاندان کو بدنام کرنے کے لیے روبی کو ٹریپ کر کے لاہور پہنچا دیا۔ اگر میں وہاں عین وقت پر پہنچ کر اسے بدمعاشوں کے شرمناک ارادوں سے نہ بچاتا تو ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتے۔"

"کیا تم ان معاملات کے باعث یہاں واپس آئے ہو؟"

"نہیں۔ روبی ایک ٹھوکر کھا کر سنبھل گئی ہے۔ ہم دونوں آپ کے نقش قدم پر چلنا چاہتے ہیں۔ ہم دادا جان اور اپنے والدین کو قانونی گرفت میں لانا نہیں چاہتے لیکن آپ کی طرح ان کے راستوں کا پتھر بننا چاہتے ہیں۔ ان کے کسی بھی ایسے عمل کو ناکام بنانا چاہتے ہیں جو قانون کے خلاف ہو۔"

"مجھے یہ سن کر خوشی ہو رہی ہے کہ بت کدے میں دو مسلمان پیدا ہو گئے ہیں۔ اگر ہو سکے تو رات نو بجے سی بیچ میں آجاؤ۔ رات کا کھانا وہیں کھائیں گے۔"

"تھینک یو انکل' میں روبی کے ساتھ آؤں گا۔"

"میں انتظار کروں گا لیکن تمہاری یہ باتیں سمجھ میں نہیں آئیں کہ گاڈ فادر حمزہ بیگ نے ایک ہی رات میں تمہارے بزرگوں سے بہت کچھ چھین لیا اور اسی ایک رات میں تم نے دادا جان کے کارندوں کی مدد سے حمزہ بیگ کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا اور واپس کراچی پہنچتے ہی اپنی چھینی ہوئی فیکٹری اور ہنڈا ایکارڈ اس سے لے آئے۔ کیا خود حمزہ بیگ نے فیکٹری کے کاغذات وغیرہ تمہارے حوالے کیے تھے؟"

"جی نہیں' اس کے ایک خاص ماتحت نے یہاں کے ائرپورٹ پر فیکٹری کی فائل اور گاڑی کی چابی مجھے دی تھی۔"

"کیا تمہارے والدین یا آنٹی اور انکل نے کبھی گاڈ فادر حمزہ بیگ سے ملاقات کی ہے؟"

"روبی کو اس کی ممی نے بتایا ہے کہ وہ کبھی کسی کے روبرو نہیں آتا۔ ایک بڑے شیشے کی دیوار کے پیچھے سے اس کا خاکہ جھلکتا ہے۔"

"یعنی وہ کسی جاسوسی کہانی یا فلم کا پُراسرار باس ہے؟"

"میں نے تو دیکھا نہیں ہے مگر وہ کچھ ایسا ہی ہے۔"

"ایسا ہوتا تو ہماری ریکارڈ فائل میں اس کی تصویریں نہ ہوتیں۔ وہ ہم جیسے قانون کے محافظوں سے پردہ نہیں کرتا ہے پھر تمہاری آنٹی' انکل اور تمہارے والدین سے اپنا چہرہ کیوں چھپاتا ہے؟"

"آپ کی یہ بات غور طلب ہے۔"

"ایک اور بات بھی دعوت فکر دیتی ہے۔ چند بڑے اور اہم مجرموں کی مکمل رپورٹ میرے پاس رہتی ہے۔ وہ دن رات کہاں رہتے ہیں اور کیا کرتے ہیں' میں حتی الامکان ان کی مصروفیات پر نظر رکھتا ہوں۔ اب دعوت فکر دینے والی بات یہ ہے کہ گاڈفادر حمزہ بیگ پچھلے پانچ دنوں سے فرینکفرٹ میں ہے۔ جب وہ پاکستان آئے گا تو مجھے اطلاع مل جائے گی۔"

سنی نے حیرانی سے کہا "او نو.......... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں انکل؟ گاڈفادر حمزہ بیگ فرینکفرٹ میں ہے تو پھر یہاں وہ حمزہ بیگ کون ہے جس نے کل رات سے ہمیں اور ہمارے والدین اور آنٹی انکل وغیرہ کو پریشان کیا ہوا ہے؟"

"بیٹے! یہ سمجھنا ہوگا اور حمزہ بیگ کی غیر موجودگی میں حمزہ بیگ بننے والا فریبی کون ہے' یہ معلوم کرنا ہوگا۔"

سنی کو اچانک نازو کا خیال آیا۔ اس نے کہا "انکل! وہ فرینکفرٹ سے بہت پہلے آچکا ہے۔ آپ کے مخبروں سے غلطی ہوئی ہے۔ ثبوت کے طور پر حمزہ بیگ کی بیٹی نازو ہے۔ وہ لاہور میں ہے۔"

"بس بیٹے! آگے نہ بولو۔ تم لوگوں کے ساتھ لمبا فراڈ چل رہا ہے۔ تم لوگوں کو گاڈفادر حمزہ بیگ کی ہسٹری معلوم ہی نہیں ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اس کی کوئی بیٹی یا بیٹا نہیں ہے۔ اس نے جوانی میں شادی ضرور کی تھی مگر کوئی اولاد نہ ہو سکی۔ بیوی کے مرنے کے بعد حمزہ بیگ نے دوسری شادی نہیں کی۔ اس کے جوان سالے ہیں' جنہیں وہ بیٹوں کی طرح عزیز رکھتا ہے۔"



"انکل! آپ کہہ رہے ہیں تو یقین کرنا ہی ہوگا مگر یہ نازو کون ہو سکتی ہے؟"

"ویسی ہی فراڈ ہوگی' جیسا وہ تم لوگوں سے لاکھوں روپے کی فیکٹری اور گاڑی چھیننے اور پھر وہ تمام چیزیں واپس کر دینے والا نقلی حمزہ بیگ ہے۔ یہ تو مضحکہ خیز بات ہے کہ ایک ہی رات میں اتنا لمبا ڈراما ہوگیا۔ روبی کو بھی ٹریپ کرکے لاہور پہنچایا گیا۔ وہ بھی عزت و آبرو سے ایک ہی رات میں واپس بھی مل گئی۔ یہ بڑا ہی بھونڈا سا ڈراما ہے میں اس کی کمزوریوں کو ٹٹولنا چاہتا ہوں اس لیے خدا حافظ کہہ رہا ہوں۔ رات کو سی بیچ میں ملاقات ہوگی۔"

رابطہ ختم ہوگیا۔ سنی موبائل فون آف کرکے سوچ میں پڑگیا' یہ اتنی جلدی سمجھ میں آنے والی بات نہیں تھی۔ یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ کسی گاڈفادر کے ذرائع دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہوں۔ حمزہ بیگ نے فرینکفرٹ میں رہ کر پاکستان میں اپنے نائب کے ذریعے یہ کھیل کھیلا ہو۔

یہ ممکن تھا۔ وہ ایسا کر سکتا تھا اور شاید اس نے ہزاروں میل دور بیٹھ کر ہی کیا تھا لیکن پھر ذہن میں نازو کھٹکنے لگی۔ صداقت علی کی معلومات غلط نہیں ہو سکتی تھیں۔ اس نے کہا کہ حمزہ بیگ کی کوئی اولاد نہیں ہے۔ اس کی مرحوم بیوی کے دو بھائی اب جوان ہو چکے تھے۔ حمزہ بیگ اپنے دونوں سالوں کی بیٹوں کی طرح عزیز رکھتا تھا۔

یوں ظاہر ہو رہا تھا کہ کسی فراڈ حمزہ بیگ سے مل کر نازو بھی فراڈ کر رہی تھی۔ ایک اور سوال پیدا ہوا کہ وہ کمال احمد عرف چٹکی بادشاہ خود کو اس کے دادا جان کا خاص ماتحت کہہ رہا تھا لیکن دو چار گھنٹوں کے اندر وہ اور نازو ایک دوسرے سے عشق کرنے لگے۔

کیا کمال عرف چٹکی بادشاہ بھی نازو اور فراڈ حمزہ بیگ کی سازشوں میں شریک ہے؟

سنی نے پھر صداقت سے رابطہ کیا اور کہا "انکل! آپ کو بار بار ڈسٹرب کر رہا ہوں' ایک اور بات کھٹک رہی ہے۔ لاہور میں ہمارے دادا جان کا ایک خاص ماتحت ہے۔ اس کا اصل نام کمال احمد ہے لیکن چٹکی بادشاہ کے نام سے مشہور ہے۔ مجھے تو بہت اچھا' سچا اور کھرا لگ رہا تھا۔ وہ بھی ہماری طرح آپ کے نقش قدم پر چلنے کا عزم کر چکا ہے۔ آپ اس کے متعلق کچھ جانتے ہیں۔"

"جانتا تو نہیں ہوں مگر ایک آدھ گھنٹے میں لاہور انٹیلی جنس والوں کے ذریعے اس کی پوری ہسٹری معلوم کرلوں گا اور آج رات ڈنر پر تمہیں بتادوں گا۔"

"تھینک یو انکل! ہم نوجوان ایک خفیہ ٹیم بنا کر آپ کی طرح مجرموں کے راستوں کا پتھر بننا چاہتے ہیں۔ آپ کسی گاڈفادر کو سزا نہیں دلا سکتے لیکن آپ نے ان کی نیندیں اڑا رکھی ہیں۔"

"میری حکمت عملی اختیار کرنے کی بنیادی شرط یہ ہے کہ کسی پر بھروسا نہ کرو۔ اپنے اندر کی بات اس سے بھی نہ کہو جس پر اندھا اعتماد کرتے ہو۔ تم جس ڈگر پر چلنا چاہتے ہو وہاں اندھا اعتماد تمہیں خاک میں ملادے گا۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ میں کوئی اہم راز روبی کو بھی نہ بتاؤں۔"

"ہرگز نہیں۔ تمہاری ہاجرہ آنٹی میری شریک حیات ہیں۔ ہماری شادی کی سلور جوبلی کو ایک سال گزر چکا ہے۔ میں اسے دل وجان سے چاہتا ہوں۔ اس کی ہر خوشی پوری کرتا ہوں لیکن اسے کبھی اپنا راز دار نہیں بناتا۔ یہ تمہارے سامنے کی بات ہے کہ تمہاری ہاجرہ آنٹی کو اغوا کیا گیا تھا۔"

"انکل تھا کا مطلب کیا ہوا؟ کیا آنٹی کا سراغ مل گیا ہے؟"

"ہاں۔ وہ تمہارے دادا جان کے پاس پہنچ گئی ہیں۔ میں ابھی جاکر ملوں گا اور معلوم کروں گا کہ اسے کس نے اغوا کیا تھا؟"

صداقت علی سنی کو سچا اور قابل اعتماد سمجھتا تھا۔ اس کے باوجود اس نے یہ ظاہر نہیں کیا کہ اس کے دادا جان نے داماد کو دباؤ میں رکھنے کے لیے کیسی مکارانہ چال چلی تھی۔

اس نے سنی سے کہا "ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ تمہاری ہاجرہ آنٹی کو اغوا کیا گیا تھا۔ اگر میں ہاجرہ کو اپنے شعبے کے اہم راز بتاتا رہتا تو اسے اغوا کرنے والا دشمن اس سے بہت سے راز اگلوالیتا۔ میں نے اسے بتایا ہی نہیں تھا اس لیے دشمن نے اس سے خاک معلوم کیا ہوگا۔"

"آپ درست کہتے ہیں' جو باتیں روبی سے چھپانے کی ہوں گی' انہیں کبھی اس



کے سامنے زبان پر نہیں لاؤں گا۔"

"اس اصول پر ابھی سے عمل کرو۔ روبی اور کسی کو بھی یہ نہ بتاؤ کہ کوئی نقلی حمزہ بیگ تم سب سے فراڈ کررہا ہے۔ ہم پہلے اس فریبی تک پہنچیں گے پھر حقیقت خودبخود کھل کر سب کے سامنے آجائے گی۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں۔ میں آپ کی طرح خود کو پتھر بنالوں گا۔ پتھر کو توڑو تو اس کے اندر سے پتھر ہی نکلتا ہے۔ کوئی مجھ سے راز اگلوانے میں ناکام ہوکر مجھے توڑ ڈالے گا تو میرے مُردہ وجود سے خاموشی ہی نکلے گی۔"

"شاباش! مجھے یقین ہے کہ تم میرے نقش قدم پر چل سکو گے۔ اچھا خدا حافظ۔"

پھر رابطہ ختم ہوگیا۔ سنی نے موبائل فون کو آف کرکے دیکھا۔ اس کے تصور میں روبی مسکرانے لگی۔ وہ تو بچپن سے اس کا تمنائی تھا۔ یہ درست ہے کہ محبت اندھی ہوتی ہے اور یہ دانش مندی ہے کہ محبت لاکھ اندھی ہو مگر اندھا اعتماد نہ ہو۔ باقی محبت کرنے والی کے تمام حقوق ادا ہوتے رہیں۔

محبت اور فرائض کی ادائیگی کا تقاضا ہو تو دونوں معاملات میں توازن رکھنا چاہیے۔"

★-----------★-----------★